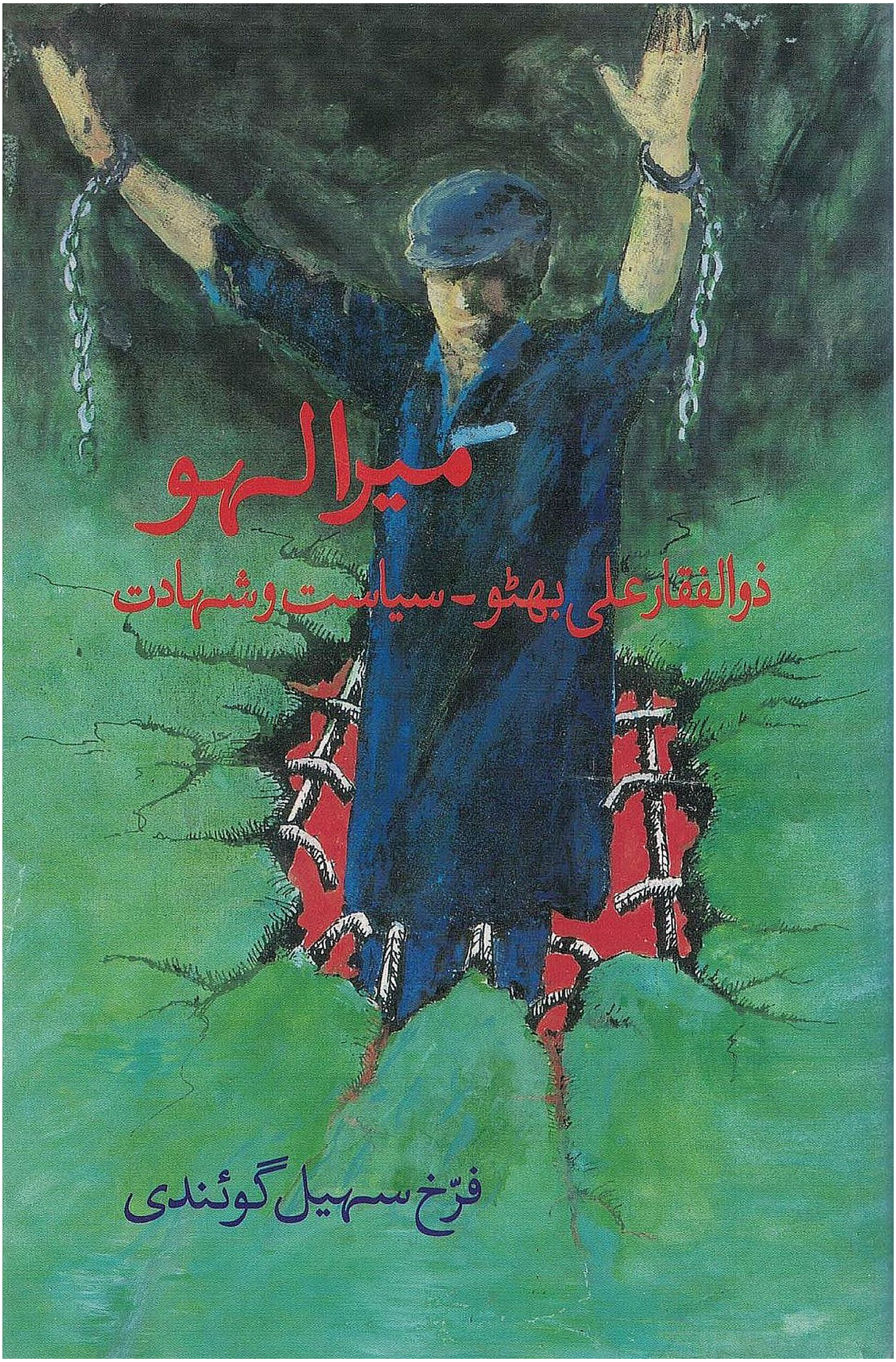

میرا لہو

ذوالفقار علی بھٹو - سیاست و شہادت

فرّخ سہیل گوئندی

میرا لہو
ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاست و شہادت

فرخ سہیل گوئندی

A Political Biography of Zulfikar Ali Bhutto
1928-1979
Struggle & Assassination

By: Farrukh Sohail Goindi

جمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

• نام کتاب: میرا لہو۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاست و شہادت	• مصنف: فرخ سہیل گوئندی
• 22 واں ایڈیشن: 2011ء	۔ • ٹائٹل: پروفیسر مرتضیٰ جعفری
• ناشر: جمہوری پبلیکیشنز لاہور	• جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-8455-68-2

قیمت -/500 روپے

اہتمام:
ریما عبداللہ گوئندی

اس کتاب پر تبصرے کے لیے ناشر یا مصنف سے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ کتاب کے کسی بھی حصے کو ریسورس یا تبصرے کے طور پر استعمال کیا جائے تو کتاب، مصنف اور ناشر کا حوالہ دینا لازم ہے۔

www.jumhoori.webs.com

Jumhoori Publications facebook Fan Page

JUMHOORI PUBLICATIONS

2-Aiwan-e-Tijarat Road Lahore, Pakistan
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail:jumhoori@yahoo.com

والدہ محترمہ کلثوم گوندی

اور

والد محترم محمد یعقوب گوندی

کے نام

جو میری جدوجہد کا سبب ہیں

www.bhutto.org

میرا لہو نوجوان نسل کے چہروں پر سُرخی
بن کر اُبھرے گا۔
میں نے آج تک سوائے اپنے عوام کے کسی سے
محبّت نہیں کی۔
میری قبر سے فتح و نصرت کے پھول اُگیں گے۔
(شہیدِ انقلاب ذوالفقار علی بھٹوؒ)

www.bhutto.org

www.bhutto.org

فہرست

دیباچہ۔ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید	09
کاروانِ جدوجہد۔ تبدیلی کیسے ممکن ہے؟	11
زندہ بھٹو	15
پہلا حصہ	
امریکی سرپرستی کا آغاز	23
طاقت کے ایوانوں میں	27
غریب ماں کا بیٹا	33
نئی خارجہ پالیسی کا معمار	37
جنگ 1965ء اور ذوالفقار علی بھٹو	43
اقتدار سے علیحدگی	61
پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام	71
ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد	83
دوسرا مارشل لاء اور انتخابات	93
سقوطِ ڈھاکہ	119
دوسرا حصہ	
عوامی راج	135
ذوالفقار علی بھٹو کی ڈپلومیسی	157

www.bhutto.org

163

عوامی حکومت اور فوج

منزلیں اور مرحلے — 173

ذوالفقار علی بھٹو کا لاہور میں ہنری کسنجر کی آمد پر استقبالیے سے خطاب — 201

پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب — 207

راجہ بازار راولپنڈی میں خطاب — 233

"آپریشن فیئر پلے" حقائق کی روشنی میں — 237

سفید ہاتھی اور اس کے ساتھی — 247

تیسرا حصہ

سزائے موت — 265

ذوالفقار علی بھٹو کا عدالتی قتل — 283

پروانے جو جل اٹھے — 289

بھٹو سے بھٹو تک — 301

مائی فرینڈ پیلو مودی — 359

ذوالفقار علی بھٹو کا تاریخی حق — 373

بھٹو پر فلم کی کہانی — 379

بیگم نصرت بھٹو اور آنسہ بے نظیر بھٹو — 383

ترکی، بھٹو اور بلند ایجوت — 389

بے نظیر بھٹو بھی شہید ہو گئیں — 395

www.bhutto.org

70-CLIFTON
KARACHI
11 December 1987

It gives me great pleasure to note that a young committed worker of the Pakistan Peoples Party, Mr. Farrukh Sohail Goindi has made an important contribution in the form of a book which focuses on our Chairman Zulfiqar Ali Bhutto Shaheed and surveys the Peoples Government in Pakistan.

This enterprise aptly discribed as "MERA LAHOO" attempts a comprehensive discussion on the various facets of the Peoples Party rule. The author has made use of some important documents which enhances the quality of this work. In his search for information, Mr. Farrukh Sohail Goindi interviewed an old friend of Shaheed Chairman Mr. Pilo Modi an outstanding politician and gleaned some new facts about Chairman Shaheed.

There are not very many books written by insiders (Party Workers) which infact is absolutely necessary to understand the inner dynamics of the party and critique of the Peoples Party rule can help us reformulate our policies and programme. This work should inspire and stimulate other workers in the Party to write on the socio-economic, political and cultural aspects of the Pakistani Society which may reflect the thinking and philosophical contours of our Shaheed Chairman Zulfiqar Ali Bhutto. There is a crying need for such work as we are fighting against the forces of bigotory orthodoxy and hypocrisy, who are trying to distort facts and realities of our time.

Let others take a que from Farrukh Sohail Goindi and attempt similar research oriented undertakings.

Benazir Bhutto

(MISS BENAZIR BHUTTO)

www.bhutto.org

www.bhutto.org

کاروانِ جدوجہد
تبدیلی کیسے ممکن ہے؟

ذوالفقار علی بھٹو شہید پر اندرون اور بیرون ملک لاتعداد کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جب تلک ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف رجعت پسند دانشوروں اور حکمران طبقے کے لوگوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ذوالفقار علی بھٹو شہید کی سیاسی کردار کشی کی مہم جاری رکھی تو زیادہ تر تحریروں کا تعلق ذوالفقار علی بھٹو کو تاریخ کے اوراق سے مٹانا یا پھر اُن کی شخصیت کو مسخ کرنے تک محدود تھا لیکن جب وقت کے دھارے نے حقائق کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا تو ذوالفقار علی بھٹو ملک کے ایک غیر متنازعہ لیڈر کا روپ دھارنے لگے ہیں۔ وہ مُشتعل رجعت پسند، جو شہروں کی شاہراہوں پر ذوالفقار علی بھٹو کو قاتل اور کافر کہتے تھے آج اپنے ماضی کے افسوس کے ساتھ Confession کر رہے ہیں کہ "بھٹو ٹھیک تھا اور ہم غلط۔"

تاریخ اپنے ہیروز اور ولنز خود طے کرتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کے حوالے سے تاریخ ہر روز اپنا فیصلہ دے رہی ہے۔ اس حوالے سے یہ اتنی اہم بات نہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کا نام لینے والی پارٹی بار بار انتخابات جیتتی ہے، اہم یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے چار دہائیوں پہلے جس سیاست، نظریات اور آدرش کا پرچم بلند کیا، آج وہ ہی وقت کی ضرورت ہے۔ جہاں تک بات ہے بھٹو شہید کا نام لینے والی پارٹی کا انتخابات میں متعدد بار جیتنا تو اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے جس عوامی سیاست کی بنیاد رکھی اور پھر اپنی تقریباً پانچ سالہ حکومت میں زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں جو اصلاحات کیں پاکستان کے عوام اس کو کبھی نہیں بھلا سکتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1977ء کے انتخابات میں جس غیر ملکی سازش کے بارے میں بار بار پاکستان کے عوام کو مطلع کیا کہ اُس کے تحت پاکستان کے مفادات کو ٹھیس پہنچائی جائے گی اور اُس کے نتیجے میں وہ اپنی حکومت اور پھر جان بھی کھو سکتے

www.bhutto.org

ہیں اور پھر اس سازش کا 1977ء کے انتخابات میں عملی مظاہرہ دیکھنے میں آیا اور بعد ازاں انتخابات میں بھٹو مخالف جماعتوں کے اتحاد کی طرف سے تحریک اور اس تحریک کے بعد 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء اور اس کے بعد 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کا سولی پے جھول جانا یہ سارا عمل ذوالفقار علی بھٹو کی سچائی (Truth) کا تاریخی ثبوت دے گیا لہٰذا عوام کیسے بھول سکتے ہیں ایک شخص جو اُن کا پرچم بلند کرتے ہوئے اُن کے حقوق کے لیے لڑتے ہوئے شعوری طور پر اپنی جان قربان کر گیا اسی لیے وہ وقت کے دھارے کے ساتھ پاکستان کی سیاست، ثقافت اور لوک کہانی کا انمٹ کردار بن گیا۔

شہادت کے اس سفر میں اُن کے جواں سال بیٹے شاہنواز بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو اور جرأتوں والی بیٹی بے نظیر بھٹو بھی شامل ہو گئیں۔ یہ کتاب شہادت کے س سفر کی ایک مختصر سی داستان ہے اور شہادت کے اس کارواں میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں جیالے ہیں کہ اگر اُن کی داستانوں کو رقم کر دیا جائے تو یہ سیاسی ادب کی بہترین تحریریں ٹھہرائی جائیں۔

ذوالفقار علی بھٹو پر یہ کتاب پہلی مرتبہ اس وقت شائع ہوئی جب جنرل ضیاء الحق کی آمریت اپنے عروج پر تھی اور اس کتاب کا دیباچہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے لکھا (جس کو اس ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے) آمریت کے سیاہ دور میں اس کتاب کی اشاعت، کاروانِ شہادت میں شامل لوگوں کی طرف سے لکھی گئی پہلی تین چار کتابوں میں پہلی کتاب کے طور پر جانی جاتی ہے اور یہ اس وقت شائع ہوئی جب ملک کی فضاؤں میں ''کافر''، ''قاتل''، ''خائن''، ''غدار''، ''مکار اور عیار'' کے نعرے ''مسلط'' کیے جا رہے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت سے اِن نعروں اور الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی، زیر نظر کتاب کی اشاعت ہر آنے والے وقت میں بڑھتی گئی اور اس کو سندھ، پنجاب، بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے جیالوں نے بھٹو کی سیاست کا ایک سبق قرار دے دیا۔ یہ کتاب ریاستی سرپرستی میں مسخ شدہ تاریخ جو کہ پرنٹ میڈیا اور سرکاری میڈیا کی طرف سے مسلط کی جا رہی تھی کا ایک جواب تھا۔ اس کتاب کی اشاعت میں کئی سالوں (1993ء سے 2004ء) تک تعطل بھی آیا، اس لیے کہ میں نے یہ سمجھا کہ یہ ایک جذباتی کتاب ہے، مگر ڈاکٹر انور سجاد جیسے ادیبوں کا اصرار تھا کہ اس کو شائع ہوتے رہنا چاہیے چونکہ یہ کتاب اس آسیب زدہ دور کی عکاسی کرتی ہے جس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لہٰذا میں ایسے مجبور ادیبوں کی رائے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوا اور یوں 2004ء کے بعد اس کی پھر بار بار اشاعت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ شاید یہ کتاب پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو پر سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتابوں میں شامل ہے۔

زیرِ نظر ایڈیشن کے تیسرے حصہ میں پانچ نئے ابواب شامل کیے ہیں جبکہ دیگر ابواب میں بھی ترامیم اور اضافہ کیا گیا ہے۔ ''میرا لہو'' جہاں ذوالفقار علی بھٹو شہید کی ایک مختصر سوانح عمری ہے، وہیں پر یہ کتاب اس جبر کی بھی کہانی ہے جس کے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے بلکہ کچھ زخموں نے ناسور کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اسی ناسور (انتہاپسندی) نے ہمارے سماج کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ معاشرے میں عقیدے کی بنیاد پر قتل وغارت یا پھر Culture of Violence کے بیج درحقیقت 1977ء کے انتخابات کے دوران ہی ڈال دیے گئے تھے۔ جب مذہبی نعرے بلند کرتے ہوئے سیالکوٹ اور لاہور کی شاہراہوں پر ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت کرنے والوں کو سرعام قتل اور اُن کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا اور پھر جنرل ضیاءالحق نے اس ''مشن'' کو ریاستی سطح پر متعارف کروایا۔ پاکستانی معاشرہ خون اور آگ کے جس گھیرے میں ہے اس کی بنیادیں ذوالفقار علی بھٹو کے مخالف انتخابی اتحاد (PNA) نے رکھیں اور پھر ان بنیادوں پر جنرل ضیاءالحق نے خطے میں انتہاپسندی کا ایک بھوت بنگلہ کھڑا کر دیا۔ جس نے پاکستان اور افغانستان کے امن کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جدید دنیا کی سیاست میں اسلام کے نام پر پہلی بنیاد پرست تحریک پاکستان میں ہی چلائی گئی جس کی سرپرستی امریکی سی آئی اے اور اس کے آلہ کاروں نے رکھی، یعنی ''پاکستان قومی اتحاد'' کی تحریکِ نظام مصطفیٰ جس میں ایک سیکولر لیڈر نے بار بار ذوالفقار علی بھٹو کو کوہالہ میں سرعام پھانسی دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس مذہبی بنیاد پرستی کی تحریک نے خطے کو وقت کے ساتھ مزید خون آلود کر دیا۔ اس تحریک کا پہلا بڑا نشانہ ذوالفقار علی بھٹو تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کے بارے میں آپ بخوبی آگاہ ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو شہید دورانِ مقدمہ تقریباً 13 ماہ پابندِ سلاسل رہے یہ وقت انہوں نے اپنے خلاف سازش سے لڑتے ہوئے گزارا اور موت کا سایہ اُن کے سر پر رہا، یہ وقت اُن کی زندگی کا اہم ترین وقت تھا، موت یا مفاہمت ...... مگر انہوں نے موت کو ترجیح دی اور اس طرح انہوں نے ایک شعوری جدوجہد کے نتیجے میں شہادت حاصل کی نہ کہ کسی حادثے میں۔

میں اُن کے کاروانِ جدوجہد کا ایک ادنیٰ سا رکن رہا ہوں، پاکستان کے حوالے سے میرا سیاسی سبق یہ ہے کہ پاکستان میں سٹیٹس کو، کو اس وقت تک گرایا ہی نہیں جا سکتا جب تک اس کے خلاف مزاحمتی طاقت کو جذبے کے ساتھ ساتھ Rational بنیادوں پر منظم نہ کیا جائے، آج پاکستان میں قتل و غارت بڑی عام ہے بلکہ معاشرے کا حصہ بن گئی ہے لہٰذا ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے بعد، شاہنواز بھٹو،

مرتضیٰ بھٹو اور محترمہ بےنظیر بھٹو کے قتلوں کے بعد اس کاروان جدوجہد کو سوچنا ہوگا کہ اُن کی کامیابی کے لیے حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟ ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت سمیت کارواں میں شامل سب شہیدوں پر ہمیں ناز ہے، لیکن میرا سیاسی سبق یہ ہے کہ اس کارواں کو اب ایسا راستہ اپنانا ہوگا جو کہ غازی کا راستہ بن جائے اور یہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں، جب تک اس کارواں کو دانش اور شعور کے ساتھ نظریاتی بنیادوں پر ایک کیڈر میں نہ بدل دیا جائے جو تبدیلی کا کیڈر بن جائے۔ 2006ء کے بعد اسی لیے میں نے عملی سیاست سے علیحدگی اختیار کی کہ پہلے فکری سفر میں اپنا حصہ ڈالا جائے، چونکہ سماج میں قتل کا بازار گرم ہے اور ایسے میں فکری خلاء میں اپنا کردار وقت کا تقاضا ہے۔ اس کاروانِ شہادت کو اب غازیوں کا خواب دیکھنا ہوگا اور اسی لحاظ سے منظم ہونا ہوگا، جیسے غازی مصطفیٰ کمال پاشا، ماؤزے تنگ جو کامیاب انقلاب کے بانی ہیں۔ قتل کا یہ بازار اپنے عروج پہ ہے اور کسی بھٹو کی شہادت ایک جذبہ تو دے سکتی ہے مگر تبدیلی کا سبب نہیں بن سکتی، یہی تاریخ کا سبق ہے اور تبدیلی اس وقت ممکن ہی نہیں کہ جب تک تبدیلی کا کیڈر تشکیل نہ دے دیا جائے، وگرنہ بے ہتھیار کاروانِ جدوجہد، قتل کے اس بازار کا نشانہ بنتے رہیں گے، جس کو جنرل ضیاءالحق نے اپنے شیطانی منصوبے سے سجایا ہے۔ آج ذوالفقار علی بھٹو کے 32 ویں یوم شہادت پر اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر میں نے اپنے تجربے کو چند الفاظ میں قلمبند کرکے یہ کوشش کی ہے کہ بھٹو کا انتقام ،نظام کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے اور یہ تبدیلی ایک منظم کارواں کے بغیر ناممکن ہے، یہ میرا تین دہائیوں پر مشتمل سیاسی تجربہ ہے۔

فرخ سہیل گوئندی

اپریل 2011ء

لاہور

www.bhutto.org

زندہ بھٹو

پاکستان کی سیاست میں کوئی بھی سیاسی راہنما ذوالفقار علی بھٹو کی طرح اثرات مرتب نہیں کر پایا۔ جس کم عمری میں انہوں نے سیاسی شہرت حاصل کی وہ کسی بھی دوسرے لیڈر کو میسر نہ ہو سکی۔ ان کی سیاسی زندگی ایک بھرپور سیاسی زندگی تھی، اور زندگی کا سفر بھی انہوں نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ طے کیا۔ حکومت کے ایوانوں میں ایک نوجوان وزیر کے طور پر نامزدگی سے لے کر وزارت خارجہ کے عہدے تک یہ ان کا بھرپور سیاسی مرحلہ تھا، اور جب وہ وزارت خارجہ سے مستعفی ہو کر عوام میں آئے تو وہ پاکستان کے مقبول ترین راہنما کے طور پر جانے گئے تھے۔ انہوں نے پاکستان کی پہلی عوامی تحریک (1966-67ء) کی بھی قیادت کی، جس میں طلباء، نوجوان، عورتیں اور مزدور شامل تھے۔ پاکستان میں اس جیسی انقلابی تحریک کی قیادت کا اعزاز بھی کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا اور پھر انہوں نے پاکستان میں عوام کی طاقت پر ایک انمٹ سیاسی جماعت (پی پی پی) کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت نے جس قدر مقبولیت حاصل کی وہ اعزاز بھی کسی اور راہنما کو حاصل نہ ہو سکا۔ پھر وہ ان ہی عوامی بنیادوں پر پاکستان کی پہلی منتخب عوامی حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ سیاست اور زندگی کا یہ سفر انہوں نے کم عمری میں طے کیا۔ پاکستان کے علاوہ ان کی مقبولیت کا ستارہ مشرقِ وسطیٰ، ایشیا اور افریقہ سمیت دنیا کے کونے کونے میں چمکنے لگا۔ جہاں شہرت اور مقبولیت ذوالفقار علی بھٹو کے حصے میں آئی، دوسری طرف اسی انتہا کے ساتھ ان کی کردار کشی بھی کی گئی، جس میں ملک کے بالائی طبقات شامل تھے، جنہیں ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی سیاست کے نتیجے میں زک پہنچی۔ ان عوامی خدمات کے ردعمل کے نتیجے میں ان کو ایک باقاعدہ عالمی سازش کے تحت قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا، جس کو جنرل ضیاء الحق نے "پایۂ تکمیل" تک پہنچایا۔

پاکستان میں عوامی رائے یہی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو غیر ملکی طاقت نے اس لیے اقتدار سے

www.bhutto.org

ہٹانے اور قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی کہ انہوں نے پاکستان کو ایک نیوکلیئر طاقت بنایا، جو کہ غلط نہیں۔ مغرب اور خصوصاً امریکہ کے لیے یہ ایک انتہائی ناخوش گوار لمحہ تھا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کو ایک نیوکلیئر طاقت بنانے میں مصروف تھے، مگر امریکہ کے نزدیک جناب بھٹو کے ''جرائم'' اس کے علاوہ بھی تھے، جس میں 1973ء کی جنگِ رمضان (جنگِ اسرائیل۔ مصروشام) میں ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بڑا اہم ہے۔ میرے مطالعے میں یہ بات آئی ہے کہ امریکیوں اور صیہونیوں نے مسٹر بھٹو کو قتل کرنے کا حتمی فیصلہ جنگِ رمضان کے دوران کرلیا تھا۔ چونکہ جہاں مسٹر بھٹو نے اس جنگ میں عربوں کی سیاسی اور عسکری حمایت کی تھی وہیں مسٹر بھٹو ہی نے تیل پیدا کرنے والے ممالک کو اس بات کی ترغیب دی تھی کہ وہ مغرب کو تیل کی سپلائی، بطور ہتھیار بند کردیں۔ Oil as a Weapon امریکیوں اور مغرب کے لیے ایک غیر متوقع حکمتِ عملی تھی۔ تیل کی عدم سپلائی نے مغرب کی مشینی زندگی کو جامد کر کے رکھ دیا تھا جس کی بازگشت اب بھی مغرب میں سنی جاسکتی ہے۔ امریکہ میں ایک عام شہری Oil Embargo کے واقعے کو اپنی تاریخ کا نہ بھلانے والا واقعہ تصور کرتا ہے۔ جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مغرب اور خصوصاً امریکہ کے لیے تیل کس قدر اہم چیز ہے۔ جس کا ثبوت سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں برپا کی جانے والی دونوں یکطرفہ خلیجی جنگیں بھی ہیں جن میں امریکہ نے بھرپور انداز میں اپنے آپ کو اپنے دیگر اتحادیوں کے ہمراہ داخل کرر کھا ہے۔

اب یہ حقائق منظرِ عام پر آنے شروع ہوگئے ہیں کہ سرد جنگ کے عروج میں امریکہ کی قومی سلامتی کے سابق مشیر برزنسکی (Zbigniew Brzezinski) نے یہ منصوبہ بندی کی تھی کہ کسی طرح سوویت یونین افغانستان میں فوجی مداخلت کرے اور پھر امریکہ کو یہ موقع مل سکے گا کہ وہ سوویت یونین کی افغانستان میں فوجی مداخلت کے خلاف غیر اعلان شدہ جنگ کا آغاز کردے۔ اس کے لیے پاکستان میں ایسی حکومت امریکہ کی پالیسی کے خلاف ایک رکاوٹ ثابت ہوسکتی تھی جو خطے میں امریکی مفادات کے خلاف ایک خودمختار مؤقف اختیار کرے۔ لہٰذا ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ایک ایسی ہی حکومت تھی، اس لیے بھٹو حکومت کے خلاف 1977ء میں PNA کا قیام اور پھر PNA کے نام سے اسلامی نظام/نظامِ مصطفیٰ ؐ کے نعرے پر تحریک کا آغاز کیا گیا۔ جس کا مقصد صرف اور صرف بھٹو حکومت کا خاتمہ تھا۔ یہ تحریک ایک مذہبی بنیاد پرست تحریک تھی، جو امریکہ کے سرمائے اور اس کی سیاسی سپورٹ پر تشکیل دی گئی، اس لحاظ سے ہم عصر سیاسی تاریخ میں امریکہ نے تشدد پر مبنی پہلی مذہبی بنیاد پرست تحریک کو تشکیل دیا۔ جس کے نتیجے میں

ایک قوم پرست، ترقی پسند اور عوامی راہنما ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا خاتمہ کیا گیا۔ مارشل لاء کا نفاذ اس تحریک کا دوسرا عملی منصوبہ تھا، جس نے مستقبل میں امریکی مفادات کو خطے میں تحفظ فراہم کرنا تھا۔

5 جولائی 1977ء کو بھٹو کی منتخب حکومت کا خاتمہ کیا گیا۔ 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور اس دوران پورے ملک اور خطے میں امریکیوں نے جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں مذہبی بنیاد پرستی کی بساط قائم کی اور اسی دوران افغانستان میں سوویت یونین کی افواج داخل ہوگئیں۔ جس کے خلاف امریکیوں نے جنرل ضیاء کی قیادت میں Proxy War کا آغاز کیا جس کا وہ پہلے تجربہ انگولا، صومالیہ اور ایتھوپیا میں کر چکے تھے اور اس کے لیے امریکیوں نے مذہب کی بنیاد پر مسلم ممالک سے مجاہدین کو بھرتی اور ان کی مسلح ٹریننگ کا اہتمام کیا۔ اسلامی مجاہدین کو شروع میں مصر سے سوویت ساخت کے ہتھیار فراہم کیے گئے اور بعد میں اسرائیل سمیت تمام امریکی اتحادیوں کے ہتھیار نام نہاد افغان جہاد میں استعمال کیے گئے۔ یوں جہاد کے نام پر گوریلا جنگ کی گئی، جس کو امریکہ اور مغرب کے پالیسی سازوں اور میڈیا نے "جہاد" کے نام سے متعارف کروایا۔ افغانستان کی کیمونسٹ حکومت کے خلاف جنگ لڑنے والے یہ بنیاد پرست "جہادی" امریکہ کے اہم اتحادی تھے اور ان کی فلموں کے رومانوی کردار بھی، جو سوویت یونین جیسی "ملحد" طاقت کے خلاف افغانستان میں "مقدس جنگ" لڑ رہے تھے۔ ضیاء الحق اس مقدس جنگ میں "ہراول قائد" کے طور پر شامل تھا۔ جس نے اس منصوبے کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا خاتمہ اور ان کا جسمانی خاتمہ بھی کر دیا تھا۔ چونکہ امریکیوں کو یہ پورا یقین تھا کہ اگر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں خطے کی سیاست میں سرگرم رہا تو وہ سوویت یونین کے خلاف اس فیصلہ کن جنگ میں داخل نہیں ہوگا۔ جس کا میدانِ جنگ (افغانستان) امریکہ نے طے کیا تھا۔ چونکہ مغرب طاقت کے اس ابھرتے ہوئے توازن کو محسوس کر رہا تھا، جو ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کے سبب خطے میں قائم ہو رہا تھا اس لیے بھٹو حکومت کا خاتمہ امریکہ کی خطے میں پالیسی کا اہم ستون تھا۔

اسلامی دنیا اور تیسری دنیا کا اتحاد بھٹو کی سیاست کا اہم ستون تھا جو کہ امریکہ کو کسی طور پر بھی قبول نہیں تھا۔ اسلامی ممالک کے مابین، اقتصادی، معاشی، ثقافتی اور عسکری اتحاد کے لیے جناب بھٹو کی کوششیں ان کے وزارتِ خارجہ کے زمانے میں ہی شروع ہوئی تھیں۔ 19 اپریل 1966ء کو جب شاہ فیصل نے پاکستان کا دورہ کیا تو مسٹر بھٹو نے کہا:

"Pakistan agreed in principle to the idea of an Islamic Summit, but the practical application of the principle would have to be considered in great depth."

مسٹر بھٹو کے اسلامی دنیا کے اتحاد اور نیوکلیئر توانائی کے حصول کے بارے میں مغرب کیا Vision رکھتا ہے، وہ دلچسپی کا باعث ہے۔ امریکہ کے معروف سکالر سیموئیل پال ہنٹنگٹن جنہوں نے 1997ء میں معروف اور متنازعہ کتاب The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order لکھی وہ اس کتاب کے حتمی تجزیے کے آخری صفحات پر رقمطراز ہیں:

"Acceptance of these rules and of a world with greater equality among civilizations will not be easy for the West in its dominant role. In such a world, for instance, core states may well view it as their prerogative to possess nuclear weapons and to deny such weapons to other members of their civilization. Look back on this efforts to develop "full nuclear capability" for Pakistan. Zulfikar Ali Bhutto justified those efforts:

We know that Israel and South Africa have full nuclear capability. The Christian, Jewish and Hindu civilizations have this capability. Only the Islamic civilization was without it, but that position was about to change".

(The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order. p.317)

ہنٹنگٹن نے اپنی اس کتاب، جس میں انہوں نے تہذیبوں کے مابین تصادم کا تھیسز پیش کیا ہے، کے حتمی تجزیے میں جناب بھٹو کے اس نکتے کا حوالہ اپنی دلیل کے طور پر دیا ہے، جو مسٹر بھٹو نے دورانِ اسیری اپنی کتاب If I Am Assassinated میں پیش کیا تھا، کہ دنیا کی مختلف تہذیبوں کے درمیان ترقی اور طاقت کا عدم توازن موجود ہے۔ اس کے لیے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے نیوکلیئر توانائی کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کی اہمیت کا اندازہ آج کی عالمی صورتحال میں کرنا مشکل نہیں۔

جہاں تاریخ کو مسخ کرنے کا عمل عالمی سطح پر جاری ہے وہاں یہ عمل پاکستان میں بھی نہایت بھدے انداز میں کیا جارہا ہے۔ یہاں تاریخ کے عمل کو روکا بھی جارہا ہے اور اس کے ساتھ ہی تاریخ کو مسخ کرنے کا عمل ریاستی سطح پر جاری ہے، اور اس کا نشانہ ذوالفقار علی بھٹو بھی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کے شاندار ابواب جان بوجھ کر ہماری تاریخ سے مٹائے جارہے ہیں۔ اس میں صرف ریاست ہی شامل نہیں اور نہ ہی صرف رجعت پسند قوتیں، بلکہ وہ سیاسی گروہ بھی شامل ہیں جو لبرل اور روشن خیالی کے دعویدار ہیں، نیز ذوالفقار علی بھٹو کے نام پر سیاست کرنے والی جماعت کے کئی اہم راہنما بھی کیونکہ وہ مسٹر بھٹو کی سیاست کو اپنے طبقات کے لیے آج بھی خطرہ تصور کرتے ہیں جبکہ جناب بھٹو کے حوالے سے پاکستان یا دنیا کے کسی بھی ملک سے ابھی تک کوئی بھی جامع تحقیق سامنے نہیں آئی۔ یوں پاکستان اور عالمی

سیاست کا یہ شاندار کردار تاریخ کے اوراق سے شعوری طور پر او جھل کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ تاریخ نویسی طاقتور قوتوں کی سرپرستی میں کی جاتی ہے جیسا کہ George Orwell کہتا ہے کہ:

"He who controls the past, controls the future. He who controls the present ,controls the past."

جبکہ معروف امریکی مورخ ہاورڈ زن کہتے ہیں کہ:

"In other words those who dominate our society are in a position to write our histories."

''میرا لہو'' ذوالفقار علی بھٹو پر میری پہلی کتاب تھی، جو 1986ء میں شائع ہوئی، تب ضیاء الحق کی آمریت اپنے عروج پر تھی اور اس طرح یہ ان دو تین کتابوں میں سے ایک کتاب تھی جو ضیاء آمریت کے عروج میں جناب بھٹو پر شائع ہوئیں۔ یہ میرا یونیورسٹی میں طالب علمی کا زمانہ تھا اور اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کو شاندار پذیرائی ملی لیکن درحقیقت یہ کتاب میں نے یونیورسٹی کے زمانے سے بہت پہلے، یعنی ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کے فوراً بعد تحریر کی اور پھر اس کی اشاعت کے لیے 1979ء سے 1986ء تک سات سال انتظار کیا۔

کافی عرصہ ملک بھر سے مجھ سے لاتعداد لوگوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا جائے، اس خواہش کا اظہار کرنے والوں میں میری شریک حیات ریما گوندی بھی شامل ہیں جبکہ میری یہ خواہش تھی کہ میں اس کو دوبارہ شائع کرنے کے بجائے ایک اور جامع تحقیقی کتاب لکھوں اور میری یہ خواہش ابھی بھی قائم ہے۔ مگر زیرِ نظر کتاب ''میرا لہو'' کے پہلے سے شائع شدہ مسودے کی روشنی میں ترمیم اور اضافے کے ساتھ یہ ایک نیا مسودہ ہے مگر میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ یہ کتاب بھی مسٹر بھٹو کی شاندار سیاست کے نا مٹنے والے تاریخ ساز باب کے لیے کافی نہیں۔ یہ ایک مزید کوشش ہے اس لیے کہ پاکستان کی عوامی تاریخ کا یہ باب عوام کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور شاید وہ وقت بھی آئے جب مسٹر بھٹو پر ایک مکمل تحقیق سامنے آئے اور اس طرح یہ تحریریں اس تسلسل کا حصہ بن جائیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاء الحق نے آزادیٔ اظہار پر جو پابندیاں لگائیں، اس کا اندازہ آج کی نوجوان نسل کو ضرور ہونا چاہیے۔ ان پابندیوں کا نشانہ روزمرہ برپا ہونے والے حقائق اور واقعات بھی تھے، مگر سب سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ وہ زمانہ تھا جب اخبارات و جرائد میں دار پر لٹکائے گئے عوامی راہنما ذوالفقار علی بھٹو کی تصویر شائع کرنے پر پابندی لگا دی گئی اور تو اور ان پابندیوں کی

www.bhutto.org

حد یہ تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کا لفظ/ نام شائع کرنا بھی ممنوع ٹھہرا اور اگر کہیں کسی تحریر میں بامر مجبوری ذوالفقار علی بھٹو لکھنا انتہائی ضروری ہوتا تو سابق وزیر اعظم لکھنے پر اکتفا کیا جاتا۔ ملک میں چونکہ مسٹر بھٹو کے حوالے سے Polarization تھی اس لیے جو رسائل و جرائد اور اخبارات مسٹر بھٹو کی سیاسی، ذاتی اور اخلاقی کردار کشی کرنا چاہتے ان کو کھلی چھٹی تھی۔ ان مضامین اور تحریروں میں مسٹر بھٹو کو کافر، ملحد، ملک توڑنے والا، ظالم، قاتل جیسے القابات سے نوازا جاتا۔ یہ سارا کچھ حکومتی سرپرستی میں ہوا۔ پاکستان کی مختصر تاریخ نے اظہار آزادی کے حوالے سے شاید ایسا کڑا زمانہ کبھی نہیں دیکھا۔

☆ لیکن جیسا کہ خود جناب ذوالفقار علی بھٹو نے عدالت میں اپنی صفائی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''مجھے علم ہے کہ آج میں عدالت کے کٹہرے میں ایک ملزم کے طور پر کیوں کھڑا کیا گیا ہوں، خود عدالت کو بھی ان حقائق کا علم ہے اور ان قوتوں کو بھی جنہوں نے یہ سارا اہتمام کیا ہے۔ تاریخ ایک دو دھاری تلوار ہے جس کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا اور وہ وقت آئے گا جب تاریخ فیصلہ کرے گی کہ میرا جرم کیا تھا اور تاریخ میری صفائی کا مقدمہ خود پیش کرے گی۔''

فرخ سہیل گوئندی

30 ستمبر 2005ء، بیروت (لبنان)

dmocrat@brain.net.pk

پہلا حصہ

www.bhutto.org

www.bhutto.org

امریکی سرپرستی کا آغاز

اکتوبر 1917ء کے سابق سوویت یونین انقلاب نے سرمایہ دار ممالک کے عالمی کردار کو بہت حد تک واضح کر دیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں روایتی امپیریل ازم آخری سانس لینے پر مجبور ہو گیا اور اس کی جگہ نیا سامراجی ڈھانچہ دنیا پر مسلط کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ایک طرف مشرقی یورپ میں جنگِ عظیم دوم کے بعد سابق سوویت یونین کو اثر ورسوخ حاصل ہو گیا اور دوسری طرف ایشیا اور افریقہ میں نیشنلزم کی بنیاد پر آزادی کی تحریکوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور نوآبادیاتی نظام سے علیحدہ ہو کر پسماندہ قوموں نے آزادی حاصل کر کے عالمی سیاست کے نئے دور کا آغاز کیا۔ چین کے اندر ماؤزے تنگ نے کسانوں کی مدد سے سوشلسٹ انقلاب برپا کر کے جہاں ایک طرف عالمی سرمایہ داروں کو شکست سے دوچار کیا وہاں اس انقلاب نے روایتی مارکسسٹوں کے اس فلسفے کو رد کر دیا کہ صرف مزدور طبقہ ہی انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ جنگِ عظیم دوم نے دنیا کے سیاسی، معاشی، اقتصادی اور عسکری اپروچ کے نئے زاویے طے کیے۔ دنیا بھر میں نیشنلزم اور سوشلزم کی بنیاد پر محکوم قومیں قومی و معاشی آزادی کے علم بلند کیے ہوئے سامراج کو پیچھے دھکیلنے میں مصروف تھیں۔ ایسے میں جدید سامراج نے بھی اپنی ''کوتاہیوں'' کو دور کر کے نئے طریقِ کار اپنائے۔ ایک طرف اس نے مغربی یورپ کے لیے مارشل پلان کا اعلان کیا تا کہ یورپ کے اندر سرمایہ دار اتحادی قوتوں کو زندہ رکھا جا سکے تو دوسری طرف امریکیوں نے عالمی سطح پر یورپ، ایشیا، افریقہ، مشرقِ بعید اور لاطینی امریکہ کے اندر مختلف عسکری معاہدات کیے جو ''کمیونزم کے بھوت'' کے خوف کے نتیجے میں قائم کیے گئے۔ کمیونزم کو روکنے کے لیے امریکیوں نے جہاں عسکری معاہدات کر کے پسماندہ اقوام کو اپنی جدید استحصالی زنجیر میں جکڑا وہاں امریکیوں نے ترقی پذیر ممالک میں فوجی بغاوتیں برپا کر کے اپنی مرضی کی حکومتیں بھی تشکیل دیں تا کہ استحصال زدہ ممالک پر کنٹرول مضبوط رہے۔ اس کے لیے

امریکیوں نے سی آئی اے جیسے اداروں کو مضبوط ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ پاکستان ان بدنصیب ممالک میں سے ایک ملک ہے جہاں امریکہ نے شروع سے مداخلت اور پاکستان کی اشرافیہ کے ساتھ اتحاد کر کے اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیا۔ امریکہ جو دنیا بھر میں جمہوریت کا علمبردار ہے لیکن اگر ترقی پذیر ممالک میں اس کا کردار دیکھیں تو وہ عوام دشمن اور غیر جمہوری ہے۔ پاکستان میں بھی امریکہ نے اپنے عالمی اور اقتصادی مفادات کی خاطر غیر جمہوری قوتوں کی سرپرستی کر کے عوام کو ان کے سیاسی و سماجی حقوق سے محروم رکھنے کی پالیسی پر عمل کیا۔ پاکستان میں پہلے مارشل لاء کے نفاذ کے لیے امریکیوں نے باقاعدہ حکمت عملی کے تحت اپنے مہرے تیار کیے جن کو بعد میں مناسب وقت پر استعمال کیا گیا۔

امریکیوں نے 1951ء سے پاکستانی معاملات میں دلچسپی بڑھانی شروع کردی۔ اس کی علاقائی اور عالمی وجوہات تھیں جن میں نہرو کے امریکہ مخالف نظریات سمیت ایران کے اندر ڈاکٹر مصدق کی قیادت میں نئی سوچ ابھری جو امریکی مفادات کے سراسر خلاف تھی۔ ایسے میں پاکستان کا علاقائی کردار امریکیوں کی جھولی میں جا گرا۔ 1953ء میں امریکی "ماہرین" کی وساطت سے گندم کا جعلی بحران پیدا کر کے اور پھر گندم کی امداد کا اعلان کر کے پاکستانی عوام میں بائیں بازو کی بڑھتی ہوئی حمایت کو توڑنے کی ترکیب استعمال کی گئی لیکن یہ گندم ایک سال بعد پہنچی جس سے امریکیوں کی نام نہاد دوستی کا پول شروع ہی میں کھل گیا۔ وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کی طرف سے ماسکو کے دورے کی دعوت کو ٹھکرانے کے بعد اوپری سطح پر متعدد تبدیلیاں کی گئیں۔ فروری 1954ء میں جی ایچ کیو راولپنڈی میں ایک خصوصی شعبہ قائم کیا گیا جہاں سے امریکیوں نے پاکستان کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں براہِ راست رسائی حاصل کرلی۔ اس شعبے کا نام یو ایس ایم اے اے جی (United States Military Assistance Advisory Group) رکھا۔ یہ فوج کے اندر امریکیوں کی طرف سے اثر و رسوخ حاصل کرنے کی ابتدا تھی۔

ستمبر 1953ء میں پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے امریکہ کا دورہ کیا جہاں اعلیٰ امریکی پالیسی سازوں نے اپنے "پاکستانی مہمان" کے ساتھ متعدد ملاقاتیں کیں۔ ایوب خان نے امریکہ کی فوجی تنصیبات کا معائنہ بھی کیا اور اس دوران ایوب خان نے امریکی وزیر دفاع چارلس ای ولسن، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے ایڈمرل راڈفورڈ، محکمۂ خارجہ کے انڈر سیکرٹری والٹر بیڈل سمتھ، لیفٹیننٹ جنرل انتھونی میک اولف اور سی آئی اے کے بدنام زمانہ سربراہ ایلن ڈلس سے بھی ملاقات کی جبکہ نہرو اس دوران غیر وابستہ تحریک کی بنیاد ڈال رہے تھے جو کہ سامراج کے خلاف ترقی

پذیر ممالک کی غیر وابستگی کے لیے ایک کوشش تھی۔ ایوب خان کے اس دور یے کے بعد امریکیوں کو پاکستان میں فضائی اڈے استعمال کرنے کی خفیہ اجازت بھی مل گئی۔ 2 اپریل 1954ء کو امریکہ کے ساتھ ''دوستی'' کا ایک قدم اور بڑھایا گیا۔ کراچی میں ترکی اور پاکستان نے ایک فوجی معاہدے پر دستخط کیے جو درحقیقت امریکی خواہشات اور مفادات کی تکمیل کے لیے سابق سوویت یونین کی سرحدوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا ایک قدم تھا۔ اس کے ایک مہینہ بعد 19 مئی کو امریکہ اور پاکستان نے ایک باہمی سکیورٹی اور مدد کا معاہدہ کیا یعنی یہ کہ برطانیہ کے متبادل کے طور پر امریکہ نے پاکستانی فوج کی طرف ''دوستی کا ہاتھ'' بڑھایا۔ دوستی میں ترقی کا یہ عمل بتدریج بڑھتا رہا۔

ستمبر 1954ء کو SEATO معرضِ وجود میں آیا۔ یہ عسکری معاہدہ چینی کمیونزم کے عفریت کو روکنے کے لیے کیا گیا۔ اس معاہدے کے شریک کار امریکہ، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، پاکستان اور تھائی لینڈ تھے۔ پاکستان جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ دونوں خطوں میں امریکہ سے دوستی نبھانے میں مصروف تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا اگر چینی انقلاب کی تاثیر کے ساتھ سر اٹھا رہا تھا تو مشرقِ وسطیٰ میں جمال عبدالناصر جیسے ترقی پسند، قوم پرست راہنما سر اٹھا رہے تھے جو امریکی اور مغربی سامراجی مفادات کے لیے ایک بڑی مزاحمت کا سبب بن رہے تھے لہٰذا SEATO معاہدے کے ایک سال بعد، بغداد پیکٹ کے نام سے ایک اور معاہدہ کیا گیا جس میں برطانیہ، ایران، عراق، ترکی اور پاکستان شامل تھے۔ یوں سامراج ایک عالمی اور علاقائی سامراجی نیٹ ورک قائم کر رہا تھا لیکن بغداد پیکٹ کے چند ماہ بعد ہی ایک سامراج دشمن بغاوت کے نتیجے میں عراق سے بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ ریڈیکل انقلاب مغربی استعماریت کے لیے ایک بڑا دھچکا ثابت ہوا لہٰذا برطانوی محکمۂ خارجہ نے اس معاہدے کو ایک نئی شکل دی جس کو سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (CENTO) کا نام دیا گیا۔ کتنا دلچسپ پہلو ہے کہ جب جمال عبدالناصر نے مغرب اور اسرائیلی توسیع پسندی کے خلاف آواز بلند کی تو پاکستان مغربی ممالک کے اتحادی کے طور پر مغرب کی حمایت کر رہا تھا جبکہ پڑوسی ملک بھارت عرب نیشنلزم کے بھرپور حمایتی کے طور پر جمال عبدالناصر کی حمایت کا اعلان کر رہا تھا۔ امریکہ نے پاکستان کے حکمرانوں کو مکمل طور پر اپنی سرپرستی سے نواز کر اپنے ''مفادات کا تحفظ'' اور خطرات سے نمٹنے کا انتظام کر لیا تھا اور اگر سماج میں سیاسی حقوق کے حصول یا امریکہ مخالف آواز اٹھتی تو اس کو قابو کرنے کی تیاری بھی کر لی گئی تھی یعنی امریکہ نے پاکستانی حکمرانوں کے ساتھ تعلقات استوار کر کے نیوکلونیل نظام کا ڈھانچہ کھڑا کیا جو عوام کے مفادات کی تکمیل کے

بجائے امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے قائم ہوا۔ مندرجہ بالا عسکری اور دفاعی معاہدات کسی طرح بھی پاکستان کی سلامتی کے لیے نہیں تھے بلکہ ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ امریکہ یا پاکستانی حکمرانوں کو ہوا جو سامراجی آشیرباد کے تحت پاکستان کے اقتدار پر مسلط رہے ہیں۔

طاقت کے ایوانوں میں

پاکستان کی سیاست پر روز اول ہی سے چند خاندانوں، جاگیرداروں، سول وفوجی افسر شاہی اور بیرونی سامراجی مفادات کی تکمیل کرنے والوں کی گرفت رہی ہے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو اپنی تعلیم مکمل کر کے کراچی منتقل ہوئے تو اس وقت پاکستان محلاتی سازشوں اور غیر عوامی سیاست کے بھنور میں پھنس چکا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی اپنے اعلیٰ خاندانی پس منظر کے حوالے سے ہی سیاست اور اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوئے، لیکن ذوالفقار علی بھٹو کی ذہانت اور جدید خیالات ونظریات نے ان کو دیگر جاگیرداروں اور مراعات یافتہ نوابزادوں سے ہمیشہ ہی منفرد بنایا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عالمی شہرت یافتہ صحافی اوریانا فلاشی کو اپنے ایک تاریخی انٹرویو میں کہا کہ:

"میں نے اپنے جاگیردار اور مراعات یافتہ پس منظر کے حوالے سے اپنی دولت کو عیاشیوں کے بجائے حصول علم کی خاطر استعمال کیا۔ میرے مغرب کے سفر کلبوں کی عیاشیوں کے بجائے معروف سکالرز اور دانشوروں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں کام آئے اور میرا پیسہ کتابوں پر صَرف ہوا۔"

اوریانا فلاشی اپنی کتاب Interview With History میں لکھتی ہیں کہ "اس امر کی تصدیق المرتضیٰ (لاڑکانہ) اور 70 کلفٹن (کراچی) میں ذوالفقار علی بھٹو کے گھروں میں شاندار لائبریریاں کرتی ہیں جہاں دنیا کے تقریباً ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں اور ان کتابوں کو سجاوٹ کے بجائے حصول علم کے لیے لائبریریوں میں آراستہ کیا گیا ہے جس کا ثبوت ان کتابوں پر لگائے گئے نشانات ہیں۔ یقیناً یہ پاکستان کے روایتی جاگیردار سیاستدانوں کے برعکس ایک روایت ہے۔"

امریکہ سے تعلیم مکمل کر کے پاکستان واپسی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سیاسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے پاکستانی سیاست کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے رہے۔ حسین شہید سہروردی جیسے مایۂ ناز اور عوامی

www.bhutto.org

سیاستدان کے ساتھ ان کی بحثیں دوستی میں بدل گئیں حالانکہ سہروردی، ذوالفقار علی بھٹو کے والد کے دوست تھے۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان کا حکمران طبقہ وفاقی نظام کے بجائے ون یونٹ ملک کے لیے لازم قرار دے رہا تھا۔ ایسے میں ذوالفقار علی بھٹو نے سندھ کے حقوق کے لیے ایک تنظیم بھی قائم کی جس کا نام "سندھ یونٹ فرنٹ" رکھا۔ اس پلیٹ فارم کے زیر اہتمام تقاریر اور تحریروں کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو نے ون یونٹ کے مضمرات اور نقصانات پر روشنی ڈالی۔ نوجوان بھٹو کے ترقی پسند اور روشن خیال نظریات نے حسین شہید سہروردی کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ یہ نوجوان پاکستان کے لیے ایک قابلِ قدر سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو عوامی لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے لیے ایک مرتبہ شیخ مجیب الرحمن بھی بھٹو سے ملے لیکن بھٹو نے عوامی لیگ میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ حسین شہید سہروردی اور سکندر مرزا کی خواہش پر ذوالفقار علی بھٹو کو ستمبر 1957ء میں اقوامِ متحدہ میں نمائندگی کے لیے ایک وفد میں شامل کیا گیا۔ اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم پر ذوالفقار علی بھٹو نے "امنِ عالم اور جارحیت" کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی پہلی ایسی پرفارمنس تھی جس نے نوجوان ذوالفقار علی بھٹو کی صلاحیتوں کو بے نقاب کیا۔ بھٹو نے جارحیت کی ایسی تعریف کی جس پر اقوامِ متحدہ کے دیگر وفود بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ جب واپس وطن لوٹے تو ذوالفقار علی بھٹو کی ذہانت اور قابلیت اپنا آپ منوا چکی تھی۔ اسی لیے مارچ 1958ء میں ان کو دوبارہ اقوامِ متحدہ کی ایک کانفرنس منعقدہ جنیوا میں بھیجا گیا جہاں ذوالفقار علی بھٹو نے بحری سرحدات کے مسئلے پر پاکستانی موقف کی وکالت کرتے ہوئے عالمی امور کے ماہرین کو قائل کر لیا۔ اس طرح ذوالفقار علی بھٹو پاکستانی سیاست کے ایوانوں میں اپنی حیثیت بھی منوانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان نے ملک میں پہلا مکمل اور بھرپور مارشل لاء لگا دیا۔ پاکستان میں پہلے مارشل لاء کو عوامی سطح پر خوش آمدید کہا گیا۔ یوں پہلی بار فوج براہِ راست حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے میں کامیاب ہوئی۔ ایوب خان کا مارشل لاء ایک طاقتور اور جابر مارشل لاء تھا۔ اس کو ملک کے اندر اور باہر (امریکہ اور مغرب) کی حمایت حاصل تھی۔ ایوبی مارشل لاء نے عوام کو یہ تاثر دیا کہ ہم ملک کو سیاسی اور معاشی استحکام دینے میں کامیاب ہوں گے۔ اس لیے ہمیں سیاسی اور معاشی منصوبے تشکیل دینے ہیں۔ ایوب خان نے جو کابینہ تشکیل دی اس میں ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل تھے۔ وہ ایوبی کابینہ میں سب سے کم عمر وزیر تھے۔ ان کی عمر اس وقت 30 سال تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو وزارتِ صنعت و تجارت کا وفاقی وزیر نامزد کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو، صدرِ پاکستان سکندر مرزا کی سفارش پر وزیر نامزد

ہوئے۔ جنرل ایوب خان نے سکندر مرزا کو معزول کر کے اکتوبر میں تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے لیکن نوجوان ذوالفقار علی بھٹو سمیت تمام کابینہ کو کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح ذوالفقار علی بھٹو نے وزارتِ صنعت وتجارت کے اعلیٰ عہدے سے ملکی سیاست میں عملی زندگی کا آغاز کیا۔

ایوب خان کا مارشل لاء امریکی حمایت سے مسلط کیا گیا اور امریکہ کے عالمی اور علاقائی مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری تھا کہ چین اور سوویت یونین کے اثر ورسوخ کو بتدریج محدود کرتے کرتے ختم کر دیا جائے۔ پاکستان کے دونوں حصوں، مشرقی اور مغربی پاکستان میں بائیں بازو کی جماعتوں اور نظریات کو کچلنے کے لیے فوجی آمریت ایک بہترین آلہ ثابت ہو سکتی تھی۔ چونکہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان بھارت ایک جمہوری نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور وہاں پر جواہر لعل نہرو امریکہ کے سب سے بڑے مخالف سوویت یونین کا اتحادی بن چکا تھا۔ البتہ چین کے ساتھ اس کے سرحدی تنازعات کے سبب تعلقات بہت زیادہ حد تک ناساز تھے لیکن بھارت نہایت ہوشیاری سے ایک حد تک نیشنلسٹ خارجہ پالیسی پر گامزن تھا جبکہ امریکہ کے ساتھ اس کے تعلقات دوطرفہ بنیادوں پر استوار تھے لیکن پاکستان میں چونکہ جمہوریت جڑیں نہیں پکڑ پائی تھی اس لیے پاکستان تیسری دنیا کے ان بدنصیب ممالک میں سے ایک تھا جہاں پر امریکہ نے فوجی آمریت کے ذریعے اپنا اثر ورسوخ نہ صرف قائم کر لیا بلکہ اس کی بالادستی پاکستانی اشرافیہ یعنی فوجی وسول بیوروکریسی، جاگیردار اور مذہبی قوتوں پر قائم ہو گئی۔ اس طرح ایوبی مارشل لاء ایک طرف مغربی قوتوں اور دوسری طرف پاکستان کے روایتی حکمران طبقات کی مدد سے طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

بھارت کے ساتھ کشمیر کے تنازع کے سبب ہمارے تعلقات شروع سے ہی خوشگوار نہیں رہے۔ کشمیر جو بھارت، پاکستان اور چین کے سنگم پر واقع ہے دونوں ممالک کے درمیان اختلافات کو روز بروز بڑھانے کا باعث بنا جبکہ بھارت اور چین کے مابین تنازع نے بھی پاکستان کو چین کے قریب ہونے کے مواقع فراہم کیے۔

لیکن یہ حقیقت کبھی نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ برِصغیر پاک وہند اس دوران ترقی پسند تحریکوں کا مرکز بنتا چلا جا رہا تھا۔ سری لنکا، مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) اور بھارت کے اندر، بنگال، بہار، آسام اور ناگالینڈ میں سوشلسٹ نظریات پر مبنی ملی ٹینٹ (جنگجو) تحریکیں اپنے عروج پر تھیں بلکہ بھارت کے اندر نکسل باڑی ایک مسلح تحریک کے طور پر ابھری۔ اس ماؤنواز سوشلسٹ تحریک نے بھارت کے بورژوا جمہوری نظام کو ایک

www.bhutto.org

بار ہلا کر رکھ دیا۔ اس طرح مغربی پاکستان میں ترقی پسند نظریات کی چنگاری سلگنے لگی لیکن ایوبی آمریت نے اسے دبائے رکھا بلکہ ان خطرات کے پیش نظر پاکستان میں نام نہاد بنیادی جمہوریت (Basic Democracy) کا نظام مسلط کر دیا گیا تا کہ پاکستان میں عوامی آواز کو ابھرنے ہی نہ دیا جائے اور کوشش کی کہ جمہوریت کو ایک نئے نام کے تحت لوگوں کو کنٹرولڈ ڈیموکریسی کی بھول بھلیوں میں مصروف رکھا جائے۔ امریکی فوجی، اقتصادی اور سیاسی امداد نے ایوب خان کی حکومت کو تقویت پہنچائی لیکن حقیقت میں یہ نظام اندر سے شدت کے ساتھ کھوکھلا تھا کیوں کہ سماجی تبدیلیاں جو دن بدن جنم لے رہی تھیں پاکستانی حکمران اور اس کے عالمی اتحادی انہیں دیکھنے کی استعداد سے یکسر عاری تھے لیکن ظاہری طور پر ایوب خان کی قیادت میں ایک طاقتور حکومت پاکستان کے عوام کو خوفزدہ رکھنے میں کامیاب نظر آ رہی تھی۔ ایوب خان کی حکومت میں نوجوان ذوالفقار علی بھٹو کا کردار ایک قوم پرست سیاستدان کے طور پر ابھرا جس نے عالمی سطح پر پاکستان کے کردار کو مضبوط کرنے اور اپنے عوام کی خوشحالی کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

پاکستان کی امریکہ نوازی کو اس وقت شدید دھچکا لگا جب پاکستان کے اندر سے اڑ کر سوویت یونین کی جاسوسی کرنے والے امریکی جاسوس طیارے U-2 کو سوویت یونین نے پکڑ کر پاکستان کی طرف سے امریکہ کو اپنے ہوائی اڈے استعمال کرنے کی سہولت کا راز افشا کر دیا۔ حکومت کے اس کردار نے پاکستان کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا لیکن یہ سہرا بھی ذوالفقار علی بھٹو کے سر ہے کہ انہوں نے سوویت یونین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کو دوستی پر لانے کی کوشش کی۔ اس طرح 1960ء کے آخری مہینوں میں سوویت یونین کے ساتھ تعلقات کی بہتری کے لیے کوششیں کارآمد ثابت ہوئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بحیثیت وزیر قدرتی وسائل سوویت یونین کا دورہ کر کے سوویت یونین سے 30 ملین امریکی ڈالر کی امداد حاصل کی۔ پاکستان نے تیل کی تلاش کے منصوبوں کے لیے یہ امداد سوویت یونین کو امریکی ڈالروں کے بجائے پاکستانی روپے میں واپس کرنی تھی۔ یہ ایک کامیاب معاہدہ بھی تھا اور ذوالفقار علی بھٹو کی صلاحیتوں کا عملی آغاز بھی۔ سوویت یونین کے دورے کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کی ملاقات سوویت راہنما خروشیف سے ہوئی۔ کریملن میں ذوالفقار علی بھٹو نے سپر طاقت کے اس راہنما سے ملاقات کی جو چند ماہ پہلے پاکستان سے امریکی جاسوس طیارے U-2 کے معاملے پر سخت ناراض تھا۔ یہ طیارہ ترکی کے ہوائی اڈے INCIRLIK سے پشاور کے بڈبیر کے ہوائی اڈے پر منتقل ہوا تھا اور اس کے پکڑے جانے کے بعد سوویت راہنما خروشیف نے دنیا بھر میں جس شدت کے ساتھ اپنی آواز کو بلند کیا تھا، اس نے پاکستانی حکمرانوں کو سخت خوفزدہ کر دیا تھا لیکن بھٹو سے ملاقات کے بعد پاک سوویت تعلقات میں جو

استحکام پیدا ہوا اس نے پاکستان اور بھٹو دونوں کے امیج کو مثبت انداز میں اجاگر کر دیا۔ سوویت یونین کے ساتھ تیل کی تلاش کے اس معاہدے کے خلاف کیبنٹ میں ذوالفقار علی بھٹو کو کافی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیبنٹ میں مغرب نواز وزیر خزانہ اور وزیر خارجہ نہیں چاہتے تھے کہ سوویت یونین کے ساتھ تعلقات استوار کیے جائیں لیکن نوجوان ذوالفقار علی بھٹو تمام مخالفتوں کے باوجود حقیقت پسندانہ پالیسی اپنانے اور اس پر عملدرآمد کرنے میں کامیاب ہوئے۔

1962ء میں ایوب خان نے پاکستان میں نئے آئین کا نفاذ کر کے پورے ملک سے مارشل لاء کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت (Basic Democracy) نافذ کی۔ درحقیقت یہ Guided Democracy یا Directed Democracy کا ایک نظام تھا جس پر ایوب خان کو آمرانہ اختیارات حاصل تھے۔ ایوب خان نے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کے سہارے کو استعمال کیا۔ مسلم لیگ کے اراکین کا ایک کنونشن بلایا گیا جس کی صدارت فیلڈ مارشل ایوب خان کے حصے میں آئی۔ اس طرح حکومتی ایوانوں سے کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھ کر ایک نئے دور کا آغاز کیا گیا۔ یہ جمہوریت، آمریت اور سیاست کی ایک پیوندکاری تھی جس میں عوام کی آواز بالواسطہ طور پر شامل کر کے ان کے حقوق پر شخصی اقتدار کو نام نہاد جمہوری رنگ دیا گیا۔

1964ء میں صدارتی انتخاب کے موقع پر پاکستان کی اپوزیشن جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہو گئیں۔ ایوب خان کو متحدہ اپوزیشن پارٹی (Combined Opposition Party) کی طرف سے مادرِ ملت فاطمہ جناح جیسی جرأت مند راہنما کا سامنا تھا۔ پاکستان کے بانی محمد علی جناح کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو طویل سیاسی تجربہ حاصل تھا جبکہ اقتدار کے ایوانوں پر قابض ایوب خان فقط حکومتی مشینری کی بنیاد پر پاکستان کی مقبول خاتون راہنما کا مقابلہ کر رہا تھا۔ سی او پی میں کونسل مسلم لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، عوامی لیگ، نظامِ اسلام پارٹی اور جماعتِ اسلامی شامل تھیں۔ ایک خاتون راہنما کا ایک فیوڈل اور پسماندہ سماج میں ایک فوجی ڈکٹیٹر کے سامنے عوامی حقوق کی بحالی کے لیے کھڑا ہو جانا خطے کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پاکستان کے عوام رجعت پسندانہ اور تنگ نظر خیالات کو مسترد کر کے ایک روشن خیال فیصلہ کر چکے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ خاتون کی قیادت (محترمہ فاطمہ جناح) کو جماعتِ اسلامی بھی ماننے پر مجبور تھی۔ یہ صرف عوام کی خواہش کے سبب ممکن ہوا۔ دراصل پاکستان کے عوام نے ڈکٹیٹر شپ کے خلاف جمہوریت کی بحالی کے لیے ایک خاتون کو اپنا قائد تسلیم کرتے ہوئے جدوجہد کا پرچم بلند کر کے ایک طرف اپنی روشن خیالی کا مظاہرہ کیا تھا اور دوسری جانب یہ ثابت کیا

www.bhutto.org

کہ آمریت کے شخصی اختیارات کے خلاف پاکستان کے عوام عورت اور مرد کی تخصیص کیے بغیر متحد ہیں اور وہ ہر صورت میں جمہوریت کے خواہاں ہیں۔ جنرل ایوب خان کے لیے یہ صورتحال نہایت پریشان کن تھی۔ اس طرح سی او پی کے پرچم تلے ایک خاتون قیادت نے ڈکٹیٹر شپ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ فاطمہ جناح نے ایوب خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ.

''اس ڈرل ماسٹر کو، اپنے آپ کو فیلڈ مارشل کہنے کا کوئی حق نہیں۔''

71 سالہ مادرِ ملت فاطمہ جناح نے ایوب آمریت کے خلاف کھڑے ہوکر پاکستان کی سیاست میں ایک ایسا شگاف ڈالا جس سے ایوبی آمریت کی شکست کا آغاز ہوا لیکن ٹوٹتے ہوئے نظام نے انتخابات میں دھاندلی کا سہارا لے کر اپنے آپ کو بچانے کی عارضی طور پر کامیاب کوشش کی اور اس طرح جنرل ایوب خان نے یہ ثابت کر دکھلایا کہ فوجی حکمرانوں کے نزدیک جہاں جمہوریت اور سیاست کی کوئی قدر نہیں ہوتی وہاں وہ اپنے وطن کے خالقوں اور عوام کو بھی دھونس اور دھاندلی کے تحت شکست دینے جیسے قبیح عمل سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ تاریخی طور پر عوام کو شکست دینے کے ایسے مصنوعی اقدامات عوامی فتح کو التوا میں تو ڈال سکتے ہیں مگر ختم نہیں کر سکتے۔ فاطمہ جناح کا جنرل ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑنے کا فیصلہ پاکستانی سیاست میں جمہوریت اور روشن خیالی کے ایسے بیج بو گیا جس کے پودے چند سالوں بعد نمودار ہوئے۔ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں 1962ء کے مسلط کردہ آئین اور نام نہاد بنیادی جمہوریت کے نظام کو بھی مسترد کیا گیا۔ اس انتخابی مہم نے پاکستانی عوام کی سیاسی تعلیم و تربیت کا بھی کام کیا جو کہ بعد میں ایوبی آمریت کے لیے تباہی کا باعث بنی۔

غریب ماں کا بیٹا

بھٹو قبیلہ ایک سپہ گر راجپوت قبیلہ ہے جو موجودہ بھارتی صوبہ ہریانہ کے دو قصبوں بھٹو اور بھٹو کلاں میں آباد تھا۔ یہ دونوں گاؤں ہریانہ کے ضلع سرسہ میں واقع ہیں۔ جنوری 1986ء میں دونوں گاؤں میں مشاہدے کے لیے وہاں جا کر میں نے متعدد لوگوں سے اس بات کی تصدیق کی کہ بھٹو یہیں سے ہجرت کر کے سندھ میں جا کر آباد ہوئے۔ آج سے تقریباً تین سو سال قبل سندھ میں بھٹو قبیلے کو تالپوروں کے دربار میں اسی لیے سپہ گری کی ذمہ داری سونپی گئی کہ یہ قبیلہ راجپوت تاریخ کے مطابق ایک عسکری قبیلہ تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہنواز بھٹو کا سندھ کی سیاست پر گہرا اثر و رسوخ تھا۔ سندھ میں مسلمان اور ہندو جاگیرداروں کے درمیان اقتدار کی کشمکش تقریباً ایک سو سال قبل ابھری جب انگریز نے تاریخی طور پر دم توڑتے جاگیردارانہ نظام و سماج کو دودھ پلا پلا کر نیا جنم دیا۔ انگریزوں نے ایک طرف تالپور خاندانوں کی جاگیروں کو بحال رکھا اور دوسری طرف بلوچ قبیلوں کو نئی جاگیریں قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ پرانے سندھی قبائل کے سرداروں کو بھی جاگیریں دیں اس لیے کہ وہ ان مراعات یافتہ مختلف جاگیردار خاندانوں کے ذریعے سندھ پر اپنا انتظامی کنٹرول کرنا چاہتے تھے۔ مسلم جاگیرداروں کی طرف سے ہندو جاگیرداروں کے خلاف سیاسی محاذ آرائی کے خلاف پہلا محاذ جو قائم ہوا اس کا نام سندھ محمڈن ایسوسی ایشن تھا۔ 1884ء میں حسن علی آفندی نے سندھ سبھا قائم کی۔ اس تنظیم میں باہمی اختلاف کے نتیجے میں 1885ء میں کانگریس معرضِ وجود میں آئی جبکہ 1917ء میں سندھ مسلم لیگ قائم ہوئی۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کی جدوجہد بھی سندھ کے جاگیرداروں کی طرف سے ایک سیاسی و سماجی کوشش تھی جس کے لیے سندھ کے مسلم جاگیرداروں نے بھرپور جدوجہد کی۔ اس میں سر شاہنواز بھٹو کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ 15 نومبر 1932ء کو سر شاہنواز بھٹو نے ایوب کھوڑو اور میران محمد شاہ کے ساتھ مل کر سندھ آزاد کانفرنس

www.bhutto.org

تشکیل دی۔ اس کے بعد 12 جنوری 1934ء کو شاہنواز بھٹو نے سندھ پیپلز پارٹی قائم کی جس کے صدر خود شاہنواز بھٹو بنے۔ اس پارٹی میں دوسرے اہم سندھی مسلمان راہنماؤں میں نواب نبی بخش بھٹو (ممتاز بھٹو کے والد)، اللہ بخش سومرو، میران محمد شاہ، حاتم علوی، جی ایم سید، سید غلام نبی شاہ اور حاجی مولا بخش سومرو وغیرہ بھی شامل تھے۔ شاہنواز بھٹو کو سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کروانے کے سبب سندھ کے اندر بے مثال شہرت ملی۔ ان کا یہ اقدام سندھ کے مسلمانوں کے لیے ایک سماجی فتح تھا جو ہندو مسلم کشمکش کے حوالے سے اپنی تاریخی اور سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔ بعد میں سندھ کی بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدگی پاکستان کے مطالبے کی ایک دلیل ثابت ہوئی۔

ذوالفقار علی بھٹو سندھ کے بااثر جاگیردار سیاستدان سر شاہنواز بھٹو کے گھر 5 جنوری 1928ء کو پیدا ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جاگیردار سیاستدان گھرانے میں پیدائش، تصویر کا ایک رخ ہے جیسا کہ خود ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء کے الیکشن جیتنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ''ہر کوئی مجھ سے یہ سوال کرتا ہے کہ آپ ایک ریڈیکل ترقی پسند منشور لے کر الیکشن جیتے ہیں۔ آپ کا باپ ایک بڑا جاگیردار تھا، آپ غریبوں کے مسائل کو قریب سے نہیں جانتے لہٰذا آپ غریبوں کے مسائل کیسے حل کر پائیں گے؟'' تو ذوالفقار علی بھٹو نے آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ کہا ''ہر کوئی میرے والد کا حوالہ دیتا ہے جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں ایک غریب ماں کا بھی بیٹا ہوں۔ میں جاگیردار سماج کے ظالمانہ کردار سے بخوبی آگاہ ہوں بلکہ میں خود جاگیردارانہ استحصال کا ایک وقت تک نشانہ بنتا رہا ہوں اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ استحصال زدہ طبقے کے مسائل اور حل کیا ہیں؟'' ذوالفقار علی بھٹو کی والدہ سندھ کے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ خورشید بیگم، شاہنواز بھٹو کی دوسری بیوی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی شخصیت پر اپنی ماں کی گہری چھاپ ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک عوامی لیڈر کے طور پر جانے گئے۔

کچھ عرصہ تک وہ پسماندہ گاؤں گڑھی خدا بخش بھٹو کی مسجد میں ہاریوں کے بچوں کے ساتھ زیرِ تعلیم رہے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کی عمر 9 سال کے قریب تھی تو ان کے والدین نے ان کو بمبئی منتقل کیا۔ تعلیم کا پہلا مرحلہ انہوں نے بمبئی کے کیتھڈرل ہائی سکول سے مکمل کیا جہاں ذوالفقار علی بھٹو کا امیر گھرانوں کے بچوں کے ساتھ تعلقات کا آغاز ہوا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو بمبئی گئے اس وقت وہ ایک دیہاتی شخصیت کے مالک تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بچپن کے دوست پیلو مودی نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا کہ ''ان کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ گھر میں ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی جاتی تھی اور میری ذلفی کی دوستی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے کپڑوں کے بارے میں، اٹھنے بیٹھنے اور شہری رسم و رواج اور آداب

www.bhutto.org

کے سلسلے میں بلا جھجک مشورے لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ذلفی اعلیٰ تعلیم کے دوران تک میرا ساتھی رہا اور میں اس کو خوب لتاڑا کرتا تھا لیکن وہ میرے حد سے زیادہ مذاق کو بھی خوشی سے برداشت کرتا تھا چونکہ ذلفی یہ سمجھتا تھا کہ میں (پیلو مودی) اس کا مخلص دوست ہوں لہٰذا وہ میرا خصوصی طور پر لحاظ کرتا تھا۔"

بمبئی میں دورانِ تعلیم ہی ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے بانی محمد علی جناح کے بھرپور مداح کے طور پر اپنے دوستوں میں جانے جاتے تھے۔ وہ کھل کر آزاد اور خودمختار پاکستان کے حامی تھے اور ذوالفقار علی بھٹو نظریاتی طور پر سوشلسٹ نظریات اختیار کر چکے تھے جس کا ذکر پیلو مودی نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ 1948ء میں ذوالفقار علی بھٹو امریکہ چلے گئے وہاں انہوں نے یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی آف کیلیفورنیا چلے گئے جہاں سے گریجوایشن کی۔ کیلیفورنیا برکلے سٹی میں ذوالفقار علی بھٹو نے طلباء کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ یہاں ذوالفقار علی بھٹو نے یونین کونسل کی سیٹ پر الیکشن لڑا جو وہ جیت گئے۔ یہ کسی ایشیائی کا پہلا اعزاز تھا کہ وہ برکلے سٹوڈنٹس یونین کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ برکلے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو آکسفورڈ چلے گئے جہاں انہوں نے کرائسٹ چرچ کالج سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ امریکہ اور برطانیہ میں حصولِ تعلیم کے دوران بھٹو مختلف بین الاقوامی موضوعات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ دورانِ تعلیم ہی انہوں نے فلسطینیوں کی حمایت میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں فلسطینیوں کے علیحدہ وطن کی بھرپور حمایت کی گئی تھی اور صیہونیت کی شدت کے ساتھ مخالفت، جس پر ذوالفقار علی بھٹو کو جنونی یہودیوں کی طرف سے دھمکی آمیز خطوط بھی ملے۔ ذوالفقار علی بھٹو جوانی میں جن سیاسی رجحانات کی طرف مائل ہو رہے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے وہ پھانسی کی کوٹھری میں اپنی کتاب "اگر مجھے قتل کر دیا گیا" If I Am Assassinated میں لکھتے ہیں:

"5 جنوری 1948ء کو میرے اکیسویں جنم دن پر مجھے لاس اینجلز (امریکہ) میں اپنے آبائی مقام لاڑکانہ سے بیش قیمت تحفے ملے۔ نپولین بوناپارٹ کی پانچ جلدوں پر مشتمل بیش قیمت سوانح عمری تھی جسے سلون نے قلمبند کیا تھا اور دوسرا ایک نہایت کم قیمت کتابچہ تھا، کارل مارکس کا کمیونسٹ مینی فیسٹو۔ نپولین سے میں نے اقتدار کی سیاست سیکھی اور اس کم قیمت کتابچے سے میں نے غربت کی سیاست کا درس حاصل کیا اور وہ کتابچہ ان سطروں پر ختم ہوتا ہے:

"دنیا بھر کے مزدورو! ایک ہو جاؤ، تم اپنی زنجیروں کے سوا کیا کھو سکتے ہو جبکہ جیتنے کے لیے تمہارے سامنے دنیا پڑی ہے۔"

پیلو مودی کے بقول ذلفی کا اصرار تھا کہ مغرب میں شفٹ ہونے سے پہلے ہی وہ سوشلسٹ

نظریات اپنا چکا تھا جس کی وجہ میرے صوبے (سندھ) میں پھیلی ہوئی غربت ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پروفیسر ہیرالڈ لاسکی کی تقاریر بھی سن چکے تھے بلکہ دورانِ تعلیم پروفیسر لاسکی کی متعدد کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جن میں سرفہرست "دی گریمر آف پالیٹکس" بھی شامل ہے۔ 1948ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ایک تقریر بعنوان "دی اسلامک ہیری ٹیج" کی جس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلم ممالک کے لیے سوشلزم ناگزیر ہے۔ لنکنز ان میں ذوالفقار علی بھٹو نے قانون کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد لا فیکلٹی آف ساؤتھ ہملٹن میں ان کو بین الاقوامی قانون کے لیکچرر کی ملازمت مل گئی جو کہ ایک بڑا علمی اعزاز تھا۔ اس دوران ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہنواز بھٹو بیماری کا شکار ہوئے جس کے سبب وہ لیکچرر شپ برقرار نہ رکھ سکے اور یوں وہ مزید تعلیمی سرگرمیوں کو ادھورا چھوڑ کر وطن لوٹ آئے حالانکہ اس دوران ان کو کنگس کالج کیمبرج میں داخلہ مل چکا تھا۔ نومبر 1953ء میں ذوالفقار علی بھٹو کراچی پہنچ گئے جہاں انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ کراچی میں ذوالفقار علی بھٹو نے وکالت کا آغاز رام چندانی جیسے معروف وکیل کے شاگرد کے طور پر کیا لیکن ان کی توجہ وکالت کے پیشے پر مرکوز نہ ہو سکی حالانکہ انہوں نے چیف جسٹس کانسٹنٹائن سے بھرپور داد حاصل کی اور چیف جسٹس نے پیشگوئی کی کہ آپ ایک قابل وکیل بنیں گے۔ لیکن بھٹو نے کہا کہ میں وکالت نہیں سیاست کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس طرح بھٹو نے قوم کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا اور دلچسپ بات دیکھیں کہ دورانِ وکالت ذوالفقار علی بھٹو کے پاس قتل کے جتنے بھی مقدمات آئے ان میں ذوالفقار علی بھٹو کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔ اس دوران ذوالفقار علی بھٹو نے کچھ عرصہ کے لیے سندھ مسلم لاء کالج میں بحیثیت استاد کے کانسٹی ٹیوشنل لاء بھی پڑھایا۔

www.bhutto.org

نئی خارجہ پالیسی کا معمار

ذوالفقار علی بھٹو اپنی ذہانت اور محنت کی بنیاد پر اقتدار کے ایوانوں میں روز بروز ایک اہم اور طاقتور حیثیت اختیار کرتے چلے گئے۔ قدرتی وسائل، صنعت وغیرہ کی وزارتوں کی ذمہ داری کے بعد ان کو اطلاعات و تعمیر نو، بجلی و آبپاشی کی اہم وزارتیں بھی سونپی گئیں۔ گو انہوں نے وزارتِ اطلاعات میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا لیکن ان ذمہ داریوں کے دوران ہی انہوں نے خارجہ امور پر اکثر اوقات اپنے مشوروں سے حکومت کو مستفید کرنا شروع کر دیا اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ نوجوان ذوالفقار علی بھٹو کو جنوری 1963ء میں وزیرِ خارجہ کی اہم ترین ذمہ داری سونپ دی گئی۔ 35 سال کی عمر میں وزارتِ خارجہ کا قلمدان یقیناً ایک چونکا دینے والی بات ہے۔ درحقیقت ذوالفقار علی بھٹو اپنی علمی ذہانت و مطالعے کے ساتھ ساتھ مشاہدے اور عمل کی بنیاد پر ایک میچور سیاستدان بن چکے تھے۔ جب بھٹو وزارتِ خارجہ کی کرسی پر فائز ہوئے تب تک دنیا کے کئی راہنماؤں کے ساتھ ان کے تعلقات استوار ہو چکے تھے جس سے پاکستان کے قومی مفادات کو ایک عرصے سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جنوری 1963ء سے 8 جولائی 1966ء تک بحیثیت وزیرِ خارجہ پاکستان کام کیا لیکن یہ ضروری ہے کہ ان کو وزارتِ خارجہ کی ذمہ داری سونپے جانے سے پہلے پاکستان کے عالمی کردار کا ہلکا سا جائزہ لیا جائے۔

عوامی جمہوریہ چین کا قیام عالمی سیاست میں ایک بڑا موڑ ہے۔ چین کے غیور عوام نے چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں چیانگ کائی شیک کی فوجوں کو شکست دے کر ایک نئے کیمونسٹ انقلاب کو کامیاب کیا تھا جس کے سبب عالمی سامراجی طاقتیں پریشانی کی حالت میں مبتلا تھیں اور یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ یکم اکتوبر 1949ء کو عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے بعد 4 جنوری 1950ء کو عوامی جمہوریہ چین کی مرکزی حکومت کو تسلیم کر کے پاکستان، چین کو تسلیم کرنے والے اولین ملکوں (برما،

بھارت) میں شامل ہو گیا لیکن پاکستان کی ماضی قریب کی تمام حکومتیں شروع سے ہی غیر ضروری طور پر مغرب اور خصوصاً امریکہ کی طرف جھکاؤ کرنے میں بے چین اور پیش پیش تھیں اور اس بے چینی کی ابتداء لیاقت علی خان کے زمانے سے ہوئی ہے اور ہماری قومی ناکامی کا یہ مشہور اقدام کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورۂ تہران کے دوران 2 جون 1949ء کو تہران میں سوویت یونین کے ناظم الامور نے پاکستانی سفیر متعینہ تہران کے ذریعے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو سوویت یونین کے دورے کی دعوت دی۔ یہ خوشگوار ابتداء تھی جسے قبول کر کے خوب چرچا کیا گیا۔ روس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ لیاقت علی خان کے دورۂ ماسکو سے پہلے دونوں ممالک کے سفیروں کا تبادلہ بھی ہو جائے۔ دعوت کو قبول کرنے کے بعد یکا یک مجوزہ دورے کو نہ صرف منسوخ کر دیا گیا بلکہ مزاح کی حد تک یہ جواب دیا گیا کہ ''عملے کی قلت'' کے سبب سفیروں کا تبادلہ ممکن نہیں۔ دورۂ ماسکو کی دعوت کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ 3 جون 1949ء کو امریکی محکمۂ خارجہ نے برطانوی سفیر کو اطلاع دی کہ 75 ایم ایم گولہ بارود کے 2 لاکھ راؤنڈ فوری طور پر پاکستان کو منتقل کر دیئے جائیں۔ امریکہ نے یہ فیصلہ سی آئی اے کی سبک رفتار اطلاع پر کیا تھا اور پھر اس کے بعد امریکیوں نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو واشنگٹن کے دورے کی دعوت دی جو فوری طور پر قبول کر لی گئی۔ اپریل 1950ء میں روسی دورے کی دعوت باقاعدہ طور پر داخلِ دفتر کر دی گئی۔

وہ پاکستان جو چین کو تسلیم کرنے والے پہلے تین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے اس کے حکمرانوں کی تضاداتی خارجہ پالیسی ملاحظہ ہو۔ ایک وقت ایسا آیا کہ پاکستان عوامی جمہوریہ چین کی اقوام متحدہ میں نمائندگی کے خلاف مسلسل ووٹ ڈالتا رہا۔ حیرت ہے کہ 1956ء میں پاکستان کے ایک وزیر اعظم چین کا دورہ کر رہے تھے تو پاکستان عوامی جمہوریہ چین کے نمائندوں کو اقوامِ متحدہ سے باہر رکھنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ یہ پالیسی نہ صرف متذبذب خارجہ پالیسی کے رجحان کو واضح کرتی ہے بلکہ غیر سنجیدہ اور سامراجی چاپلوسی پر مبنی رویے کی غماز بھی ہے۔ اسی طرح نہر سویز کے بحران پر پاکستان کا کردار بھی شرمناک حد تک سامراج کے تحت نظر آتا ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی تضادات کا شکار رہی بلکہ کسی حد تک پاکستانی خارجہ پالیسی اپنے قدرتی اتحادیوں سے مکمل مختلف راستوں پر استوار تھی اور یوں پاکستان کے عسکری، اقتصادی اور عالمی سیاسی مفادات کی تکمیل بھی نہ ہو سکی۔ یہ ایک گومگو کی کیفیت تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا بھر میں نیشنلزم کی بنیاد پر کئی اقوام امپیریلزم سے آزادی حاصل کر کے تعمیرِ نو میں مصروف تھیں جبکہ عالمی سیاست پر ایک نئی اور غیر جانبدار آواز بھی بلند ہو چکی تھی۔ غیر وابستہ ممالک کی تحریک کی شکل میں

www.bhutto.org

جواہر لعل نہرو، مارشل ٹیٹو، احمد سوئیکارنو اور نکرومہ سرد جنگ کے درمیان سے ایک نئے راستے کا تعین کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے جبکہ پاکستان معاہدات کے مرض کا شکار ہو چکا تھا اور روز نئے سے نئے معاہدے جنم لے رہے تھے لیکن جہاں تک قومی مفادات کا تعلق تھا وہ ہوا میں معلق تھے۔ اسی لیے 1962ء میں ڈاکٹر ہنری کسنجر نے برصغیر کا دورہ کرتے ہوئے یہ مشاہدہ کر لیا تھا کہ ''پاکستان معاہدات کے مرض میں مبتلا ہے۔'' درحقیقت ہم جمود اور یک رخی خارجہ پالیسی پر گامزن تھے۔ ان حالات میں نوجوان ذوالفقار علی بھٹو کی بحیثیت وزیرِ خارجہ نامزدگی ہوا کا ایک تازہ جھونکا ثابت ہوئی۔

ستمبر 1957ء میں نوجوان ذوالفقار علی بھٹو نے اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم پر ''امنِ عالم اور جارحیت'' کے موضوع پر مدلل، معلوماتی اور پرجوش تقریر کر کے عالمی مسائل اور تعلقات کے حوالے سے یکدم شہرت حاصل کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ قدرت نے اس انسان کو کسی بڑے کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ اب بحیثیت وزیرِ خارجہ ان کو اپنے جوہر کھل کر دکھانے کے مواقع فراہم ہو گئے تھے۔ پاکستان کی یک رخی خارجہ پالیسی کو انہوں نے قومی مفادات اور عالمی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا آغاز کر کے جہاں پاکستان کے سیاسی، اقتصادی، عالمی اور علاقائی مفادات حاصل کرنے کا آغاز کیا وہاں انہوں نے دنیا بھر میں ابھرتے ہوئے نئے سیاسی رجحانات کو اپنے ملک کے اندر متعارف کروا کر پاکستانی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اب پاکستان خارجہ پالیسی کے حوالے سے نئے دوستوں کی تلاش میں عملی طور پر کامیابی کی جانب چل پڑا۔ 2 مارچ 1963ء کو وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے چین کے وزیرِ خارجہ چن یی کے ساتھ پاک چین سرحدی معاہدہ کر کے چین کے ساتھ نئے تعلقات کا آغاز کیا۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ پاکستان کو امریکہ چین تعلقات کے درمیان ایک پل قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ 1971ء میں ڈاکٹر ہنری کسنجر پاکستان سے ہی خفیہ طور پر پیکنگ کے دورے پر روانہ ہوئے جہاں سے امریکہ چین تعلقات کا آغاز ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس ابھرتی ہوئی حقیقت کو 66-1965ء میں ہی بھانپ لیا تھا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے انقرہ میں اپنے قیام کے دوران امریکی صدر جانسن سے ان کے وزیرِ خارجہ Dean Rusk کے ذریعے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ''اگر آپ چاہیں تو ہم امریکہ اور چین کے درمیان تعلقات کی بنیادیں فراہم کرنے کے لیے ایک پل کا کردار ادا کر سکتے ہیں''۔ مگر جب وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے صدر ایوب کو اپنی اس رائے سے آگاہ کیا تو صدر ایوب نے اس دوراندیشی کا یہ جواب دیا کہ:

"We should not burn our fingers."

www.bhutto.org

لیکن وقت نے ثابت کیا کہ ذہین وزیرِ خارجہ نے تبدیل ہوتی ہوئی عالمی صورتحال پر جو تجویز پیش کی تھی وہ بعدازاں ایک عالمی حقیقت بن کر ابھری۔

ذوالفقار علی بھٹو نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے مصر، انڈونیشیا، سوویت یونین، مشرقی یورپ، چین، ایران، ترکی اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے ساتھ تعلقات کو خصوصی نئی بنیادوں پر استوار کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو دوطرفہ پالیسی (Bilateralism) کے تحت خارجہ پالیسی چلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس دوران بھارت کے ساتھ مسئلۂ کشمیر کے تنازعے پر متعدد مذاکرات، ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات کا نیا دور کھلا۔ پاکستان عالمی سطح پر نئے دوست بنانے کے نتیجے میں اخلاقی اور سیاسی طور پر مضبوط مؤقف اور آواز اٹھانے میں کامیاب ہوا۔ اب بھارت کے عالمی تعلقات کے مقابلے میں پاکستان بھی اعتماد کے ساتھ کھڑا ہونے کی پوزیشن میں آیا۔ پاکستان کی پروقار، قوم پرست خارجہ پالیسی پاکستان کے لیے ایک اعتماد کے ساتھ معرضِ وجود میں آئی جس سے پاکستان کے عالمی سطح پر وقار میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ ہماری خارجہ پالیسی کا ایک نیا دور تھا جس میں ہم نے افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف آزادی کی تحریکوں کی حمایت کی پالیسی اپنا کر اپنے آپ کو آزادی کی تحریکوں کے ساتھ جوڑا۔

بحیثیت وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ایوب حکومت میں اپنی سیاسی ساکھ کو ایک لحاظ سے انتہا تک لے گئے۔ وہ صدرِ مملکت ایوب خان کے بعد اہم ترین سیاسی شخصیت کا مقام پا گئے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو پاک چین دوستی کے بانی جانے جاتے ہیں۔ ان کے اس کردار کے سبب عالمی سطح پر ان کو ایک ذہین، دوراندیش، حقیقت پسند، عالمی اور علاقائی مسائل کا ماہر اور تاریخ کا شعور رکھنے والا سفارتکار بھی پہچانا جانے لگا جس کی وجہ سے ان کے متعدد عالمی راہنماؤں سے ذاتی تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ اسلامی دنیا کو ایک تہذیب کے طور پر منظم کرنے کا تخیل انہوں نے اپنے دورِ وزارتِ خارجہ کے دوران ہی پیش کیا۔ اسلامی کانفرنس تنظیم او آئی سی کے پلیٹ فارم پر مسلم ممالک کو اکٹھا کر کے استعماری اقتصادی نظام اور تسلط کے خاتمے کے لیے ان کی کوششیں ایک طویل حکمتِ عملی تھی۔ 19 اپریل 1966ء کو سعودی عرب کے شاہ فیصل کی پاکستان آمد کے موقع پر وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ:

"Pakistan agreed in principle to the idea of an Islamic Summit. But the practical application of the principle would have to be considered in great depth-

www.bhutto.org

1966ء کے اوائل میں ذوالفقار علی بھٹو نے دوراندیش تصور کے ساتھ مسلم اقوام کو عالمی تناظر میں نئے کردار کے لیے متحد کرنے کی کوششیں کر کے دنیا کی ایک بڑی تہذیب (اسلامی ممالک) کو اس کی حقیقت اور وجود سے آگاہ کیا اور یہ باور کروایا کہ وہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں سکڑتے ہوئے نوآبادیاتی اور ابھرتے ہوئے Neo-Colonialism کے بیچ ایک اعلیٰ مقام اور کردار ادا کر سکتے ہیں۔

6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے مغربی پاکستان کے خلاف ایک توسیع پسندانہ اور جارحانہ حملہ کر کے پاکستان کی سرحدوں کے اندر راتوں رات پیش قدمی کر کے یقیناً ایک کھلی جارحیت کا ارتکاب کیا۔ بھارتی افواج نے مغربی پاکستان کے تاریخی شہر لاہور کے قریب اپنی فوجوں کو داخل کر کے پاکستان کی سلامتی اور دفاع کو کھلا چیلنج کر دیا۔ بھارت کا مؤقف تھا کہ پاکستان مقبوضہ کشمیر میں نام نہاد آپریشن جبرالٹر کے تحت پاکستانی گوریلوں کے ذریعے گوریلا مداخلت کر رہا ہے۔ 1965ء کی جنگ میں بھارت پاکستان کی سرحدوں کو تو عبور کر گیا لیکن عالمی سیاست اور ڈپلومیسی میں پاکستان کے پروقار مقام کے سامنے ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ بھارتی جارحیت کی تمام اسلامی مملکتوں بشمول ایران، مصر، ترکی اور انڈونیشیا نے کھل کر مذمت کی۔ اس دوران جمہوریہ چین نے ڈپلومیسی کے میدان میں جس طرح پاکستان کے ساتھ دوستی نبھانے کا اعلان کیا اس نے ہندوستان کو عالمی پلیٹ فارمز پر بے بس ثابت کر دیا۔ یہ جنگ دراصل پاکستانی خارجہ پالیسی کا ایک امتحان ثابت ہوئی۔ جنگ کے دوران "ہمارا اتحادی" امریکہ ہماری مدد کو نہ آیا۔ امریکہ کے ساتھ کیے گئے معاہدات 1965ء کی جنگ میں حرکت میں نہ آئے بلکہ امریکہ نے دورانِ جنگ پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی اور فاضل پرزوں کی سپلائی پر بھی پابندی عائد کر دی۔ اس طرح پاکستان کی امریکہ کی طرف جھکاؤ کی خارجہ پالیسی بے سود ثابت ہوئی۔ ایسے میں پاکستان کے دفاع، سلامتی اور عالمی فورمز پر انڈونیشیا، چین، ترکی اور ایران نے جس قدر پاکستان کی حمایت کی، اس نے پاکستان پر بھارتی جارحیت کے خلاف ایک ڈھال کا کام کیا۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستان کے آزادی پسند عوام نے اپنی مسلح افواج کے پیچھے کھڑے ہو کر جس قوم پرستی کا ثبوت دیا اس نے دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا حالانکہ بھارتی فوجی افسران بھارتی فوج کی لاہور کی طرف پیش قدمی کے کامیاب امکانات کے سبب اس خواہش کا اظہار کر چکے تھے کہ ہم جشنِ فتح لاہور کے جم خانہ کلب میں منائیں گے لیکن عوام لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور دیگر ہتھیار اٹھا کر لاہور کی سرحدی نہر بی آر بی کی طرف ٹولیوں کی شکل میں آگے بڑھے تو حکومت کو اعلان

www.bhutto.org

کرنا پڑا کہ وطن پرست شہری مسلح افواج کی پشت پر رہ کر جس قدر دفاعی جنگ میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں وہ کم نہیں۔ حقیقت میں 1965ء کی جنگ کے دوران عوام میں قوم پرستی کا جذبہ دیکھنے کو ملا وہ اس بات کا اظہار تھا کہ پاکستان کے عوام آزادی پسند اور اپنی بقا کی جنگ لڑنا جانتے ہیں۔ 1965ء کی جنگ نے پاکستان کے عوام میں ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور اس جنگ کے دوران پاکستان کی خارجہ پالیسی نے جس طرح پاکستانی مؤقف کو موثر طور پر پیش کیا اس کے سبب وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت ایک مقبول اور عوامی شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی جن کی ذاتی کوششوں اور دوراندیشی کے سبب ایک جدید خارجہ پالیسی وجود میں آئی۔ یہاں سے ذوالفقار علی بھٹو نے سیاست کے اہم مرحلے میں قدم رکھا اور وہ پاکستان کی مقبول اور ذہین ترین شخصیت کے علاوہ آزادی پسند سیاستدان کے طور پر بھی نمایاں ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بھارت کے استعماری رجحان کے خلاف جس شعور کا اظہار کیا وہ ایک نئی سیاسی اپروچ تھی۔ بھارت کے توسیع پسند رویئے کے خلاف ذوالفقار علی بھٹو کا موقف پاکستانی قوم کے اندر بیداری کی ایک نئی تحریک کا سبب بنا۔ اس جنگ کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کے انداز نے ان کو ایک نیشنلسٹ لیڈر کے طور پر بھی متعارف کرایا۔

www.bhutto.org

جنگِ 1965ء اور ذوالفقار علی بھٹو

برِ صغیر میں انگریز کی آمد کے بعد جنم لینے والی نسلوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مذہبی تعصب کا ابھار روز بروز بڑھتا رہا جو آخرِ کار مسلمانوں کے علیحدہ وطن پاکستان کی شکل میں اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد بھی یہ نفرت بدستور بڑھتی رہی۔ ہندوؤں کو اپنی قدامت کا اور مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ پر فخر رہا۔

14 اگست 1947ء کو کھینچی جانے والی باؤنڈری لائن بھی کدورتوں کو کم نہ کر سکی اور اس کے ساتھ ہی کشمیر کے بارے میں بھارت کا توسیع پسندانہ اور غاصبانہ رویہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ کشمیر پر ہندوستان کا غاصبانہ قبضہ سیاسی، جغرافیائی اور تاریخی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ عظیم بھارت کو اس وقت تک نامکمل تصور کرتا ہے جب تک تمام علاقوں پر بھارت کا ترنگا نہ لہرا دیا جائے۔ جوناگڑھ اور حیدرآباد جنہوں نے تقسیم کے فارمولے کے تحت پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا ان پر بھارتی قبضہ اور کشمیر پر ناجائز تسلط بھارتی توسیع پسندی یا استعماریت پسند مزاج کا کھلا ثبوت ہے۔ 1947ء کے فوراً بعد آزادی پسند، حریت پسند کشمیریوں نے آزادی کا عملی آغاز کر کے اپنے حق کی حقیقت کو تسلیم کروایا اور یوں موجودہ آزاد کشمیر کا مختصر علاقہ بھارتی تسلط سے آزاد ہوا۔ آزادیٔ پاکستان کے بعد کشمیر کے مؤقف کو ایک قوم پرست انداز میں بلند کرنے کی کسی کو جرأت ہی نہ ہوئی۔ شروع میں پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں نے اپنے مغربی آقاؤں کے خوف سے کشمیر کے کاز کو جس طرح دبائے رکھا اس نے کشمیری جدوجہد کو سبوتاژ کیا لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے بحیثیت وزیرِ خارجہ پاکستان جس طرح پاکستان کو آزادی پسند تحریکوں کو تیسری دنیا کے نو آزاد ممالک کے ساتھ وابستہ کر کے پاکستان کے مؤقف کو جس انداز میں پیش کیا اس نے کشمیر کے کاز کو زندہ بھی کیا اور بھارتی خارجہ پالیسی کو سفارتی سطح پر شکست بھی دی۔ کشمیر کے مسئلے پر وزیرِ خارجہ

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو نے تاریخ کے شعور کے تحت پاکستان کی آواز بلند کر کے عالمی رائے عامہ کو بیدار کر ڈالا جس سے کشمیر اور پاکستان کے اندر کشمیر کی آزادی کا نعرہ مزید زوردار آواز میں لگایا جانے لگا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بھارتی مؤقف اور اس کی طرف سے پیش کی جانے والی نام نہاد تاریخی تاویلوں کو یکسر غلط ثابت کر دکھایا اور یوں پاکستان کو ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں کامیاب وکیل دستیاب ہوا۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ، برِصغیر کے دونوں ممالک پاکستان اور ہندوستان کی فوجی و سفارتی طاقت کا ایک مظاہرہ بھی تھا۔ بھارت خطے کا بڑا ملک ہے۔ بھارت کے پالیسی سازوں کو اپنی قوت اور عالمی سیاست میں اپنی افضلیت پر بڑا ناز تھا۔ سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اس کے تعلقات ایک توازن کے ساتھ استوار تھے۔ بھارت نے پاکستان پر اچانک حملہ کر کے جن فوجی مقاصد کی تکمیل چاہی وہ ہماری قوم کے دلیرانہ کردار کے سبب ممکن نہ ہو سکی۔ 17 دن کی یہ جنگ بھارتی پالیسی سازوں کے لیے غیر متوقع طور پر پاکستان کے شکست خوردہ ہونے کا سبب نہ بن سکی۔ درحقیقت پاکستان نے ڈپلومیسی کے میدان میں بھی جنگ جیتی۔ انڈونیشیا، ایران، الجزائر، ترکی، مصر اور عوامی جمہوریہ چین نے جس انداز میں پاکستان کے مؤقف کی حمایت کی اور بھارتی حملے کی مذمت کی اس نے پاکستان کے عوام کو ایک نیا حوصلہ اور بھارتی پالیسی سازوں کو شرمندگی کے سوا کچھ نہ دیا۔ پاکستان پر بھارتی حملہ کے ایک دن بعد عوامی جمہوریہ چین کی حکومت نے ایک بیان جاری کیا کہ:

''بھارتی توسیع پسندی فوراً بند کی جائے اور اس کو اس مجرمانہ توسیع پسندی کی قیمت دینی پڑے گی۔''

9 ستمبر کو چواین لائی نے بیان دیا کہ ''بھارت کا حملہ ایشیا کے اس خطے کے امن کے لیے خطرہ ہے اور چین اس صورتحال سے گہرے طور پر وابستہ ہو کر نئی تبدیلیوں کو دیکھ رہا ہے۔''

بلکہ عوامی جمہوریہ چین نے بھارت کو سیاسی انداز میں ایک اور جنگ کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ بھارت جو 1962ء سے چین کے ساتھ جنگ میں ہونے والی رسوائی کو ابھی تک نہ بھول پایا تھا اس صورتحال پر سخت پریشان ہوا۔ چین نے پاک بھارت جنگ کے دوران کہا کہ:

''ہندوستان نے چین کی سرحد کے ساتھ جو فوجی چوکیاں بنائی ہیں وہ چین کے لیے خطرے کا باعث ہیں اور اگر ہندوستان نے فوری طور پر وہ چوکیاں مسمار نہ کیں تو نتائج کا ذمہ دار ہندوستان ہوگا'' اور یہ کہ بھارتی، چین کی سرحد سے چینی باشندوں اور بھیڑ بکریوں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں، ان کو

www.bhutto.org

فوری واپس کیا جائے۔

یہ پاکستان کی نئی خارجہ پالیسی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان، چین جیسے اہم ملک کی بھرپور حمایت لینے میں کامیاب ہوا جس کے سبب ہماری سرحدوں پر بھارتی حملہ آوروں اور عالمی فورمز پر بھارتی سفارتکاروں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ساتھ امریکہ جس کے ساتھ ہمارے "خصوصی تعلقات" کی بنیاد اوائل آزادی میں پڑ گئی تھی اس کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ حالانکہ 11 جنوری 1955ء کو کراچی میں امریکہ کے ساتھ ہمارا ایک دفاعی معاہدہ ہوا تھا جس کو "Defense Support Assistance Agreement" کا نام دیا گیا تھا۔ اس معاہدے کے تحت امریکہ نے پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے فوجی ساز وسامان اور عسکری ٹیکنالوجی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی طرح 5 اپریل 1955ء کو انقرہ میں امریکہ کے ساتھ پاکستان کا ایک اور معاہدہ "Bilateral Cooperation Agreement" کیا گیا تھا جس میں یہ شق شامل تھی کہ امریکہ پاکستان پر غیر ملکی حملے کی شکل میں پاکستان کی بھرپور حمایت کرے گا خواہ حملہ بھارت کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس معاہدے کے ٹھیک دس دن بعد 15 اپریل 1955ء کو ایک مزید نوٹ کے تحت امریکہ پاکستان پر غیر ملکی حملے کی صورت میں مؤثر اور ضروری امداد کا بھی پابند ہوا۔ امریکہ مختلف اوقات میں پاکستان کے دفاع اور دوستی کا یقین دلواتا رہا بلکہ 5 نومبر 1962ء کو امریکہ نے اپنے گذشتہ معاہدات کو دہراتے ہوئے ان پر پابندی کا ایک بار پھر یقین دلوایا اور یہ بھی کہا کہ پاکستان پر غیر ملکی حملے کی صورت میں امریکہ پاکستان کی مکمل امداد جاری رکھے گا۔ ان معاہدات کے علاوہ پاکستان امریکہ کے عسکری معاہدات SEATO اور CENTO سے بھی شروع دن سے وابستہ تھا لیکن یہ تمام معاہدات پاکستان بھارت جنگ میں قابلِ عمل نہ ہو سکے۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے جنگ کے دوران پاکستان کو اسلحہ اور فاضل پرزوں کی ترسیل پر پابندی لگا دی۔ پاکستان نے بار بار امریکہ کے ساتھ کیے گئے معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے یاد دہانی کرائی کہ امریکہ اس جنگ میں اپنا اثر ورسوخ اور کردار ادا کرے لیکن وائٹ ہاؤس نے اس جنگ میں عدم مداخلت کا اعلان فرما دیا جبکہ جدید خارجہ پالیسی کا معمار ذوالفقار علی بھٹو اپنے فیصلہ کن کردار کو منوانے میں کامیاب ہو گیا جس کی ذاتی کوششوں کے سبب پاکستان ایک حقیقت پسندانہ صورتحال کو عالمی فورمز پر لانے میں کامیاب ہوا۔ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اسمبلی میں امریکی امداد کی بندش پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہمیں ایسی اقتصادی امداد کی کوئی ضرورت نہیں جو ہمیں قومی مفادات سے بے خبر کردے اور

ہماری خود مختارانہ حیثیت کے لیے چیلنج بن جائے۔ اس سلسلے میں دنیا کی امیر قوموں کا رویہ افسوسناک ہے اور وہ ترقی پذیر ممالک کی امداد کے نام پر اپنے سیاسی مفادات کو پورا کرتی ہیں۔ یہ بھی غریب قوموں کے استحصال کی ایک بدترین شکل ہے۔"

ذوالفقار علی بھٹو نے امریکہ اور مغرب کے عالمی کردار پر مزید کہا کہ:

"دنیا امیر اور غریب قوموں میں تقسیم ہو چکی ہے اور غربت کے خاتمہ کے لیے غریب قوموں کا اتحاد بہت ضروری ہے۔" اس ساری جنگ میں پاکستان کی جو شخصیت قومی اور عالمی ذرائع ابلاغ میں Focus ہوئی وہ وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو تھے۔

اقوامِ متحدہ اور سلامتی کونسل جیسے ادارے حقیقت میں عالمی سرمایہ داری نظام اور سامراج کے مفادات کے تحفظ کے لیے سیاسی ہتھیار ہیں۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی ان اداروں نے مغرب کے مفادات کو سرِ فہرست رکھا۔ انڈونیشیا کے احمد سوئیکارنو نے اقوامِ متحدہ کے اداروں کے عالمی سامراجی کردار کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ ترقی پذیر ممالک ایک آزاد اور خود مختار اقوامِ متحدہ کا ادارہ تشکیل دیں جبکہ پاکستان میں امریکہ کے مفادات کے نگران پالیسی سازوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو اس منظرنامے سے ہٹا دیا جائے اور سلامتی کونسل میں وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی جگہ کوئی ان کی پسند اور مرضی کا شخص پاکستان کی نمائندگی کرے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے وزیرِ قانون ایس ایم ظفر کو باقاعدہ امریکہ روانہ کر دیا لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہونے پائی۔ بھارت غیر مشروط طور پر جنگ بند کرنے پر متفق ہو گیا اور سلامتی کونسل میں ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی زندگی کی تاریخ ساز تقریر کر کے پاکستان کے عوام سمیت دنیا بھر کی نظریں اپنی طرف مرکوز کر لیں۔ بھٹو کی یہ تقریر ان کے مستقبل کے لیے ایک نیا مرحلہ ثابت ہوئی جہاں سے پاکستان کا وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو عالمی سطح پر سامراج دشمن کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

22 ستمبر 1965ء کو سلامتی کونسل میں وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے خطاب میں کہا:

"جنابِ صدر! اتنی رات گئے سلامتی کونسل کا اجلاس منعقد کرنے پر میں آپ کا اور تمام ارکان کا شکر گزار ہوں۔ یہ اجلاس جس مسئلے پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا ہے نہ صرف پاکستانی عوام کے لیے بلکہ برِ صغیر پاک و ہند، پورے ایشیا اور پوری دنیا کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور آپ نے اس مسئلے کے پیشِ نظر آدھی رات کو اجلاس طلب کر کے ہمارے ساتھ جس ہمدردی کا مظاہرہ کیا ہے اس کے لیے

www.bhutto.org

میں خلوصِ دل سے آپ اور سب ارکان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کونسل کے مستقل ارکان کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے رات کے اس حصے میں اجلاس میں شرکت کے لیے تکلیف گوارا کی۔ میں آپ سے گزارشات کرنے کے لیے پاکستان سے یہاں حاضر ہوا ہوں اور میں نے یہ اجلاس بلانے کی درخواست کی تھی۔ اس وقت ہم ایک انتہائی نازک ترین مسئلے سے دوچار ہیں جس پر غور کرنا اشد ضروری ہے۔ میں سیکرٹری جنرل کا ممنون ہوں جو پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک بامقصد سمجھوتہ کرانے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ان کی تمام مساعی سے آگاہ ہیں اور اس کے لیے ان کے اور سلامتی کونسل کے شکرگزار ہیں جنہوں نے اس معاملے میں ہمدردی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ انہوں نے ایک ایسی جنگ میں ہم سے ہمدردی اور لگاؤ کا اظہار کیا ہے جو ہماری مرضی کے بغیر ایک عیار حملہ آور نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہم پر مسلط کی ہے۔

پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے۔ آپ ذرا دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اس نقشے میں ہمارا وجود کتنا ہے اور نقشے ہی سے آپ ہمارے وسائل اور ایک بڑے حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے ہماری قوت کا بھی آسانی سے اندازہ لگا سکیں گے۔

ہمیں ایک بڑے عفریت کا سامنا ہے۔ ایک ایسے جارح ملک کا جو بار بار جارحیت کا ارتکاب کرتا رہا ہے۔ ہم نے آزادی کے بعد سے اب تک 17 سال بھارت کی جارحانہ کارروائیوں کا سامنا کیا ہے۔ اس نے جوناگڑھ پر قبضہ کر لیا، ماناور اور مانگرول کو طاقت کے ذریعے ہڑپ کر لیا۔ اس نے حیدرآباد پر فوج کشی کر کے اس ریاست کو ہتھیا لیا اور یہ گوا پر فوجی طاقت سے غاصبانہ قبضہ کر چکا ہے۔ اس نے اپنے جارحانہ عزائم کے ذریعے ایسے حالات پیدا کیے جن میں چین اور بھارت کی فوجوں میں تصادم ہو گیا اور اب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں بھارتی لیڈر پاکستان کو اپنا اولین دشمن قرار دیتے ہیں۔

جنابِ والا! پاکستان ایک ایسا ملک ہے جسے بھارت کی ہر پالیسی کا پہلا اور بنیادی ہدف سمجھنا چاہیے۔ 17 سال سے ہم دیکھ رہے ہیں اور اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ بھارت پاکستان کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ آپ اس بات سے باخبر ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ برِصغیر کی دو قوموں ہندو اور مسلمان کے درمیان آئے دن کے تنازعات اور بدامنی کو ختم کیا جائے۔ سات سو سال تک برِصغیر میں ان دونوں قوموں کی کشمکش جاری رہی اور ہم ہندو قوم کے ساتھ جو اکثریت میں تھی امن کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے رہے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس

دائمی کشمکش کا حل اور برِصغیر میں قیامِ امن کا راستہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے لیے ایک الگ وطن حاصل کر لیں خواہ وہ رقبے اور وسائل میں چھوٹا ہو لیکن اس قابل ہو کہ امن کے ساتھ زندہ رہ سکیں اور ایک بڑے پڑوسی ملک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھ سکیں۔ برِصغیر میں قیامِ امن کی یہ خواہش ہی قیامِ پاکستان کا بنیادی اصول اور محرک تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یورپ میں بھی کئی اقوام کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ اور قریبی تعلقات قائم رکھنے کے لیے اس قسم کی تقسیم اور علیحدگی اختیار کرنا پڑی ہے۔ مثال کے طور پر اسی مقصد کے لیے ناروے اور سویڈن نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کی۔ ہمیں یقین تھا مسلمانوں کا علیحدہ وطن پاکستان قائم ہو جانے کے بعد برِصغیر میں امن قائم ہو جائے گا اور پاکستان اور بھارت کے عوام دوستی کے ساتھ اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں گے۔

جنابِ والا! ہمارا یہ پاکستان بہت چھوٹا سا ملک ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہمارے وسائل بھی بہت محدود ہیں۔ آپ اگر دنیا کے نقشے پر اور پھر برِصغیر کے نقشے پر نظر ڈالیں تو خود بخود یہ بات آپ پر واضح ہو جائے گی کہ پاکستان نہ تو جنگ کا خواہشمند ہو سکتا ہے اور نہ اس کی طاقت رکھتا ہے لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم پر حملہ کیا جائے اور ہمیں جارحیت کا نشانہ بنایا جائے۔ ہم جھگڑے سے بچنا چاہتے ہیں۔ ہم امن چاہتے ہیں کہ ہم اپنے عوام کی ترقی کے لیے کچھ کام کر سکیں۔ آج کی دنیا میں ہر علاقے اور ہر ملک کے عوام کچھ توقعات رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ عوام کی ان توقعات کو پورا کر سکیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی تمام صلاحتیں اپنے عوام اور اقتصادی بہبود کے لیے استعمال کریں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا یہ قدرت کا قانون ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے لوگ بھوکے اور مفلوک الحال رہیں؟ کیا یہ ہمارا مقدر ہو چکا ہے کہ ہم ہمیشہ بدحال اور پسماندہ رہیں؟ ہرگز نہیں، ہم پسماندگی اور افلاس کی ان دیواروں کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے عوام کے لیے ایک بہتر مستقبل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں خوشحالی، اطمینان اور عزت کی زندگی بسر کریں۔ افریقہ اور ایشیا کے لیڈر آج اسی جدوجہد میں مصروف ہیں اور وہ پسماندگی اور افلاس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو مفید اور تعمیری کاموں میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان جیسے چھوٹے ملک کے لیے خاص طور پر سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تمام وسائل ترقیاتی کاموں میں استعمال ہوں۔ ہم تضاد اور لڑائی سے ہر قیمت پر بچنا چاہتے ہیں۔ ہم جنگ کا تصور بھی

نہیں کر سکتے۔ ہم عوام کی تباہی و بربادی کے ہر امکان کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بھارت کے عوام کی بھی قدر کرتے ہیں اور ان کا بھلا چاہتے ہیں۔ آخر چند سال پہلے تک ہم ایک ہی ملک کے باشندے تھے۔ یہ تو صرف چند وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ہمیں بھارت کے عوام سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی لیکن اس علیحدگی سے ہمارا مدعا یہی تھا کہ دونوں ملکوں کے عوام اچھے پڑوسیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں۔ امن اور صلح صفائی کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اپنے ملک کی ترقی کے لیے سکون کے ساتھ کام کر سکیں۔ پاکستان کے قیام کا بنیادی اصول یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان کا حصہ ہوں گے۔ بھارتی لیڈروں نے اس بنیادی نظریئے کو تسلیم کرلیا تھا۔ اسی بنیاد پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی لیڈروں نے یہ اعتراف اور اقرار کرلیا کہ دونوں قوموں کے الگ اور آزاد وطن ہوں گے اور دونوں قومیں اس طرح امن کے ساتھ اچھے پڑوسیوں کی طرح زندگی بسر کریں گی۔ آج بھی ہم اس بنیادی بات کے سوا اور کچھ نہیں مانگتے۔

آج ہم ایک ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جو بھارت نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہم پر مسلط کی ہے۔ یہ 45 کروڑ آبادی کے ایک طاقتور ملک کی طرف سے 10 کروڑ آبادی کے ملک پر جارحانہ حملہ ہے۔ یہ ایک بہت بڑی قوم کی طرف سے، جو ہوسِ ملک گیری کا شکار ہے ایک چھوٹے پڑوسی ملک کو ختم کرنے کے لیے ایک کھلا جارحانہ اقدام ہے۔

یہ ایسا ہے جیسے جرمنی یا فرانس نے ڈنمارک پر حملہ کر دیا ہو، یوں سمجھئے کہ جنوبی امریکہ کی کسی چھوٹی سی ریاست پر ارجنٹائن یا برازیل نے اپنی فوجیں چڑھا دی ہوں بلکہ زیادہ واضح طور پر یہ تصور کیجئے کہ امریکہ جیسی طاقت کسی چھوٹے ملک پر فوج کشی کر دے۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہمیں ختم کر دیا جائے۔ ہم بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ پاکستان کے عوام زندہ رہیں۔ اپنے ملک میں ترقی حاصل کریں، خوشحال زندگی بسر کر سکیں لیکن آج بھارت اپنی تمامتر قوت کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ بھارت کا طاقتور فضائی بیڑا ہمارے شہروں پر اندھا دھند بمباری کر رہا ہے۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ ہم اپنی عزت، اپنے ناموس اور اپنے وطن کا ہر قیمت پر دفاع کریں گے۔ ہم نے جنگ شروع نہیں کی۔ دوسری طاقت نے ہم پر حملہ کیا ہے۔ ہمیں اپنے وطن کو بچانا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہمارا ملک بہت چھوٹا ہے، ہمارے وسائل محدود ہیں، ہمیں دشمن کا مقابلہ کرنا ہے اپنے وطن کا دفاع کرنا ہے اور لڑنا ہے۔

ہم لڑتے رہیں گے اس لیے کہ ہم حق پر ہیں۔ ہم ایک اصول کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ہم اپنے اس

www.bhutto.org

عہد کے لیے لڑ رہے ہیں جو حق خود ارادیت کے لیے ہم نے کیا ہے۔ ہم ہر صورت میں حق خود ارادیت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور آج ہم ہی نہیں ایشیا اور افریقہ کی ہر قوم اس معاملہ میں متفق ہے۔ حق خود ارادیت کا یہ اصول جس کے لیے ہم لڑ رہے ہیں ایک ایسی متحرک قوت ہے جسے اب کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی اور ہم یہ جنگ لڑتے رہیں گے پورے عزم کے ساتھ یہ جنگ جاری رکھیں گے اور دنیا کی جو طاقتیں بھی ہمارے خلاف صف آرا ہو رہی ہیں ان سب کا مقابلہ کریں گے۔

سیکرٹری جنرل نے اس معاملے میں مفید تجاویز پیش کی ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں۔ ہم صرف سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے ہی ان کی قدر نہیں کرتے بلکہ انہیں ہم ایشیا کا عظیم مدبر سمجھتے ہیں۔ وہ پاکستان اور بھارت کے ایک عظیم ہمسایہ ملک برما کے لیڈر ہیں اور ہم برما کے ایک مدبر اور سیکرٹری جنرل دونوں حیثیتوں میں ان سے تعاون کریں گے۔ راولپنڈی میں ان سے بات چیت کے دوران ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہم امن چاہتے ہیں، ہم جنگ نہیں چاہتے، ہم تباہی و بربادی نہیں چاہتے لیکن سوال یہ ہے کہ جنگ بندی مستقل ہونی چاہیے۔ اس سے ایسا امن قائم ہونا چاہیے جس سے بھارت اور پاکستان آئندہ کے لیے اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہم بھارت کے پڑوسی ہیں اور اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ ہم روز روز کے جھگڑوں سے تنگ ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ جھگڑے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

جناب والا! میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے اور ہماری خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام قوموں اور خاص طور پر ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں اور بھارت تو ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے۔ قدرتی بات یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں۔ اگر ہم بھارت سے دوستانہ تعلقات قائم نہ کر سکیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمسایہ ممالک اور دوسرے ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے ہماری تمام کوششیں رائیگاں ہیں۔

ہم نے بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے ایک مرتبہ نہیں کئی بار کوششیں کی ہیں۔ کتنی ہی بار ہم نے اس معاملے میں پہل کی۔ بھارتی نمائندہ یہاں موجود ہے وہ اس بات کی گواہی دے گا۔ یہ تاریخی حقائق جھٹلائے نہیں جا سکتے۔ یہ بات ایک مرتبہ نہیں بارہا ثابت ہو چکی ہے کہ ہم بھارت سے دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں اور امن سے رہنا چاہتے ہیں لیکن یہ دوستی اور امن آبرومندانہ

بنیادوں پر ہونا چاہیے اور بھارت کو بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ یہ امن اور دوستی ان وعدوں کی بنیاد ہو سکتی ہے جو خود بھارت نے پاکستان، کشمیری عوام اور پوری دنیا کے ساتھ کر رکھے ہیں۔

بھارت کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ ریاست جموں و کشمیر بھارت کا حصہ ہے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ کشمیر نہ اس وقت بھارت کا حصہ ہے اور نہ کبھی بھارت کا حصہ رہا ہے۔ اگر یہ کسی ملک کا حصہ ہے تو بھارت کے بجائے پاکستان کا ہوگا۔ بھارت خواہ کچھ بھی کہتا رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کشمیری عوام پاکستانی قوم کا حصہ ہیں اور ہمارا گوشت پوست ہیں۔ مذہبی، ثقافتی، جغرافیائی، تاریخی ہر اعتبار سے کشمیری عوام پاکستانی قوم کا حصہ ہیں۔

کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کے لیے اور اپنے دفاع کے لیے ہم ایک ہزار سال تک بھی لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ میں ایک سال پہلے بھی سلامتی کونسل کو یہ بات بتا چکا ہوں۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ اس ادارے نے اپنی تمام طاقت اور اپنی تمام دانشمندی کے باوجود گذشتہ سال کشمیر کے مسئلے پر ایک قرارداد منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت اسی سلامتی کونسل کا یہ خیال تھا کہ کشمیر کا مسئلہ اٹھا کر گویا ہم ایک مردہ گھوڑے کو یہاں گھسیٹ لائے ہیں اور ہم اپنے ملک کے لیے پراپیگنڈا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دنیا کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ پاکستان کے دس کروڑ عوام اپنے عہد اور اپنے وعدوں کو ہرگز فراموش نہیں کریں گے۔ بھارت چاہے اپنے تمام وعدے بھلا دے لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم چھوٹا ملک ہونے کے باوجود اپنے محدود وسائل کے باوجود آخری دم تک جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ہم اپنے دفاع کے لیے، اپنے وقار اور اپنی آبرو کے لیے لڑتے رہیں گے۔ ہم حملہ آور نہیں ہیں ہم پر حملہ کیا گیا ہے۔ سلامتی کونسل کا فرض تھا کہ وہ یہ اعلان کرتی کہ جنگ میں حملہ آور کون ہے اور یہ بھی بتاتی کہ کس ملک کو جارحانہ کارروائی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

میں یہاں ان ملکوں کے نمائندوں کی تقریروں کا ذکر نہیں کرتا جو سرے سے کوئی ملک ہی نہیں ہیں۔ میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو انصاف اور سچائی پر ایمان رکھتے ہیں۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اس سے پہلے بھی جنگیں لڑی گئی ہیں اور قوموں نے انصاف اور سچائی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ میں یہاں سلامتی کونسل کا ذکر کر رہا ہوں جس نے سچائی اور انصاف کی حمایت کی ہے۔ ہم اس حد تک اس کے شکر گزار ہیں۔

بالآخر حق و انصاف کی فتح ہوگی اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ جموں و کشمیر کے عوام کو بھی ان کا حق مل کر رہے گا۔ ان 50 لاکھ افراد کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں۔ یہ کہاں کا انصاف

ہے کہ حقِ خودارادیت جس کا نعرہ آج پورے افریقہ اور ایشیا میں گونج رہا ہے ساری دنیا کے لیے تسلیم کیا جائے اور جموں و کشمیر کے لوگ ہی اس سے محروم رہیں؟ کیا وہ بھارتی معاشرے کے اصولوں کے مطابق اچھوت ہیں؟ آخر انہوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کو حقِ خودارادیت نہ دیا جائے اور انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے سے محروم رکھا جائے؟

بھارت آج ساری دنیا سے الگ تھلگ ہو چکا ہے۔ اس وسعت اور طاقت کے باوجود آج دنیا میں کوئی نہیں جو کھل کر اس کی حمایت کر سکے۔ پورا افریقہ اور ایشیا کشمیری عوام کے حق خودارادیت کا حامی ہے۔ کاسابلانکا میں عرب ملکوں کے سربراہوں نے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ یورپی اقوام کشمیریوں کے حق کی حمایت کر چکی ہے۔ وزیرِ خارجہ مسٹر ڈین رسک کہتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ استصواب کے ذریعے طے ہونا چاہیے۔ ایک طرف پوری دنیا حق کی حمایت کا اعلان کر رہی ہے اور دوسری طرف بھارت کی خوفناک جنگی طاقت ہے جو ہوسِ ملک گیری کے تحت اپنے وعدوں اور اپنے عہد و اقرار کو نظر انداز کرتے ہوئے کشمیری عوام کے جذبۂ حریت کو کچلنے پر آمادہ ہے۔ یاد رکھئے عوام کے عزم اور ان کے جذبۂ حریت کو کبھی کچلا نہیں جا سکتا۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج فائر بندی ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کے دس کروڑ عوام کبھی اپنے اصولوں، اپنے ایمان اور اپنے وعدوں کو پامال نہیں ہونے دیں گے اور اس مقصد کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

جنابِ والا! اپنی ان معروضات کے بعد میں آپ کے سامنے صدرِ پاکستان کا تار پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں جو ابھی مجھے راولپنڈی سے موصول ہوا ہے۔ تار کا متن یہ ہے:

سلامتی کونسل نے 20 ستمبر کو جو قرارداد منظور کی ہے پاکستان اسے ناقابلِ اطمینان تصور کرتا ہے۔ تاہم عالمی امن کی بقا کے لیے اور سلامتی کونسل کو ایک ایسا طریق کار طے کرنے کی مہلت دینے کے لیے جس کے تحت اس تنازع کو جو موجودہ جنگ کا بنیادی سبب ہے یعنی ''جموں و کشمیر کا تنازع'' میں نے پاکستان کی افواج کو حکم دے دیا ہے کہ وہ آج مغربی پاکستان کے وقت کے مطابق 12 بج کر 5 منٹ پر فائرنگ بند کر دے۔ اس وقت کے بعد دشمن کی فوجوں پر کوئی گولہ یا گولی نہ چلائیں گی الا یہ کہ دشمن کی طرف سے ان پر گولی چلائی جائے۔ یہ حکم اس بات سے مشروط ہے کہ بھارتی حکومت بھی اپنی فوجوں کو اس قسم کا حکم جاری کرے اور جموں و کشمیر کے تنازع کو جلد حل کیا جائے، کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق جیسا کہ سلامتی کونسل کی قراردادوں میں تجویز کیا گیا تھا اور جیسا کہ ہندوستان نے منظور کیا تھا۔''

حال ہی میں 15 اپریل اور 18 اپریل کو حکومتِ انڈونیشیا نے بھی مسئلۂ کشمیر کا حل چاہا ہے، کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق، انڈونیشیا اور فلپائن نے بھی مسئلۂ کشمیر کا حل چاہا ہے، کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق۔ انڈونیشیا کے دس کروڑ باشندوں نے ایک مشترکہ اعلان میں جس پر پاکستان اور انڈونیشیا دونوں کے وزیرِ خارجہ کے دستخط تھے 15 اپریل کو افسوس ظاہر کیا کہ:

''بھارت اور پاکستان کا کشمیر پر تنازع اس تمام خطہ کے امن وتحفظ کے لیے ایک خطرہ ہے۔ دونوں کو اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کشمیری عوام کے بنیادی حقوق کا معاملہ ہے نیز اس سے بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات خراب ہو رہے ہیں جس کا اثر افریقہ، ایشیائی اتحاد پر پڑ رہا ہے۔ چنانچہ دونوں وزرائے خارجہ اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ اس تنازع کو جلد از جلد حل کیا جائے۔ کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق اور ان تمام شرائط کے مطابق جو سلامتی کونسل کی قراردادوں میں موجود ہیں اور جنہیں بھارت اور پاکستان دونوں نے تسلیم کر لیا تھا''۔

فلپائن اور پاکستان کے وزرائے خارجہ کے مشترکہ اعلان کے یہ الفاظ ہیں:

''فلپائن کے سیکرٹری برائے امورِ خارجہ اور پاکستان کے وزیرِ خارجہ اس بات پر متفق ہیں کہ مسئلۂ کشمیر کشمیری عوام کے بنیادی حقوق کا معاملہ ہے اور اس تنازع سے بھارت اور پاکستان میں دوستانہ تعلقات میں رکاوٹ پڑ رہی ہے اور افریقہ ایشیا کے اتحاد پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ دونوں وزیر ہم خیال ہیں کہ اس مسئلہ کو جلد حل کیا جائے، کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق جیسا کہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں میں تجویز کیا گیا تھا اور جنہیں بھارت نے تسلیم کر لیا تھا''۔

افریقہ اور ایشیا کی کئی اور اقوام بھی ہیں جنہوں نے پچھلے چند ہفتوں میں کشمیری لیڈروں پر مشتمل ایک وفد کا خیر مقدم کیا اور مسئلۂ کشمیر کے حل کی فوری ضرورت پر زور دیا جو بقول ان کے حق خودارادیت کے اصول کے مطابق ہونا چاہیے جیسا کہ بھارت اور پاکستان اقوامِ متحدہ کشمیری عوام کو ضمانت دے چکے ہیں۔ ان اقوام کے نام یہ ہیں۔ مراکش، آئیوری کوسٹ، نائیجیریا، سیرالیون، سینی گال، سوڈان، صومالیہ، الجزائر، ترکی، ایران، شام، اردن، لبنان اور سعودی عرب وغیرہ۔

اس ضمن میں مَیں صدر بورقیبہ کا 19 مارچ کا بیان نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو انہوں نے اس کشمیری وفد سے ملنے کے بعد دیا جس نے افریقہ اور ایشیا کا پچھلے مہینے دورہ کیا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''مجھے اپنا موقف یاد ہے جو میں نے چند سال ہوئے اس مسئلہ پر اختیار کیا تھا۔ میرے موقف

کی بنیاد اس ہمدردی پر نہیں تھی جو ایک مسلمان کو دوسرے کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ اس دلی تعظیم پر جو میرے دل میں انسان کے مقام اور انسانی حقوق کے لیے ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے علانیہ ہندوستان کی مخالفت کی تھی۔ اس بات پر کہ اس نے سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق استصواب رائے کروانے سے انکار کر دیا۔ میرا موقف یہ نہیں ہے کہ میں ایک فریق کی دوسرے کے مقابلے میں حمایت کر رہا ہوں، مسلمان کی ہندو کے خلاف یا پاکستان کی بھارت کے خلاف۔ میں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ہمارا موقف تو ان فیصلوں کے مطابق ہے جو سلامتی کونسل نے کیے ہیں۔

''ہم نے بھارت کے وزیر اعظم سے خط کتابت کے دوران یہ امر واضح کر دیا ہے کہ ہم اس بارے میں بھارت کی حمایت نہیں کر سکتے اور ہم اس فیصلے پر جمے ہوئے ہیں۔''

الجزائر کے صدر بن بیلا نے بھی اس انداز میں فرمایا ہے:

''مسئلۂ کشمیر ہمیشہ ہماری نظر میں رہا ہے اور ہم اپنا موقف واضح کر چکے ہیں یعنی یہ کہ کشمیری عوام کو حقِ خود اختیاری دیا جائے اور سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عمل ہونا چاہیے۔''

ان تمام ممالک اور دوسروں نے بھی کشمیری عوام کو اپنی حمایت کا یقین دلایا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی اس شدید قوم پرستی اور سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرنے میں کشمیری عوام کو ایشیا اور افریقہ کی ان تمام اقوام کی پشت پناہی حاصل ہے جو سامراجیت کے خلاف ہیں بلکہ جنوبی امریکہ کی اقوام بھی۔

اس کے باوجود بھارت کے وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں 13 اپریل کو یہ بیان دینا مناسب سمجھا کہ مسئلۂ کشمیر کبھی کا حل ہو چکا ہوتا اگر پاکستان کو مغربی ممالک کی مدد حاصل نہ ہوتی۔

یہ کوتاہ نظری واقعی افسوسناک ہے۔ کیا میں وزیر اعظم کو یاد دلانے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ مسئلۂ کشمیر کبھی کا حل ہو چکا ہوتا اگر بھارت بین الاقوامی انصاف کے اصولوں کی خلاف ورزی نہ کرتا اور اپنے پکے وعدوں اور بین الاقوامی وعدوں کو نہ توڑتا۔ اگر مسئلۂ کشمیر آج بھی زندہ ہے باوجود اس تشدد کے جو کشمیری عوام کے ساتھ 17 سال سے روا رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ کشمیری عوام کی ناقابلِ شکست ہمت اور ان کا عزم بالجزم ہے کہ اپنے حقوق حاصل کر کے ہی رہیں گے۔

سلامتی کونسل کے ممبران نے حقِ خود اختیاری کی حمایت کی ہے جو یو این کی دو قراردادوں میں بیان کیا گیا ہے۔ بھارت اور پاکستان بھی ان قراردادوں میں فریقین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان قراردادوں میں عملدرآمد کروانے کی ضمانت دینے کے بعد بھارت اب ان ذمہ داریوں سے روگردانی کر رہا ہے اور

www.bhutto.org

مسئلہ کشمیر کے وجود تک سے انکاری ہے اور اب بھارتی وزیرِ اعظم مظلوم صورت بنا کر افسوس کر رہے ہیں کہ سلامتی کونسل بالخصوص مغربی ممالک کے ارکان کیوں مسئلہ کشمیر کے تصفیہ پر زور دیتے ہیں۔

بھارت کے وزیرِ اعظم کو یہ گمان دل سے نکال دینا چاہیے کہ مسئلہ کشمیر کبھی کا ان کی مرضی کے مطابق طے ہو چکا ہوتا اگر مغربی ممالک پاکستان کی حمایت نہ کرتے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ نہ صرف مغرب بلکہ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی اقوام نے کشمیری عوام کے مطالبے کی حمایت اور یو این کی قراردادوں پر عمل کرنے کی تائید کی ہے تاکہ یہ تنازع پرامن اور منصفانہ طریقے سے طے ہو جائے۔

جنابِ صدر! میں نے اب تک اپنی تقریر میں ان نئے پہلوؤں سے بحث کی ہے جو مسئلہ کشمیر میں داخل ہو گئے ہیں یعنی کشمیری عوام کی بھارتی قبضہ کے خلاف بغاوت اور وہ بڑھتی ہوئی عالمگیر ہمدردی اور حمایت جو کشمیری عوام کو حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ خاص کر ایشیا اور افریقہ کی حکومتوں اور عوام سے اس مسئلہ کی پرامن اور منصفانہ حل کی تلاش میں جس کے لیے انہیں اپنا حقِ خود اختیاری استعمال کرنا لازمی ہے اور اس حق کے دلانے کی بھارت اور پاکستان اور اقوام متحدہ خود ضمانت لے چکے ہیں۔

میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کے بیانات نقل کر چکا ہوں، حقِ خود اختیاری کے بارے میں اور استصوابِ رائے کے بارے میں اور الحاق کے بارے میں اور ان طریقوں کے بارے میں جن کا اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ ہندوستان کے درمیان یہ تنازع کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق حل ہو۔ میں نے بھارت کے کئی نامور اشخاص کی آراء بھی نقل کی ہیں جو امن پسند اور صلح جو ہیں۔

لیکن بھارتی حکومت کا وقت کے ان تقاضوں کے سامنے کیا ردِ عمل رہا ہے؟ کیا اس نے کوشش کی ہے کہ حالات کا از سرِ نو جائزہ لے اور اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرے تاکہ کوئی مفاہمت اور مصالحت کا راستہ نکلے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے کوئی آثار نہیں ہیں۔ 12 اپریل کو بھارتی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے بھارتی وزیرِ اعظم نے شیخ عبداللہ کے بیانات کو محض "افسوسناک" کہہ کر رد کر دیا۔ بھارت کے وزیرِ اعظم مسٹر لال بہادر شاستری نے بھی پارلیمنٹ میں وہی بات دہرانی مناسب سمجھی کہ "کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ اٹل ہے۔" مسٹر شاستری نے شیخ عبداللہ کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے ہمارے خیالات کی تائید و حمایت نہ کی تو نتائج بہت برے ہوں گے۔ بھارت کے وزیرِ امورِ داخلہ مسٹر نندا نے "عالمانہ" انداز میں کہا:

"تاریخ کے بعض حقائق اٹل ہوتے ہیں، ریاستِ جموں و کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق بھی

بھارتی تاریخ کی ایک حقیقت ہے اس کا پلٹنا اب ممکن نہیں۔"

(بحوالہ ہندوستان ٹائمز 16 اپریل)

مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیر اعظم مسٹر جی ایم صادق نے بھی اس ڈرانے دھمکانے کی مہم میں پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور 16 اپریل کو بڑی شان سے کہا:

"ابھی تک کوئی ایسا جادوگر پیدا نہیں ہوا جو بس پھونک دے اور ہماری حکومت اور فوجیں غائب ہو جائیں۔"

انہوں نے وہی بات دہرائی کہ کشمیر اسی طرح بھارت کا حصہ ہے جیسے بمبئی، کلکتہ اور مدراس۔

(ٹائمز آف انڈیا بمبئی 17 اپریل)

کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کے منصوبوں کے بارے میں مسٹر صادق نے 19 اپریل کو کہا کہ اس بدنام بل کے ملتوی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس کی رو سے لفظ "صدر ریاست" اور وزیر اعظم جموں و کشمیر کو بدل کر "گورنر" اور "وزیر اعلیٰ" کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بل ضرور بالضرور ریاستی اسمبلی کے اگلے اجلاس میں زیرِ غور لایا جائے گا۔

(ہندوستان ٹائمز 19 اپریل)

20 اپریل کو اس کٹھ پتلی وزیر اعظم نے پھر بھارت کے دارالحکومت میں بھارتی آئین کی دفعہ 370 کو منسوخ کرنے کی تجویز دی تاکہ کشمیر کا پوری طرح سے بھارت سے الحاق ہو جائے۔

(ٹائمز آف انڈیا 21 اپریل)

15 اپریل کو بھارت کے وزیرِ امورِ داخلہ مسٹر نندا نے بھارتی پارلیمنٹ میں کہا کہ جموں و کشمیر سے بھارت کا الحاق مکمل، پختہ اور اٹل ہے اور حکومت کی یہ پالیسی بدلی جائے گی۔ محض اس لیے کہ کسی نے کہیں کچھ کیا ہے۔

29 اپریل کو بھارت کے وزیرِ خزانہ مسٹر شنم اچاریہ نے یہ دلچسپ بیان دیا جس سے ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کشمیر کی سیاسی حیثیت پر نظرِ ثانی کرے اور یہ کہ کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کے بنیادی معاملات طے ہو گئے ہیں صرف جزئیات رہتی ہیں۔

گو یقین نہیں آتا لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان بھارتی وزراء کو یاد دہانی کروانا ضروری ہے کہ پاکستان کا تنازع کشمیر کے الحاق کی جزئیات کے بارے میں نہیں ہے اور نہ ہی سلامتی کونسل ان جزئیات پر

www.bhutto.org

پریشان ہے۔ پاکستان کے درمیان بین الاقوامی معاہدے جو کشمیر کے بارے میں ہیں وہ ان جزئیات کے بارے میں نہیں ہیں۔ کشمیر کے عوام نے واضح کردیا ہے کہ وہ جو جدوجہد کررہے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ یہ جزئیات کیسے طے ہوں۔ کشمیر، پاکستان کے عوام اور اقوامِ متحدہ سے یا حکومتِ پاکستان سے یوں کہا جائے کہ اس مسئلہ کا حل کشمیری عوام کی مرضی کے عین مطابق ہو اور اسے غیر جانبدارانہ طریقے پر دریافت کیا جائے۔

جنابِ صدر! اس خاص موقع پر کشمیری عوام کے مفاد، برصغیر کے مفاد بلکہ ایشیا کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ سلامتی کونسل ہر وہ قدم اٹھائے جو اس تنازعے کے فوری اور منصفانہ اور باعزت حل کو اور قریب لاسکے۔

بھارت کا دعویٰ ہے کہ کشمیری عوام پہلے ہی الحاق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرچکے ہیں۔ ہمارا کہنا ہے کہ کشمیری عوام کو ابھی اپنا حقِ خود اختیاری استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہم مُصر ہیں کہ انہیں ابھی فیصلہ کرنا ہے کہ بھارت سے الحاق کریں یا پاکستان سے۔ اس لیے ہم تجویز پیش کرتے ہیں کہ شیخ عبداللہ کو سلامتی کونسل کے سامنے پیش ہونے کی دعوت دی جائے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اس غرض سے کارروائی کے ''عارضی اصول نمبر 39'' کے تحت مناسب اقدام اٹھائے جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسی معلومات بہم پہنچاسکیں گے جو اس مسئلے کے حل میں ممد ومعاون ثابت ہوسکیں۔ اس اصول کے تحت بعض اشخاص کو کونسل میں مدعو کرنے کا سلسلہ پہلے ہی شروع کیا جاچکا ہے اور اس کی نظیر موجود بھی ہے لہٰذا ایسا کرنے پر کونسل پر کوئی قانونی یا آئینی گرفت نہیں ہوتی۔ مجھے امید ہے کہ میری اس تجویز پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔

جنابِ صدر! میں اس موقع پر پاکستان کے عوام کی طرف سے بھارت کے عوام تک ایک پیغام پہنچانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے:

16 سال سے ہم بحث ومباحثہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ شاید اقوام کی طویل تاریخ میں ایسے تاریک دور آ ہی جاتے ہیں۔ ان کا اختتام بھی ہونا لازمی ہے۔ داناؤں نے یہ حقیقت بار بار بیان کی ہے۔ تلخ وتند برکھا کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور صلح وآشتی کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ 16 سال سے کشمیر کو اس کے بنیادی حق سے محروم کیا جارہا ہے کہ وہ بھی بھارت اور پاکستان کی اس آزادی میں شامل ہو جو ان دونوں ممالک کو حاصل ہوئی ہے۔ اب ان حالات کو جاری رکھنے کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔ بھارت اپنی جھوٹی انا کو کب تک سینے سے لگائے رہے گا اور ایک موہوم قومی افتخار کی آڑ کب تک لے گا؟

زمانے کی ایک روح اور ایک تقاضا ہے کہ جس سے انحراف ممکن نہیں اور یہ تقاضا ہے آزادی اور خودمختاری کا۔اب تلافی کا وقت آ گیا ہے۔وہ گھڑی آ پہنچی جب کشمیری عوام کی بیڑیاں ٹوٹنی ہوں گی۔ وہ وقت آ گیا ہے جب دانائی وفراست سے بیداد کی داد ہوگی اور عہد کا ایفا ہوگا۔ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو عدل وانصاف، صلح وآشتی، محبت اور مروت کی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ قدرت کے پراسرار کرشموں سے وقت نے یہ کروٹ لی ہے کہ ہندوستان کو ایک نادر موقع حاصل ہو، ہمسائیگی اور دوستی کا ایک نیا دور شروع کرنے کا اور تعمیری جدوجہد کرنے کا۔ کشمیر ان تعلقات کی استواری میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔اگر ہم اس مسئلہ کو ان اصولوں کے مطابق طے کرلیں جن کو ہم باقاعدہ تسلیم کرچکے ہیں اور جن کی ضمانت ہم نے کشمیری عوام کو دی ہے تو ہم امن وانسانیت کی بلندیوں تک جا پہنچیں گے۔اس کے برعکس اگر ہم مخاصمت اور بغض وعداوت میں پھنسے رہے تو تنفر اور تنازع کا سلسلہ اور بھی طویل ہوتا جائے گا۔انسانی معاملات میں ایک مدوجزر ہے اور جو بہاؤ کے ساتھ تیر نکلا اس کا بیڑا پار ہوگیا۔وہ موقع اب ہمیں حاصل ہے۔وہ وقت آ گیا ہے جب فیصلہ ہوجائے گا آیا بھارت اور پاکستان اپنے جھگڑے کو منصفانہ طور پر طے کرکے کامیاب اور ارجمند ہوں گے یا باہمی کشیدگی کے باعث اس وسعت پذیر اور ہمت آزما دنیا میں کوئے مراد کھو بیٹھیں گے۔"

ذوالفقار علی بھٹو اس تقریر کے دوران جس دکھ درد اور کرب کا شکار تھے اس کا اندازہ ان آنسوؤں سے ہوتا ہے جو دوران تقریر ان کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔ یہ مسٹر بھٹو کی ایک یادگار تقریر ہے جس کو کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔15 اکتوبر کو جب وہ وطن واپس لوٹے تو پوری قوم دو نعرے لگا رہی تھی:

"ہم ایک ہزار سال تک جنگ لڑیں گے۔"

"ہم ایٹم بم بنائیں گے چاہے ہمیں گھاس ہی کیوں نہ کھانا پڑے۔"

یہ ذوالفقار علی بھٹو کی تقاریر کا حصہ تھے جن کو انہوں نے بار بار اپنے بیانوں اور تقریروں میں دہرایا۔ یہ 1965ء کی جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والا تجربہ تھا۔ ہندوستان سے ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کا مطلب تھا کہ ہم اپنے تشخص کی خاطر لڑتے رہیں گے۔ چونکہ برصغیر میں ہمارے شاندار ماضی کی تاریخ بھی ایک ہزار سال پر محیط ہے اور اس طرح ایٹم بم بنانے کا نعرہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ہم اپنے دفاع کے لیے امریکہ جیسے طوطا چشم دوست پر دفاع کے لیے اعتبار اور اعتماد نہیں کرسکتے اور اس کے لیے لازم ہے کہ بیلنس آف ٹیرر کے نظریئے کے تحت اپنی عسکری

صلاحیت میں خود مختاری حاصل کی جائے تا کہ ہم اپنے پڑوسی بھارت جیسے دیو ہیکل توسیع پسند ملک کی جارحانہ پالیسی سے محفوظ رہیں۔ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی وطن واپسی کے بعد پاکستان بھر میں مختلف ترقی پسند سیاسی کارکنوں کی خواہش تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی پذیرائی کی جائے چونکہ جنگ کے دوران پاکستانی وزیر خارجہ نے روایتی سفارتکاری کے برعکس ایک استعمار دشمن عوامی راہنما کے طور پر اپنی شناخت کو ابھارا تھا، جس میں انڈونیشیا کے احمد سوئیکارنو، مصر کے جمال عبدالناصر، الجزائر کے بن بیلا اور چین کے چواین لائی جیسے استعمار دشمن راہنماؤں کی حمایت کا عملی اظہار دیکھنے کو ملا تھا۔ وطن واپسی پر کابینہ، حکومت اور دیگر ریاستی اداروں میں شامل امریکہ کے ہمنواؤں کی طرف سے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف سازشوں کا آغاز شروع ہو گیا۔ ان تمام باتوں سمیت 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں قوم ذوالفقار علی بھٹو کو ایک ابھرتے ہوئے سامراج دشمن لیڈر کے طور پر دیکھ رہی تھی۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی پہلی عوامی پہچان تھی، ایک نیشنلسٹ اور سامراج مخالف راہنما۔

www.bhutto.org

اقتدار سے علیحدگی

1965ء کی 17 روزہ پاک بھارت جنگ نے خطے کے دونوں ممالک پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مثلاً یہ کہ بھارت جو یہ تصور کرتا تھا کہ وہ دفاعی طور پر پاکستان کو دبوچ سکتا ہے، غلط ثابت ہوا۔ اس کی عالمی سطح پر ڈپلومیسی میں بالادستی بھی کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی حالانکہ وہ غیر وابستہ ممالک کی تحریک (N.A.M) کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس پاکستان کو تیسری دنیا اور خصوصاً تیسری دنیا کی اس وقت کی مقبول ترین قیادت چو این لائی، احمد سوئیکارنو، بن بیلا اور جمال عبدالناصر جیسے راہنماؤں کی بھرپور حمایت اور اسی کے ساتھ ایران سمیت مشرقِ وسطیٰ کے تیل سے مالا مال عرب ممالک جن کے امریکہ اور مغرب کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے وہ بھی پاکستان کی حمایت میں کھل کر سامنے آئے۔ یہ ایک نئی تبدیلی تھی۔ ایک ایسا ملک جو امریکہ کے عسکری معاہدات کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اس کی حمایت میں تیسری دنیا کی اعلیٰ قیادت میدانِ عمل میں نکل آئی اس لیے کہ نوجوان وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے نئی عالمی حقیقتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے خارجہ زاویوں کو سامنے رکھ کر پاکستان کی خارجہ پالیسی تشکیل دی تھی۔ کئی رکاوٹوں کے باوجود وہ ایک پروقار، اصول پسند، آزاد اور قوم پرست خارجہ پالیسی تھی جس کے سبب عالمی ترقی پسند تحریکوں اور قیادت کو باور کروایا کہ ہم عالمی استعماریت کے خلاف اور آزادی پسند قوموں کا ساتھ دیتے ہوئے دنیا میں نئے عالمی اقتصادی نظام کے خواہاں ہیں جہاں پر بڑی قومیں چھوٹی قوموں کا استحصال نہ کر پائیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی یہ پالیسی اور حکمتِ عملی 1965ء کی جنگ میں پاکستانی قوم اور ملک کی نئی زندگی کا سبب بھی بنی اور یوں ہم اپنا دفاع کر کے ایک بڑے ہمسایہ ملک کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کر پائے۔ اس جنگ کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے ایٹم بم بنانے کا ارادہ بھی ایک سیاسی ادراک تھا کہ طاقت کے توازن کے بغیر امن ناممکن ہے۔ ایک کامیاب وزیرِ خارجہ کا کردار ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

کی عوام میں بے پناہ مقبولیت کا سبب بنا لیکن حکومت جو کہ مکمل طور پر جدید نوآبادیاتی ڈھانچے پر مشتمل تھی ایک ایسے شخص کو کیونکر برداشت کر سکتی تھی جو جدید نوآبادیاتی نظام کو ایکسپوز کر رہا تھا۔ اس کا آغاز تو سلامتی کونسل میں پاکستان کے نمائندے کی نامزدگی پر ہی ہو گیا تھا جب پہلے یہ طے کیا گیا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی جگہ وزیرِ قانون ایس ایم ظفر کو بھیج دیا جائے۔ جنگ بندی کے ساتھ ہی ملک میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف سازشیں عروج پر پہنچ گئیں۔ درحقیقت پاکستان جس شکست سے میدانِ جنگ میں محفوظ رہا اب اس شکست کا انتظام مذاکرات کی میز پر کیا جا رہا تھا۔ غیر مشروط جنگ بندی کا دباؤ امریکہ کی طرف سے ہندوستان کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی حکومت کو باور کروایا کہ یہ قدم ہماری فتح کو شکست میں بدلنے کے مترادف ہے لیکن ایوب حکومت اب مغرب کے دباؤ کا شکار نظر آ رہی تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود پاکستان کے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے آبرومندانہ معاہدے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ امریکہ سے واپسی کے بعد وہ فرانس گئے جہاں انہوں نے فرانسیسی حکام کے ساتھ بات چیت کر کے دورانِ جنگ ان کی مثبت حمایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امن کا باوقار راستہ تلاش کرنے کی کوششیں کیں۔ اس کے علاوہ سوویت یونین کے وزیرِ خارجہ آندرے گرومیکو سے ملاقات اور یو این کے سیکرٹری جنرل او تھان سے ملاقات لیکن یہ کوششیں ساتھ ہی ساتھ سبوتاژ بھی کی جاتی رہیں۔

پاکستان کی حکومت پر امریکی دباؤ اس قدر شدید ہوتا جا رہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی ڈپلومیسی کے ذریعے تیسری دنیا کو پاکستان کی حمایت پر آمادہ کر کے اس چیز کو بھی ابھارا کہ سرد جنگ کے اس زمانے میں جب سوویت یونین اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہیں دنیا کی نوآزاد قومیں اپنے مفادات کے تحفظ اور خوشحالی کے لیے اتحاد کے ایک نقطے کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ جنگ کے دوران مشرقی یورپ کے سوشلسٹ ممالک، عرب ممالک، افریقہ کے نوآزاد ممالک اور ایشیا کے چھوٹے ممالک انڈونیشیا، ایران و ترکی وغیرہ نے پاکستان کا ساتھ دیا تھا وہ اس بات کا اظہار تھا کہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک، ترقی پذیر ممالک اور سوشلسٹ ممالک امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ یہ دور عالمی تعلقات میں ڈپلومیسی کے لحاظ سے ایک Radical دور تھا اور اس سارے عالمی منظرنامے میں پاکستان کے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کا عکس نظر آنے لگا تھا۔

جنگ کے بعد بھارت نے ڈپلومیسی میں تبدیلی کی۔ وہ یہ تھی کہ اس نے سوویت یونین کے ساتھ تعلقات کو نئے ارادوں کے ساتھ مزید مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا شروع کیا اور ان تعلقات کی انتہا

www.bhutto.org

پر ہند، سوویت دوستی کا معاہدہ معرضِ وجود میں آیا۔ 9 اگست 1971ء کو بھارت اور سوویت یونین نے 20 سالہ "معاہدہ برائے امن، دوستی اور تعاون" تشکیل دیا۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں سلامتی کونسل سمیت اقوامِ متحدہ کے دیگر اداروں کا سامراجی کردار کھل کر سامنے آیا۔ سلامتی کونسل نے دونوں ممالک کی جنگ بندی کا معاہدہ کروا کر امن کے قیام کے لیے ایسے راستوں کا تعین کیا جس میں پاک بھارت تعلقات میں بنیادی تنازع کشمیر پر کوئی گفتگو یا کسی اہم نکتے کے لیے قدم نہ اٹھایا گیا۔

صدر ایوب خان سلامتی کونسل کی طرف سے جنگ بندی کے بعد جس سرعت سے بھارت کے ساتھ مذاکرات پر جا رہے تھے اس سے ایوب خان کی "وطن دوستی" کے دعوے بڑے مضحکہ خیز محسوس ہو رہے تھے۔ ان مذاکرات میں کشمیر کے تنازع کو ایجنڈے میں شامل نہیں کیا جا رہا تھا۔ درحقیقت ایوب خان ایسے اقدامات نہیں اٹھانا چاہتے تھے جن سے امریکہ کو ناراضگی ہو۔ پاکستان کے خود ساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان کا فکری تضاد دیکھئے کہ ستمبر 1959ء میں ایوب خان نے بھارت کے وزیرِ اعظم نہرو کو امریکی خواہشات کے مطابق تجویز دی کہ دونوں ملک بھارت اور پاکستان بیرونی توسیع پسندی کے خلاف مشترکہ دفاعی معاہدے میں منسلک ہو جائیں۔ ایوب خان کی اس تجویز پر بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو نے کہا کہ:

"مشترکہ دفاع کس کے خلاف۔" دراصل یہ امریکی تجویز تھی۔

جب جنوری 1966ء کو بھارتی وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری اور پاکستانی صدر ایوب خان سوویت یونین کے وزیرِ اعظم الیکسی کوسیگن کی دعوت پر تاشقند میں امن مذاکرات کے لیے روانہ ہوئے تو ایوب خان کی کوشش تھی کہ وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو ممکنہ حد تک مذاکرات کے عمل سے دور رکھا جائے اور اس کی جگہ الطاف گوہر کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ بھارت اور پاکستان کی اعلیٰ قیادت کے درمیان جو معاہدہ وجود میں آیا اس میں یہ طے کیا گیا کہ "دونوں ملکوں کی افواج 5 اگست 1965ء سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلی جائیں۔" سلامتی کونسل کی جنگ بندی کی قرارداد کے بعد پاکستان بھر میں یہ بات گردش میں تھی کہ پاکستان کشمیر کے مسئلے سے اپنی توجہ ہٹا چکا ہے اور اقوامِ متحدہ جیسا ادارہ امریکہ کے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے جو کہ پاکستان کے بجائے بھارت کو "شک کا فائدہ" دینا چاہتا ہے۔ وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے ناراض رویئے نے ان افواہوں کو حقیقت میں بدل دیا۔ چونکہ ذوالفقار علی بھٹو نے بحیثیت وزیرِ خارجہ پاکستان کے دفاع، سلامتی اور کشمیر کے مسئلے کو عالمی سطح پر اجاگر کر کے پاکستان کی آواز

www.bhutto.org

کو نمایاں کر دیا تھا اس لیے ذوالفقار علی بھٹو اب کشمیر کے مسئلے اور مذاکرات پر سند سمجھے جا رہے تھے جبکہ ایوب خان اب اپنے وزیرِ خارجہ سے قربت کا اظہار کرنے کے بجائے قریب قریب لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

10 جنوری 1966ء کو تاشقند کے متنازع اور مشہور معاہدے پر صدر ایوب خان اور وزیرِ اعظم شاستری نے دستخط کر دیئے۔ پوری قوم کی توجہ تاشقند میں ہونے والے پاک بھارت مذاکرات کی طرف تھی۔ جب معاہدے کی خبر پاکستان پہنچی تو یہاں کے دانشور، سیاسی اور عوامی حلقوں میں شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ چونکہ پاکستان کے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ بھارت کے ساتھ کشمیر کے تنازع کے حل کے بغیر پاک بھارت امن کا قیام محض ایک خواب ہے گو پاک بھارت جنگ میں پاکستان نے کوئی عسکری فتح تو حاصل نہیں کی تھی لیکن پاکستان کی مسلح افواج نے اپنے سے بڑے ملک (بھارت) کے عسکری عزائم کی تکمیل ناممکن بنا کر بھارتی افواج کے مقابلے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور عوام یہ سمجھتے تھے کہ توسیع پسند بھارت کی عسکری برتری کا غرور توڑنے کے بعد ہم سفارتی میدان میں بہتر نتائج برآمد کر سکتے ہیں لیکن تاشقند معاہدہ پاکستان کے عوام کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا جبکہ پاکستان بھر میں مشکل وقت میں ساتھ چھوڑنے پر امریکہ کے خلاف نفرت بھی ابھری تھی۔ وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے سلامتی کونسل میں جارحیت کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''جموں اور کشمیر کبھی بھی بھارت کا حصہ نہیں رہے اور نہ ہی رہ سکتے ہیں۔ جموں اور کشمیر کے لوگ پاکستان کا حصہ ہیں۔ ان کے خون، ان کے رہن سہن، ان کی زندگی، ان کی ثقافت، ان کے جغرافیے اور تاریخ میں پاکستان ہے اور ہم اپنے دفاع کے لیے ایک ہزار سال تک جنگ لڑیں گے۔''

یہ الفاظ پاکستان کے عوام کی آواز بن چکے تھے لیکن تاشقند میں ہونے والے معاہدے میں اس آواز کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس معاہدے کے فوراً بعد ذوالفقار علی بھٹو نے تاشقند ہی میں اپنا استعفیٰ صدر ایوب خان کو پیش کر دیا لیکن ایوب خان نے کہا کہ یہاں پر آپ کے استعفیٰ کی خبر قومی مفاد میں نہیں جس کی وجہ سے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے اس خبر کو باہر نہ آنے دیا۔ ایوب خان کی کوشش تھی کہ اپنے وزیرِ خارجہ کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کیا جائے لیکن نئی خارجہ پالیسی کے معمار ذوالفقار علی بھٹو نے صدر ایوب خان کے کردار پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

نے نئی سیاست کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ معروف بھارتی صحافی کلدیپ نایر جو وزیرِاعظم شاستری کے ہمراہ تاشقند میں موجود تھے انہوں نے اپنی کتاب 'انڈیا کریٹیکل ٹائمز' میں لکھا ہے کہ:

''بھٹو شروع ہی سے کچھ ناراض سے تھے۔ سارے پاکستانی مندوبین نے شاستری کی افتتاحی تقریر پر زور زور سے تالیاں بجائیں مگر مسٹر بھٹو بڑی لاتعلقی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بھارتی وزیرِاعظم جن کو پاکستان کے صدر ایوب خان نے Man of Peace قرار دیا تھا، اس معاہدے پر بے انتہا خوش تھے۔ اس دوران ان کو وہاں تیسرا دل کا دورہ پڑا جو کہ ان کی موت کا سبب بنا۔ شاستری کے سرکاری معالج آر این چھگ جو ان کے ساتھ والے کمرے میں قیام پذیر تھے وہ اپنے مریض شاستری کو بچانے کے لیے کمرے میں گئے لیکن مریض ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی کے سانس پورے کر چکا تھا۔ جب وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو سیکرٹری خارجہ نے اطلاع دی:

"The bastard is dead."

تو ذوالفقار علی بھٹو نے کہا:

"Which one?"

ایوب خان کو معلوم تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے گلی کوچوں میں اب ایک مقبول ترین ہیرو قرار دیئے جا چکے ہیں اس لیے انہوں نے کوششیں جاری رکھیں کہ بھٹو ایوب اختلافات کی چنگاریاں پاکستان کے شہروں اور قصبوں تک نہ پہنچ پائیں لیکن عوام کا شعور ان اختلافات کی حقیقتوں کو محسوس کر رہا تھا۔

تاشقند معاہدہ جس کو صدر ایوب خان ایک آبرومندانہ امن سمجھوتہ قرار دے رہے تھے، کو عوام نے مسترد کر دیا اور ملک کے بڑے شہروں میں اس معاہدے کے خلاف مظاہرے برپا ہوئے۔ مغربی پاکستان میں معاہدۂ تاشقند کے خلاف شدید ردِعمل صرف عوامی حلقوں میں بلکہ فوجی افسروں نے بھی معاہدۂ تاشقند اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ پاکستان واپس آنے کے بعد ردِعمل وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اپنے آبائی شہر لاڑکانہ چلے گئے جہاں انہوں نے مستقبل میں اپنے سیاسی کردار کا تعین کرنا تھا۔ 15 جنوری کو انہوں نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ:

''ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم تاشقند میں مسئلہ کا فوری حل تلاش نہیں کر سکے۔ اعلانِ تاشقند بذاتِ خود کوئی منزل نہیں اور نہ ہی بھارت سے ہمارے تعلقات میں تبدیلی کی ضمانت دے سکتا ہے کیونکہ مسئلۂ کشمیر کے دائمی اور پرامن حل کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے شہداء نے اس خریدے ہوئے امن کے لیے نہیں بلکہ باعزت اور منصفانہ امن کے لیے اپنا خون بہایا ہے۔ ان کی قربانی رائیگاں نہیں جا سکتی۔ ہم خود کو اس کے اہل ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔''

اس عرصے میں بھٹو نے متعدد غیر ملکی دورے بھی کیے لیکن اختلافات کی چنگاریاں کم نہ ہونے پائیں اور ذوالفقار علی بھٹو نے اکثر اوقات تاشقند معاہدے پر بھرپور اعتراض کا اظہار جاری رکھا۔ امریکہ کی طرف سے ایوب خان پر بھی ذوالفقار علی بھٹو کو حکومت سے علیحدہ کرنے کا دباؤ بڑھتا رہا۔ اسی دوران پاکستان کے عوام اور ذوالفقار علی بھٹو کے عظیم دوست احمد سوئیکارنو جنہوں نے تیسری دنیا کی جدوجہد میں امریکی امپیریل ازم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا کے خلاف امریکہ نے انڈونیشیا کے اندر سی آئی اے کے ذریعے ایک ردِ انقلاب کی صورت پیدا کر کے احمد سوئیکارنو کے لاکھوں حامیوں کے قتلِ عام کے منصوبے پر عمل شروع کرایا۔ یہ سانحہ تیسری دنیا کے نو آزاد ممالک کے لیے ایک عظیم المیہ تھا۔ سازش کے تحت احمد سوئیکارنو کو ان کے صدارتی محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اس پیچیدہ صورتحال میں 9 جون 1966ء کو جکارتہ پہنچے اور تیسری دنیا کے معروف راہنما احمد سوئیکارنو سے ان کی نظر بندی کے دوران ملاقات کی۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ نے پاکستان اور انڈونیشیا سے دو سامراج دشمن راہنماؤں سے چھٹکارا پانے کا اہتمام کیا تھا۔ اسی لیے جب وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو وزارتِ خارجہ سے علیحدہ کیا گیا تو برطانوی اخبار ڈیلی ٹیلی گراف نے 20 جون 1966ء کے شمارے میں لکھا کہ:

''دنیا بھر میں مسٹر بھٹو کی علیحدگی کو امریکی دباؤ اور خواہش کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے کیونکہ وہ ایشیا میں چین کے صفِ اول کے حامیوں میں سے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ چین کے ساتھ دوستی سے ہی پاکستان کا مستقبل محفوظ اور خوش آئند ہو سکتا ہے۔''

بھٹو کے استعفیٰ کی خبر سب سے پہلے انڈیا ریڈیو نے 5 جون 1966ء کو نشر کی جبکہ صدر ایوب

www.bhutto.org

خان نے 18 جون 1966ء کو بھارتی ریڈیو کی خبر کی تصدیق کردی اور یہ کہا کہ وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو طویل عرصے تک قومی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے کافی تھک گئے تھے اس لیے وہ رخصت پر جا رہے ہیں جبکہ 8 جولائی 1966ء کو سرکاری طور پر ذوالفقار علی بھٹو کی وزارتِ خارجہ سے علیحدگی کا اعلان کیا گیا اور یوں ذوالفقار علی بھٹو اقتدار کے ایوانوں سے پاکستان کے عوام کے ساتھ آن ملے۔ وہ اقتدار میں اپنے خاندان کے جاگیردارانہ پس منظر کے حوالے سے شامل کیے گئے جہاں ان کی ذہانت اور قابلیت نے ان کو وزارتِ خارجہ کے اہم ترین قلمدان تک پہنچا دیا اور وہاں سے وہ ایک ترقی پسند اور قوم پرست عوامی راہنما کے طور پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے جس کے دوران ان کے دنیا بھر کے مقتدر راہنماؤں سے خصوصی اور ذاتی تعلقات قائم ہوگئے۔ ذوالفقار علی بھٹو حکومتی اور عالمی تعلقات کے وسیع تجربے کے بعد عوام کی صفوں میں شامل ہوئے جو ایک مدت سے ان کی بھرپور شخصیت سے متاثر ہو چکے تھے۔ مغربی پاکستان میں اب ذوالفقار علی بھٹو کی مقبولیت کا کوئی شریک کار نہیں تھا۔ جاگیردار طبقے سے تعلق رکھنے والے سخت گیر گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان اور پھر جنرل موسیٰ خان جیسے آمریت پسند حکمران ان کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوششوں میں مصروف تھے لیکن عوامی بھٹو کے لیے ریاستی طاقت کوئی رکاوٹ ثابت نہ ہوئی۔ ان کے استعفیٰ سے متعلق عالمی مدبر یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ امریکی دباؤ کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔ 13 اگست 1966ء کو برٹرینڈ رسل نے برما کے جنرل نی ون کو لکھا:

> "ذوالفقار علی بھٹو سے معلوم ہوا ہے کہ آپ لندن میں تھے۔ وہ بھی آپ کو ایشیا کا ایک عظیم لیڈر قرار دیتے ہیں اور ان کی رائے سے میرے ذاتی تأثرات کو تقویت ملی ہے۔ اگر آپ سے ملاقات ممکن ہو اور ہمیں اہم موضوعات پر تبادلۂ خیال کا موقع میسر آئے تو مجھے مسرت ہوگی۔ مجھے نکرومہ، صدر سوئیکارنو اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے سچے قوم پرست اور ترقی پسند راہنماؤں پر امریکی دباؤ سے شدید تشویش ہوئی ہے۔"

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومتِ پاکستان سے علیحدگی افروایشیائی اقوام کے لیے ایک بڑا نقصان تھا کیونکہ نو آزاد ترقی پذیر ممالک ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں ایک سامراج دشمن راہنما کو ترقی پذیر قوموں کے راہنماؤں کے درمیان لڑی کا ایک موتی تصور کرتے تھے۔

اقتدار کی سیاست کے تجربے کے بعد اب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وفاقی دارالحکومت

www.bhutto.org

اسلام آباد سے روانگی اور پاکستان کے عوام کے ساتھ رابطے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ گو پاکستان کے دفتر خارجہ میں ان کی رخصتی کے موقع پر الوداعی ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن اسلام آباد کے ایوانوں میں براجمان حکمرانوں کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ پاکستان کے عوام ''سٹیٹس کو'' کے خلاف ایک بھرپور عوامی بغاوت کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اب پاکستان کی سیاست میں ایک نئے باب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ان دنوں قومی اسمبلی کا اجلاس بھی جاری تھا لیکن عوام ان فرسودہ اداروں کے خلاف عوامی اجلاسوں کا تہیہ کر چکے تھے جن کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو نے کرنی تھی۔ 21 جون 1966ء کو خیبر میل میں ذوالفقار علی بھٹو نے سوار ہو کر عوامی ٹرین چلانے کا فیصلہ دے دیا۔ راولپنڈی کے ریلوے سٹیشن پر قوم کے عوامی ہیرو کو آنسوؤں، سسکیوں اور جوش و جذبے کے بھرپور جذبات کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ ہزاروں کا عوامی اجتماع سامراجی سازشوں کے خلاف نعرے بلند کر رہا تھا اور اسی طرح دوسرے دن لاہور کے ریلوے سٹیشن پر طالب علم، نوجوان، مزدور، صحافی، دانشور، محنت کش اور شہری اپنے قائد کے استقبال کے منتظر تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ ''عوام کی یہ ٹرین اپنے حقوق کی بازیابی تک چلتی رہے گی۔'' لاہور ریلوے سٹیشن پر عوام کے ہجوم نے ابھرتے ہوئے عوامی قائد کا تاریخ ساز استقبال کر کے اس بات کا فیصلہ دے دیا کہ ان کو ایک قیادت میسر ہو گئی ہے جو عوام کے انداز میں سوچتی ہے۔ ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر سیاستدانوں کے فیصلوں کی سیاست کو مسترد کرنے کا ایک نیا انداز۔ عوام کے فیصلے، عوام کے سامنے اور ساتھ بیٹھ کر کرنے کا اعلان۔ یہ پاکستانی سیاست میں ایک بالکل نیا انداز تھا۔ 22 جون 1966ء کو لاہور کا ریلوے سٹیشن عوامی جم غفیر کے ان نعروں سے گونج اٹھا:

''امریکی سامراج مردہ باد''

''امریکی امداد مردہ باد''

''پاک چین دوستی زندہ باد''

''چیئرمین ماؤ زندہ باد''

''ایوب خان مردہ باد''

''بھٹو کو واپس لو، بھٹو قوم کا سرمایہ ہے''

''بھٹو کو واپس لو، بھٹو ہماری غیرت ہے''

لاہور کے ریلوے سٹیشن پر عوام کے اس شاندار تاریخ ساز اجتماع میں سینکڑوں ترقی پسند سیاسی

www.bhutto.org

کارکن اور دانشور بھی شامل تھے جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستان میں ترقی پسندانہ بنیادوں پر ایک نئے سماج کی تشکیل کا ارادہ کرلیا تھا۔ جذباتی ماحول کے سبب لاہور کے ریلوے سٹیشن پر ابھرتے ہوئے عوامی قائد کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تو جس رومال سے نوجوان قائد نے آنسو پونچھے اس کو ایک نوجوان نے دس ہزار روپے میں خرید کر اپنے قائد کے ساتھ عقیدت کا اظہار کیا اور اس کے بعد قوم نے اپنے قائد کا لاڑکانہ اور کراچی میں اسی طرح عوامی استقبال کر کے اقتدار کے ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایوب حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے اس قدر شاندار استقبال سے گھبرا گئی۔ یہ حکومت کی توقع سے بڑا استقبال تھا بلکہ بھٹو کے ان استقبالیہ اجتماعات نے اب ایک عوامی تحریک (Mass Movement) کی شکل اختیار کرنی شروع کردی تھی۔

www.bhutto.org

پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام

یہ امر واضح ہے کہ جنگیں انقلابات کو بھی جنم دیتی ہیں۔ جیسے جنگِ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوم نے جس طرح عالمی سیاست کو یکسر بدل کر رکھ دیا اسی طرح علاقائی جنگیں بھی خطوں کے سیاسی نظاموں کو بدلنے کا سبب بنتی ہیں۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ نے بھی پاکستان اور بھارت کے حکمران طبقات کی اصل تصویر عوام کے سامنے بے نقاب کر کے رکھ دی۔ اس جنگ کا پاکستان کی سیاست پر حیرت انگیز حد تک اثر مرتب ہوا اور یہ وہ دور تھا جب دنیا بھر میں سوشلزم کی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ حتیٰ کہ یورپ طالب علموں کی تحریکوں کا مرکز بن چکا تھا جن کا رجحان ترقی پسندی پر مبنی تھا۔ پاکستان کے دونوں حصوں مشرقی اور مغربی پاکستان میں بھی ایک عوامی تحریک کا پودا لگ چکا تھا جس کو ہزاروں ترقی پسند سیاسی کارکنوں اور درمیانے طبقے کے دانشوروں نے اپنی طویل صبر آزما جدوجہد کے ذریعے ایک سیاسی تحریک کی شکل دی تھی۔ ایسے میں جاگیردار طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوان ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے طبقے سے بغاوت کر کے نچلے طبقات کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا۔ اس وقت پاکستان میں مزدور تحریک اور نوجوان طالب علم کسی بھی سیاسی تحریک کے ہراول دستے کا کردار ادا کرنے میں پیش پیش تھے۔ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان میں مزدوروں اور نوجوانوں کی طرف سے ایک Radical تحریک وجود میں آئی تھی۔ تحریک کے ہراول دستے طالب علم، نوجوان اور مزدور تھے اور عوام میں اجتماعی سیاسی شعور اپنی انتہا پر تھا۔ مختلف ٹریڈ یونینز پر پاکستان کے بائیں بازو کا اثر تھا جو کہ عوامی تحریک میں شامل ہو چکی تھیں۔ اسی طرح نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن مغربی پاکستان میں طلبا کی مقبول ترین طلبا تنظیم تھی۔ ملک بھر کی یونیورسٹیوں اور کالجوں حتیٰ کہ سکولوں کے سینئر طلبہ میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن ایک نمائندہ تنظیم جانی جاتی تھی جو کہ چین نواز یا ماؤ اسٹ افکار پر یقین رکھتی تھی۔ یہی وہ پہلا پلیٹ فارم تھا جس نے ذوالفقار علی بھٹو کو عوامی رابطے کے لیے خوش آمدید کہا تھا۔ این ایس

www.bhutto.org

ایف کی قیادت شعلہ بیاں ترقی پسند اور ریڈیکل نظریات کے حامل معراج محمد خان جیسے نوجوان کر رہے تھے۔ یہ دور پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بدلتے ہوئے سماجی رجحانات کا دور تھا۔ ایسے میں اقتدار سے بغاوت کرنے والے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو ملک بھر میں پذیرائی مل رہی تھی۔ گو حکومت نے اپنے وزیرِ خارجہ کو طویل رخصت پر بھیجا تھا تا کہ وہ اپنا ''علاج'' کروا سکے لیکن عوام کو علم تھا کہ درحقیقت بھٹو کا اب حکومت میں عمل دخل ختم ہو چکا ہے۔ ایوب خان نے اپنے وزیرِ خارجہ کو بار بار خاموش رہنے کی درخواست کی تھی تا کہ بھٹو عوام میں بنیادیں نہ بنا پائیں۔ مغربی پاکستان کے گورنر امیر محمد خان آف کالا باغ نے اپنے روایتی مدمقابل ذوالفقار علی بھٹو کی گورنر ہاؤس لاہور میں رسمی دعوت کا بھی اہتمام کیا۔ عوام کے مقبول راہنما ذوالفقار علی بھٹو نے کھو کھلے نظام کے رکھوالوں کو پریشان کر رکھا تھا جبکہ دوسری طرف امیر محمد خان، ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے ''پیغام رساں'' کے ذریعے خاموش رہنے کے پیغامات بھی بھیج رہا تھا مگر شہروں، قصبوں اور دیہات میں ذوالفقار علی بھٹو ایک جلتا ہوا موضوع بن چکا تھا جس کی شخصیت امریکہ دشمن، کشمیر کی آزادی کا علمبردار، چین کے ساتھ دوستی کا معمار، تیسری دنیا کے مقبول راہنماؤں کا دوست اور ایک ترقی پسند راہنما کے اثرات لیے ہوئے عوام پر اپنا رنگ جما رہی تھی۔

8 جولائی 1966ء کو ان کے استعفےٰ کی خبر کے بعد 15 جولائی کو ذوالفقار علی بھٹو بیرونِ ملک روانہ ہو گئے۔ اس دورے میں وہ جرمنی، ترکی، فرانس، بلغاریہ، مصر، برطانیہ، لبنان اور جنیوا میں پاکستانی دانشوروں، نوجوانوں، بیرونِ ملک زیرِ تعلیم پاکستانیوں اور غیر ملکی راہنماؤں سے ملاقاتیں کر کے اپنے مستقبل کے سیاسی لائحہ عمل کا تعین کر رہے تھے۔ ترکی میں کمال اتاترک کے ساتھی چیئرمین ری پبلکن پیپلز پارٹی جناب عصمت انونو سے بھی ان کی ملاقات ہوئی جن کی پاکستان کے ابھرتے ہوئے عوامی قائد ذوالفقار علی بھٹو سے بے انتہا توقعات وابستہ تھیں جبکہ برطانیہ میں اپنے عظیم محسن لارڈ برٹرینڈ رسل سے طویل ملاقاتیں ان کے سیاسی فیصلوں پر فکری اثرات کا سبب بنیں۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے قاہرہ میں ذوالفقار علی بھٹو کا سرکاری استقبال کر کے بھٹو کے تیسری دنیا کے ابھرتے ہوئے سیاسی کردار پر مہر ثبت کر دی۔

پیرس میں ذوالفقار علی بھٹو نے سابق پاکستانی سفارتکار جے اے رحیم کے ساتھ طویل ملاقاتوں میں مستقبل کی سیاسی پارٹی کا ڈرافٹ تیار کیا۔ جے اے رحیم کا رجحان سوشلزم، سیکولرازم اور جدیدیت کی طرف تھا۔ اکتوبر 1966ء میں جے اے رحیم اور ذوالفقار علی بھٹو نے مجوزہ پارٹی کا جو ڈرافٹ تیار کیا وہ ایک ترقی پسند، غیر طبقاتی نظام اور استعمار دشمن سیاسی نظریات پر مبنی جماعت کا منشور تھا۔ برطانیہ

www.bhutto.org

میں مقیم پاکستانیوں نے جس طرح ذوالفقار علی بھٹو کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اس سے محسوس کیا جارہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی آواز اب پاکستان کے کروڑوں عوام کی آواز بن چکی ہے۔ اکتوبر میں وہ کابل کے راستے پاکستان واپس آئے۔ کابل میں ان کو ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو آف پاکستان نے راولپنڈی میں کھانے کی دعوت پہنچائی۔ پاکستان کے حکمران ذوالفقار علی بھٹو کی واپسی سے شدید خوفزدہ تھے۔ پشاور کے ہوائی اڈے پر اترتے ساتھ ہی ڈی آئی جی پولیس انور آفریدی نے کھانے کی دعوت کا پیغام پہنچا دیا۔ کھانے کی اس دعوت میں بھٹو کے دوست وزیر صنعت الطاف حسین مرحوم نے ایک ثالث کا کردار ادا کرنا چاہا۔ دراصل ایوب خان، بھٹو کو اگلے انتخابات سے دور رکھ کر اپنی شرائط پر ان کو پاکستان میں لوگوں سے رابطے کی اجازت دینے پر رضا مند تھے۔ پاکستان واپس پہنچنے پر بھٹو کے عوامی استقبالیہ اجتماعات کا دوبارہ آغاز ہو گیا۔ اسی دوران وہ ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔ 20 نومبر 66ء کو ڈھاکہ میں پریس کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> ''پاکستان مسلم لیگ نے ایک منشور بنایا تھا جس کے مطابق پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانا ہے تاکہ اس ریاست کی اساس اسلامی تصورات پر ہو۔ اس کے طریق کار کے متعلق اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن اصل مقصد کی حقانیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرے داخلی اور خارجی نظریات سب پر عیاں ہیں۔ میں ملک کے دونوں حصوں میں اقتصادی مساوات چاہتا ہوں اور ساتھ ہی میرا نظریہ یہ ہے کہ ملک کے اندرونی معاملات میں ہر قسم کی مداخلت ناقابلِ برداشت ہے۔ کسی قوم پر دوسری قوم کی حکومت نہیں ہونی چاہیے۔ نوآبادیاتی نظام اور سامراجیت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ وہ بنیادی مسائل ہیں جن کا تعلق صرف پاکستان سے ہی نہیں بلکہ افریقہ اور ایشیا کے تمام ممالک اور ساری دنیا کے لیے ضروری ہے۔''

ذوالفقار علی بھٹو نے اس عرصہ میں پاکستان کے متعدد بار دورے، پریس کانفرنسوں، دانشوروں، نوجوانوں اور طالب علموں کے اجتماعات سے خطابات کے دوران اپنے سیاسی نظریات اور مجوزہ سیاسی جماعت کے خدوخال پیش کر کے عوامی رائے عامہ اپنی حمایت میں تبدیل کر لی تھی۔ کنونشن مسلم لیگ کے مرکزی سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے بھٹو کو طاقت کی سیاست کا بھی ایک تجربہ حاصل تھا۔ اس بنیاد پر روایتی

www.bhutto.org

سیاستدانوں کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم بھی قائم ہو چکے تھے لیکن ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی سیاسی تحریک کے نئے مرحلے میں ایک بالکل نئی اور شفاف ٹیم کے ساتھ نمودار ہونے والے تھے جن کے نام پاکستان کی قومی سیاست میں بالکل نئے تھے۔ ترقی پسند دانشوروں اور سیاسی کارکنوں کی ایک ٹیم جن کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔ حکمران اور روایتی سیاستدان، بھٹو کی ٹیم کو غیر معروف سمجھ کر سیاست سے ناآشنا قرار دے رہے تھے لیکن قدرت نے اس نئی عوامی قیادت کی ذمہ داری کا فیصلہ کر لیا تھا جبکہ حکمرانوں کی اب بھی یہ کوشش تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ سودے بازی کی جائے اور ان کو پیشکش کی گئی کہ وہ فرانس میں سفیر کی حیثیت سے کام کر سکتے ہیں مگر ذوالفقار علی بھٹو نے ان تمام پیشکشوں کو ٹھکراتے ہوئے پاکستان کے عوام کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر منظم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ذوالفقار علی بھٹو میں Sense of Timing کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ یہ دور ایک نئی ترقی پسند سیاسی جماعت کی تشکیل کے لیے آئیڈیل دور تھا کیونکہ اس وقت دنیا بھر میں ترقی پسند سیاست کی لہر تھی۔ 23 نومبر 1966ء کو Y.M.C.A ہال لاہور میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجتماع میں ذوالفقار علی بھٹو نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''افریشیائی اتحاد کے لیے بن باﷲ، ابوبکر تفاوی، احمد سوئیکارنو اور دوسرے راہنماؤں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ افریشیائی ممالک غربت کے خاتمے، غیر ملکی تسلط اور مداخلت سے نجات اور حصولِ انصاف کی جدوجہد میں ضرور کامیاب ہوں گے اور کوئی طاقت ان کے آہنی عزم کو متزلزل نہ کر سکے گی۔''

30 نومبر 1967ء کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر نئی پارٹی کی تشکیل کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کے قافلۂ سیاست کا ایک تاریخ ساز اجلاس ہوا جس نے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نیا سنگِ میل نصب کر کے پاکستان میں عوام کی سیاست کو رائج کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اتنا بڑا اور انمٹ کردار ادا کرنے والوں میں تقریباً کوئی بھی قومی اور مقتدر راہنما شامل نہ تھا۔ ان تاریخ ساز سیاسی کارکنوں نے حیران کن کارنامہ سرانجام دیا جس نے پاکستان کے نوآبادیاتی نظام اور جاگیردارانہ سیاست میں بڑا شگاف ڈال دیا۔ پہلے اجلاس میں جن باقاعدہ مندوبین کا اعلان کیا گیا وہ درج ذیل ہیں:

میر رسول بخش تالپور، شیخ محمد رشید، جے اے رحیم، بیگم آباد احمد خان، کامریڈ غلام احمد، خان محمد حیات خان، پیر بخش بھٹو، میر حامد حسین، عبدالوحید کٹپر، نثار احمد خان، معراج محمد خان، خورشید حسن میر، ممتاز کاہلوں، عبدالرزاق سومرو، شوکت علی جونیجو، غازی قدرت اللہ، مولوی محمد یحییٰ، میاں محمد اسلم، مرتضیٰ

کبیر، امان اللہ خان، راجہ منور احمد، ملک محمد پرویز، فاروق بیدار، احمد رضا خان قصوری، عبدالرحمٰن، ملک نوید احمد، محمد احسن اور ملک حامد سرفراز۔

اس کنونشن میں متعدد سیاسی کارکنوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت اور سوشلزم پر روشنی ڈالی۔ اس کنونشن کی صدارت ذوالفقار علی بھٹو نے کی جبکہ دیگر تقریروں کے علاوہ اسلم گورداسپوری اور ڈاکٹر حلیم رضا نے اپنی انقلابی نظموں سے نئی پارٹی کے مندوبین کو مستفید کیا۔ ادیبوں میں سے ڈاکٹر انور سجاد نے اس تاریخی کنونشن میں شرکت کی۔ اڑھائی سو افراد نے لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر دراصل ایک عوامی تحریک کی بنیاد رکھ دی تھی جس پر حکمران اور جاگیردار روایتی سیاستدان اس اقدام کو ایک غیر حقیقت پسند اور کامیابی سے دور قدم قرار دے رہے تھے اور ساتھ ہی حکومت کی طرف سے ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اخبارات و رسائل میں پراپیگنڈا کی ایک بھرپور مہم بھی جاری تھی۔ 30 نومبر اور یکم دسمبر 1967ء کو چار اجلاسوں میں پارٹی کے تمام خدوخال طے کر کے پارٹی کی بنیادی دستاویز تیار کر لی گئی اور پارٹی کا چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو منتخب کیا گیا۔

تاسیسی اجلاس میں نئی پارٹی کے تین درج ذیل نام تجویز کیے گئے:

(1) People's Progressive Party (P.P.P)

(2) People's Party(P.P)

(3) Socialist Party of Pakistan (S.P.P)

لیکن کنونشن نے تینوں مجوزہ ناموں کو مسترد کر کے نئی پارٹی کا نام پاکستان پیپلز پارٹی (Pakistan People's Party) منظور کر لیا۔ اجلاس میں پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے کی بھی منظوری دی گئی جو تین رنگوں، سرخ، سیاہ اور سبز برابر حصوں میں تقسیم ہے اور درمیانے یعنی سیاہ حصے میں چاند ستارہ سفید رنگ سے بنا ہوا ہے۔ پارٹی کی بنیادی دستاویز نمبر 5 کے مطابق جو راہنما اصول قرار دیے گئے ان کے مطابق پارٹی کے قیام کا پہلا مقصد یہ ہے کہ:

"The aim of the party is the transformation of Pakistan into a socialist society in conformity with the aspirations of the people."

جبکہ دوسرے دو راہنما اصول درج ذیل ہیں:

(A) Egalitarian democracy that is a classless society, and

(B) The application of socialist ideas to realize economic and social justice.

www.bhutto.org

پارٹی کے چار بنیادی ستون طے کیے گئے جو پاکستان پیپلز پارٹی کے سیاسی فلسفے کا نچوڑ ہیں:

(1) اسلام ہمارا دین ہے۔

(2) جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

(3) سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

(4) طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے جاگیرداری کے مکمل خاتمے، کرپشن، صحافت پر پابندیاں، انسانی حقوق کی خلاف ورزی، آزاد خارجہ پالیسی، دوطرفہ بنیادوں پر بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات، تیسری دنیا کی آزادی پسند تحریکوں کی حمایت، سامراج کے استحصالی کردار کی مخالفت، ہر قسم کے اندرونی و بیرونی استحصال کے خاتمے، تعلیم، صحت، روزگار، رہائش اور انصاف کے حوالے سے اپنا انقلابی منشور پیش کیا۔ اس کے علاوہ بنیادی دستاویز میں آسام کے مسئلے کا حل، قبرص کے مسئلے پر ترکی کی حمایت، ویتنام کے عوام کی حمایت، مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور امریکہ کے گھناؤنے کردار کی مخالفت، فلسطینیوں اور عربوں کی حمایت، تیسری دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کا اعلان بھی کیا۔ بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کا منشور، اقلیتوں کا تحفظ اور پاکستان کے مضبوط دفاع کے ساتھ ساتھ عوامی فوج یا ملیشیا کے قیام کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ یہ منشور پاکستان میں جدیدیت، ترقی، خوشحالی، تبدیلی، جمہوریت اور سماجی انصاف پر مبنی ایک انقلابی منشور ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے تاسیسی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے کہا:

> ''ہم تمام رکاوٹیں توڑتے ہوئے عوام کے پاس جائیں گے۔ ہم عوام کے پاس سیکھنے اور سکھانے کے عمل کے تحت جائیں گے۔ جب عوام متحرک ہو جائیں گے تب ہم آگے کی جانب اکٹھے بڑھیں گے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے مقاصد کے حصول کی تکمیل کے لیے۔ لہٰذا پارٹی کے اراکین کو چاہیے کہ آپ عوام کے مسائل کو بغور سمجھیں اور اپنی پارٹی کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اس طرح عوام دوست راستوں پر بھی چلیں گے اور ہمیں اپنی کمیاں اور غلطیاں درست کرنے کا بھی موقع ملے گا۔''

> ''ہم رسومات کا احترام کرتے ہیں لیکن بے ہودہ رسومات کا نہیں۔ ہم صرف

ایسی رسومات کا احترام کریں گے جو عوام کے مفادات میں ہوں۔ ایسی فرسودہ رسومات کو برداشت نہیں کر سکتے جو ملک کو تباہی کے عمیق گڑھوں میں دھکیل دیں۔ ہم پاکستان کو ایک نئی شکل دینا چاہتے ہیں یعنی ایک انقلابی پاکستان۔"

پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک جدید سماج کی تعمیر کا اعلان کیا۔ ایک روشن خیال جمہوری اور خوشحال سماج جو قبائلی، جاگیرداری، سرمایہ داری نظام اور جاگیردارانہ ثقافت سے پاک ہو۔ درحقیقت پاکستان پیپلز پارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستان کے عوام کی نئی سوچ، نئی ثقافت اور نئے رجحانات طے کرنے کا بھی بیڑا اٹھالیا تھا۔ یہ ایک مشکل، پیچیدہ اور طویل جدوجہد کا راستہ تھا جو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے ترقی پسند ساتھیوں کے ساتھ طے کرنے کا عہد کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ مختلف ادوار میں مہاتما گاندھی، قائدِ اعظم محمد علی جناح اور بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی لیکن ان تینوں راہنماؤں میں سے کسی ایک نے بھی نئی پارٹی تشکیل نہیں دی۔ ذوالفقار علی بھٹو برصغیر کا واحد پاپولر لیڈر ہے جس نے ایک نئی جماعت کی تشکیل کی۔ یقیناً یہ ایک مشکل کام ہے۔ جمہوری سیاسی جماعتیں عوام کے ایسے ادارے ہوتے ہیں جو سماج کے مختلف رنگوں، نسلوں، فرقوں اور زبان رکھنے والے لوگوں کو ایک سیاسی فلسفے پر منظم کرتی ہیں۔ سیاسی جماعت کی تشکیل خود ایک بڑا کارنامہ ہے جو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے بے وسیلہ ساتھیوں کے ساتھ سرانجام دیا۔ ان ساتھیوں میں ڈاکٹر مبشر حسن، معراج محمد خان، شیخ محمد رشید، ملک حامد سرفراز، محمود علی قصوری، حق نواز گنڈا پور، امان اللہ خان، حیات محمد خان شیر پاؤ، محمد حنیف رامے، خورشید حسن میر اور ممتاز احمد کاہلوں جیسے سیاسی کارکن پیش پیش تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی تشکیل ایک آئیڈیل سیاسی شعور کے دور میں کی گئی۔ دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی ترقی پسند تحریک ایک پاپولر تحریک بن چکی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان کے شہر شہر، قصبات اور بڑے دیہاتوں میں خود جا کر پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیمیں بنائیں۔ عموماً پی پی کی تشکیل کا طریق کار یہ تھا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کسی شہر میں جاتے تو وہاں پر موجود ترقی پسند سیاسی کارکن اتفاقِ رائے سے اپنی نئی جماعت کی تنظیم و تشکیل کرتے۔ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان پیپلز پارٹی کا کیڈر بنانے میں قطعاً کوئی مشکل نہ کرنی پڑی بلکہ مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کے ہزاروں کارکن اور دوسرے ترقی پسند اور نہایت پختہ سیاسی شعور رکھنے والے سیاسی کارکن عوامی قائد ذوالفقار علی بھٹو کو مغربی پاکستان کے کونے کونے میں از خود پی پی کی تنظیمیں تشکیل دے کر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ملک بھر میں

کالجوں کے طلبا کی بڑی تعداد اور نوجوانوں، مزدوروں اور محنت کشوں نے شہروں میں بڑی تعداد میں ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی کا کارکن بننے کا فیصلہ کیا۔ یہی ایک نیا سیاسی کیڈر تھا جو ذوالفقار علی بھٹو کے نئے سیاسی کردار سے متاثر ہوا تھا جو کہ عالمی تناظر میں ناصر، سوئیکارنو، ماؤزے تنگ، ہوچی منہ اور چواین لائی جیسے راہنماؤں سے نظریاتی و جذباتی حد تک لگاؤ رکھتے تھے۔ پاکستان کے شہروں کے فیصلوں کی تائید و حمایت ملک کے دیہاتوں نے بھی کی۔ سرداری، قبائلی اور جاگیردارانہ نظام میں سسک سسک کر زندگی گزارنے والے ہاریوں، مزارعوں اور کسانوں میں ذوالفقار علی بھٹو کے روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے نے نئی زندگی کی امید پیدا کی۔ پنجاب اور سندھ کے کسانوں میں ذوالفقار علی بھٹو اسی طرح ہیرو بن کر ابھرا جیسے شہروں کا ہیرو۔ جگہ جگہ جا کر نئی پارٹی کا قیام، پاکستان کے عوام کے لیے ایک نیا تجربہ اور نیا اندازِ سیاست تھا۔ وگرنہ ماضی میں جس طرح حکومت اور سیاست کے فیصلے ڈرائنگ رومز میں ہوتے تھے اسی طرح حکمران مخالف روایتی جاگیردار سیاستدان بھی اپنی پارٹیوں کی تشکیل سرکاری ایوانوں اور حویلیوں میں ہی کرتے تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے پاکستان میں جاگیرداری، قبائلی اور سرمایہ داری نظام کے مکمل خاتمے کا اعلان کر کے شہروں اور دیہاتوں میں جلد ہی پاپولر تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ پی پی پی کی اعلیٰ قیادت سے لے کر نچلی قیادت تک نے سوشلزم کو پاکستان کے فرسودہ نظام سے نجات کا راستہ قرار دیا جس کو عوام میں بھرپور انداز میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سوشلزم پاکستانی سیاست کا مقبول ترین نعرہ بن گیا اور اسی طرح سوشلسٹ چین پاکستانی عوام کا آئیڈیل بنا۔ پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں جہاں پر اوہام پرستی اور غلامانہ جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی سوچ کو مسلط کیا گیا' یہ سیاسی فلسفہ حکمران طبقات کے لیے ایک کھلی بغاوت تھی۔ اسی لیے ایوب حکومت نے جس طرح نئی پارٹی کے خلاف پراپیگنڈا مہم کا آغاز کیا اسی طرح جاگیرداری نظام کے ظلم پر خاموش رہنے والے ملاؤں نے پی پی پی کی فکری سیاست کو غیر اسلامی اور کفر قرار دیا۔ تمام اختلافی فکر رکھنے والے ملاؤں نے ایک آواز ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے شروع کر دیئے لیکن ذوالفقار علی بھٹو اور اس کے ترقی پسند ساتھیوں نے مذہبی استحصال کرنے والے ملاؤں کا فکری لحاظ سے بھی شاندار مقابلہ کیا۔ محمد حنیف رامے، شیخ محمد رشید، خورشید حسن میر، ملک حامد سرفراز اور خود ذوالفقار علی بھٹو سمیت لاتعداد دانشوروں نے فکری محاذ پر ملاؤں کی کمزور اور فرسودہ عوام دشمن سوچ کو عملی طور پر شکست دی۔ اس فکری و علمی بحث میں ہزاروں ترقی پسند دانشوروں، صحافیوں اور ادیبوں نے ملائیت اور رجعت پسندی کی ٹوٹتی ہوئی سوچ کو شکست دینے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان کے عوام کو پاکستان پیپلز پارٹی

www.bhutto.org

کی شکل میں ایک نیا پلیٹ فارم میسر آ گیا اور یوں پی پی پی نے معاشرے کے پسماندہ طبقات کو باقاعدہ سیاسی بنیادوں پر منظم کرنے کا ایک تاریخی فریضہ سرانجام دیا۔ کسان، صنعتی مزدور، طلبہ، نوجوان، خواتین، نچلے اور درمیانے طبقات پاکستان پیپلز پارٹی کے پرچم تلے اکٹھے ہو گئے جبکہ اپر مڈل کلاس اور مڈل کلاس کے رجعت پسند حلقے اور اوپری طبقہ جن میں جاگیردار، افسر شاہی، بڑے تاجر، سرمایہ دار اور مُلّا، بھٹو اور اس کی پارٹی کے خلاف طبقاتی طور پر اکٹھے نظر آنے لگے۔ اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان اور ایوب خان کے دستِ راست جنرل موسیٰ نے پیپلز پارٹی کے پرچم تلے منظم عوامی قوت کے بارے میں جو رائے دی اس سے اوپری طبقے کی سوچ واضح ہوتی ہے۔ جنرل موسیٰ نے کہا:

''ذوالفقار علی بھٹو کے جلوسوں میں تانگہ، رکشا، ٹیکسی اور گدھا گاڑیوں والے ہی شامل ہوتے ہیں۔''

چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے رابطۂ عوام مہم کے ذریعے پورے ملک خصوصاً سندھ اور پنجاب میں عوامی دوروں کا مسلسل آغاز کیا۔ ملتان کے ایک دورے کے دوران معروف جاگیردار نواب صادق حسین قریشی کے حکم پر بھٹو پر ایک قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔ یہ حملہ قادر پور راں کے مقام پر ہوا۔ جب حملہ آوروں نے ذوالفقار علی بھٹو کی کار کو روکا تو وہ کار سے باہر نکل کر غنڈوں پر بھی برسے اور تماشائی پولیس پر بھی۔

31 دسمبر 1966ء کو ایوب خان کی حکومت کی طرف سے بیشتر سیاستدانوں پر سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کا قانون ایبڈو (E.B.D.O) یعنی Elective Bodies Disqualification Order از خود اپنی مدت پوری کرنے کے بعد ختم ہو چکا تھا اور اس طرح اپوزیشن کے اکثر سیاستدان سیاست کے میدان میں کھل کر حصہ لینے کے اہل ہو گئے تھے۔ اپوزیشن کے محاذ پر پی۔ ڈی۔ ایم (Pakistan Democratic Movement) نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور پارلیمانی نظام حکومت کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ پی ڈی ایم کی آواز نے بھی ایوب حکومت کو دھچکا لگایا۔ اسی لیے ایوب خان بار بار عوام کو متنبہ کر رہا تھا کہ

''وہ اپوزیشن کی سازشوں اور چالوں میں نہ آئیں۔ وہ ملکی سلامتی اور خوشحالی میں دلچسپی نہیں رکھتی۔''

پاکستان کے دونوں حصوں مغربی و مشرقی پاکستان میں عوامی سطح پر ایوب حکومت کے خلاف نفرت زور پکڑ رہی تھی۔ حکومت کے خلاف عوامی نفرت کی بنیاد چند ہاتھوں میں دولت کی گرفت، کرپشن، امریکہ نواز اور آمرانہ نظامِ حکومت تھی۔ مغربی پاکستان میں لوگ ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں طبقاتی شعور کا مظاہرہ کر رہے تھے جنہوں نے پی پی پی کی بنیاد رکھ کر کھل کر شدت کے ساتھ سوشلزم کا نعرہ بلند کیا۔

www.bhutto.org

اس طرح مغربی پاکستان میں طبقاتی جدوجہد اپنی انتہا پر تھی جس میں ملوں کے مزدور، طلباء، نوجوان، خواتین اور لوئر مڈل کلاس کے محنت کش طبقات پیش پیش تھے۔ یہ ایک Pre-revolutionary صورتحال تھی۔ مغربی پاکستان میں یہ دور سیاسی شعور کے لحاظ سے طبقاتی کشمکش کا دور تھا۔ مغربی پاکستان کے عوام سماج کا ڈھانچہ تبدیل کر کے نیا اور جدید سماجی نظام تشکیل دینے کے لیے عملی طور پر تیار ہو چکے تھے اور اس عوامی جدوجہد کا رجحان Anti-Imperialist بھی تھا جبکہ مشرقی پاکستان میں عوام قومی مسئلے کے حوالے سے بغاوت پر آمادہ ہو رہے تھے۔ ان کے نزدیک مغربی پاکستان ان کی غربت اور استحصال کا سبب تھا۔ مغربی پاکستان کی فوج میں بالادستی، سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اکثریتی آبادی کے حامل مشرقی پاکستان کے حقوق کو سلب کیے ہوئے تھی بلکہ ان کا زبان اور تعلیم کے مسئلوں پر ثقافتی استحصال بھی ہو رہا تھا۔ ان دنوں عوامی لیگ کے راہنما شیخ مجیب مشرقی پاکستان میں مقبول لیڈر کے طور پر ابھر رہے تھے۔ مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی جو کہ ایک ترقی پسند چین نواز جماعت تھی مشرقی پاکستان میں غیر مقبول ہوتی جا رہی تھی۔ ملک کے دونوں حصوں میں ایوب حکومت کے خاتمے کے نقطے پر عوام اکٹھے ہو رہے تھے۔

پنجاب اور سندھ میں ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور، سرگودھا، چنیوٹ، لائل پور (فیصل آباد)، ملتان، سیالکوٹ، قصور، پشاور، راولپنڈی، کراچی، لاڑکانہ، حیدرآباد، شکارپور، چکوال، جہلم، مردان، کوہاٹ، چوہڑکانہ، شورکوٹ، ساہیوال سمیت پورے ملک کے شہروں اور بڑے قصبات میں خود جا کر اپنی پارٹی کی تنظیم اور ایوبی آمریت کے خلاف بغاوت، نئے سماج کی تشکیل اور امریکی سامراج کے تسلط کے خلاف علم بلند کیا۔ عوامی قیادت کے اس انداز نے ملک میں پھیلے ہوئے شہروں، قصبوں اور دیہات کو ایک عوامی سیاسی اور نظریاتی لڑی میں پرو دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی اجتماعات میں عوام کی سیاسی تربیت کا انداز اپنایا۔ انہوں نے اپنی تقاریر میں عوامی بیداری کو اجاگر کیا۔ 22 جنوری 1968ء کو سرگودھا بار ایسوسی ایشن میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> ''جب میں وزیر خارجہ تھا تو بین الاقوامی معاملات میں پاکستان کا وقار بہت بلند تھا۔ دنیا بھر کے ممالک پاکستان کی حمایت کرتے تھے اور جنگ کے دوران بھارت تنہا رہ گیا تھا جس کا اعتراف لعل بہادر شاستری (ہندوستان کے وزیر اعظم) نے بھی کیا تھا لیکن اب صورتحال تبدیل ہو چکی ہے۔ اب کوئی واضح طور پر پاکستان کا ساتھی نہیں رہا۔ ایوب خان کی حکومت بار بار اصولوں سے

انحراف کرتی ہے جس کے نتیجے میں ہمارے بین الاقوامی تعلقات پر برا اثر پڑ رہا ہے اور کمزور خارجہ پالیسی کی وجہ سے مسئلۂ کشمیر کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔"

اس وقت پورے ملک میں سوشلزم، ذوالفقار علی بھٹو اور پی پی پی کے حوالے سے بحث چل رہی تھی۔ یہ بحث کھوکھوں، ٹی سٹالوں، قہوہ خانوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، بار روموں اور سڑکوں کی نکڑوں پر روایتی عوامی ڈیروں پر اپنے عروج پر تھی کہ مسٹر بھٹو کس نظام کے داعی ہیں اور وہ نظام کس طرح ایک اسلامی معاشرے میں عمل پذیر ہو سکتا ہے؟ پی پی پی، ایوب آمریت کو ختم کر کے کس طرح عوامی جمہوریت کی داغ بیل ڈال سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ سرگودھا میں وکیلوں کے گروپ سے باتیں کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو نے کہا:

"پیپلز پارٹی کیمونسٹ پارٹی نہیں ہے بلکہ ایک سوشلسٹ پارٹی ہے اور ان کے خلاف جو شرمناک مظاہرے کرائے جا رہے ہیں وہ سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہیں اور وہ ان سے کبھی بددل نہ ہوں گے اور عوام پر بھروسہ کرتے ہوئے گاؤں گاؤں شہر شہر جا کر اپنا پیغام پہنچائیں گے۔"

مسٹر بھٹو نے نئی پارٹی کے منشور، پیغام اور نظریئے کو سادہ لفظوں میں عوام کو سمجھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ سوشلزم کا پرچم بلند کرنے پر ملاؤں نے کفر کے فتوے تو صادر کیے لیکن وہ کوئی ٹھوس اور جامع تنقید یا بحث کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ ان کی طرف سے مسٹر بھٹو کی کردار کشی کی گئی۔ ملاؤں نے بھٹو کی مخالفت کو کفر کے خلاف جہاد قرار دیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے تحریکِ پاکستان کے وقت برِصغیر کے مسلمانوں کے متفقہ راہنما قائدِاعظم محمد علی جناح پر ملاؤں نے کفر کے فتوے صادر کر کے ان کو قائدِاعظم کے بجائے "کافرِ اعظم" قرار دیا تھا مگر ذوالفقار علی بھٹو اپنے پیغام و نظریئے کو دلائل کی روشنی میں عوام کے پاس لے کر گئے۔ ملتان میں وکلاء سے مخاطب ہوتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اسلام ہمارا عقیدہ ہے۔ اس کے لیے ہم زندگی بھی قربان کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی پارٹی اسلامی اصولوں پر استوار نہ ہوگی تو وہ پاکستان کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکے گی۔ بانیٔ پاکستان قائدِاعظم اور مفکرِ پاکستان علامہ اقبال اسلام اور سوشلزم کو ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اسلام ہمارا عقیدہ ہے۔ سوشلزم ایک اقتصادی نظام ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کو اپناتے ہوئے اس نظام کی ترویج

www.bhutto.org

نہ ہو سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے عوام استحصال کا شکار ہیں۔ وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ موجودہ نظام نہ آمرانہ ہے نہ جمہوری۔ یہ کئی نظاموں کا ملغوبہ ہے جو ہمارے جذبات کی ترجمانی نہیں کرسکتا۔ ہمیں ایک ٹھوس اور واضح نصب العین کی ضرورت ہے۔"

چائے کی پیالی پر انقلاب برپا کرنے والے کیمونسٹوں نے مسٹر بھٹو کو اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے پر غیر سوشلسٹ قرار دیا۔ چائے کے سٹالوں پر قہوہ خانوں میں بیٹھے دانشور، عوام کے اجتماعی شعور کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اجتماعی شعور، حقیقت پسند اور عملیت پسند ہوتا ہے اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یورپ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک میں اگر کرسچین ڈیموکریٹس پارٹیاں ہوسکتی ہیں تو اسلامی معاشروں میں مسلم سوشلسٹ نظریہ ایک حقیقت پسند نظریہ کے طور پر اپنی حیثیت منوا سکتا ہے۔ ویسے بھی ذوالفقار علی بھٹو کے گرد محمود علی قصوری، مختار رانا، شیخ محمد رشید، حنیف رامے، ملک معراج خالد، امان اللہ خان، خورشید حسن میر، پرویز رشید جیسے لاتعداد سوشلسٹ سیاسی کارکن اور دانشور اکٹھے ہو چکے تھے جو عملی سیاست پر کاربند تھے نہ کہ چائے کی پیالی پر انقلاب برپا کرنے والے دانشور۔ ان کارکنوں نے دلیرانہ اور مردانہ وار سوشلزم کے منشور کو عوامی حلقوں میں ایک عوام دوست نظریہ اور پاکستان جیسے پسماندہ اور اسلامی معاشرے میں قابلِ قبول و عملی نظریئے کے طور پر منوایا۔ مسٹر بھٹو نے ساٹھ کی دہائی کے آخری حصے میں عوامی ترقی پسند جماعت قائم کرکے ایک مستقل عوامی تحریک کی شاہراہ کھول دی۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کے عوامی جنم کا زمانہ ہے۔ جب انہوں نے اپنے خاندانی طبقے (جاگیردار) سے بغاوت کرکے ترقی پسند سیاسی کارکنوں کے ساتھ پاکستان کے مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں، نوجوانوں، طلبا، رکشا، ٹیکسی ڈرائیوروں، تانگہ بانوں، پھٹے پرانے کپڑے پہننے والوں کی قیادت کا آغاز کرکے اپنی غریب ماں کی جھلک اپنی شخصیت میں واضح کردی اور کم عمری میں کارل مارکس سے متاثر ہوکر جو انہوں نے اس کے کیمونسٹ مینی فیسٹو سے غربت کی سیاست سیکھی، اس کا عملی مظاہرہ کر دکھایا۔

www.bhutto.org

ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد

ایوب خان کی حکومت کی گرفت جنگ 1965ء کے بعد آہستہ آہستہ کمزور ہونی شروع ہوگئی اور جب بھٹو عوام میں پاپولر راہنما کے طور پر ابھر کر سامنے آئے تو انہوں نے بوسیدہ نظام کی حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا لیکن جیسے کوئی مریض بیمار ہو تو وہ اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے اسی طرح ایوب حکومت نے اپنی بقا کے لیے طاقت کے مختلف حربے استعمال کر کے اپنی حکومت کی "زندگی اور مضبوطی" کی نام نہاد نوید سنانے کی کوششیں کی۔ اگلے صدارتی انتخابات 1969ء کے آخر میں پروگرام کے مطابق منعقد ہونے تھے لیکن ملک کی کشیدہ سیاسی صورتحال نے مجوزہ صدارتی انتخابات جو Basic Democracy کے نظام کے تحت منعقد ہونے تھے ان کے انعقاد کو ہر گزرتے دن کے ساتھ شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ایوب خان غیر مقبول ہی نہیں بلکہ عوامی نفرت کا نشانہ بن چکا تھا۔ ایوب کے بیٹے گوہر ایوب جس کو فوج سے ریٹائرڈ کروا کر سیاست میں داخل کروایا گیا تھا' کی بدعنوانیاں ملک بھر میں گونج رہی تھیں۔ اسی طرح گوہر ایوب کے سسر جنرل حبیب اللہ کے کاروباری مفادات کے چرچے بھی عام تھے۔ ان واقعات نے ایوب کے خلاف ایک فضا قائم کر دی اور عوام اب تبدیلی چاہتے تھے۔ دولت سکڑ کر چند خاندانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی جیسا کہ حکومت کے چیف اکانومسٹ برائے پلاننگ کمیشن ڈاکٹر محبوب الحق نے 1968ء میں یہ حقیقت بے نقاب کی کہ ملک کے 80 فیصد صنعتی سرمائے اور 97 فیصد بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کے سرمائے پر صرف 22 خاندانوں کا قبضہ ہے۔

ان اطلاعات پر عوام میں ایوب حکومت کے خاتمے کا مطالبہ شدت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا جبکہ حکومت اپنی "دس سالہ ترقی" کا جشن منا رہی تھی اس کو وہ اکتوبر انقلاب (1958ء کی فوجی بغاوت) قرار دے رہی تھی۔ ایوبی حکومت نے اپنے دس سالہ ترقی کا جشن منانے کا اعلان کیا اور اس سلسلے میں ایک

www.bhutto.org

ٹرین پورے ملک میں چلائی گئی، مگر Decade of Development کی یہ ٹرین جس بھی شہر گئی مشتعل طلبہ نے اس کو توڑ دیا۔ ملک بھر میں بغاوت کی چنگاریاں زور پکڑنے لگیں۔ صدارتی نظام، بنیادی جمہوریت، ون یونٹ اور امریکہ نوازی کے خلاف عوام، دانشور اور سیاسی حلقے بیدار ہو چکے تھے۔ پاکستان میں ایک انقلاب جنم لے چکا تھا۔ آزادیٔ پاکستان کی تحریک کے بعد یہ بڑی عوامی بیداری کی لہر تھی۔ چند سال بعد 1979ء میں پڑوسی ملک ایران میں جو انقلاب پھوٹا وہ پاکستان کی اس عوامی تحریک جیسا ہی ایک عوامی ردِعمل تھا اور یہ سیاسی بیداری کسی طرح بھی ایک قبل از انقلاب کی صورتحال سے مختلف نہ تھی۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن ایک مقبول اور قوم پرست راہنما کے طور پر ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی مشرقی پاکستان میں روز بروز عوام میں اپنا اثر کم کرتی چلی جا رہی تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام قومی سوال پر مغربی پاکستان کے خلاف رائے بنا رہے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا چھ نکاتی پروگرام مشرقی پاکستان کے لوگوں کے نزدیک راہِ نجات تصور کیا جانے لگا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھارتی ایجنٹوں کے ساتھ مل کر اگرتلہ سازش کے الزام میں گرفتار کر کے ایوب حکومت نے پابندِ سلاسل کر دیا تھا جو کہ مجیب کے مؤقف کو مضبوط اور درست ثابت کرنے کی ایک احمقانہ حکمت تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات پاکستان کے مغربی حصے میں علیحدگی کی بنیاد سمجھے گئے۔ اسی لیے وہ مغربی پاکستان میں سیاسی مقبولیت حاصل نہ کر سکے جبکہ مشرقی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کوئی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے حالانکہ انہوں نے مشرقی پاکستان میں اپنی پارٹی کی تنظیم کی کوششیں کی تھیں۔

پاکستان میں پہلی عوامی تحریک (Mass Movement) طلبا کے ایک جلوس سے پھوٹی۔ عوامی تحریک کا پہلا مورچہ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد سے چند میل دور راولپنڈی میں لگا۔ پی پی پی کی تشکیل کے ایک سال بعد عوامی لاوا پھوٹ پڑا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو پارٹی کے بانی ساتھی حیات محمد خان کے گاؤں شیر پاؤ سے خطاب کرنے کے بعد پشاور سے راولپنڈی پہنچے تو عوام کے جم غفیر نے اپنے قائد کا تاریخ ساز استقبال کیا جن میں طلبا پیش پیش تھے۔ راولپنڈی کے پولی ٹیکنیک کالج کے طلبا کا ایک جلوس ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کے لیے سابق انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل راولپنڈی پہنچ گیا۔ 7 نومبر 1968ء کو طلبا کے اس جلوس نے پاکستان کی جدید سیاسی تاریخ میں ایک نمایاں سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر لی۔ پرجوش

www.bhutto.org

طالب علم

''ایوبی آمریت مردہ باد''

''جمہوریت زندہ باد''

''ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد''

کے نعرے بلند کرتے ہوئے پولیس کی تمام رکاوٹیں توڑتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھنے لگے تو پولیس نے لاٹھیوں اور آنسو گیس کے شیل برسانے شروع کر دیئے۔ طلبا نے پی پی پی کے سرخ، سیاہ اور سبز رنگ کے پرچم کو ہوٹل پر نصب کر دیا اور ان کا مطالبہ تھا کہ ہم اپنے قائد سے ملاقات کرنے آ رہے ہیں، ہمیں اپنے قائد کو خراج عقیدت پیش کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ پولیس نے لاٹھیوں اور آنسو گیس کے شیلوں سے طلبا کو بری طرح تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد طلبا کے نہتے جلوس پر فائرنگ کر دی جس سے ایک گولی پولی ٹیکنیک کالج کے طالب علم عبدالحمید کی شہادت کا سبب بن گئی۔ جب مسٹر بھٹو وہاں پہنچے تو ہوٹل کے اردگرد کا علاقہ قیامت کا سماں پیدا کر رہا تھا۔ بھٹو نے شہید طالب علم عبدالحمید کی خون سے لت پت لاش کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور تشدد کرنے والی حکومت کے خلاف مزاحمت کا اعلان کر دیا۔ دوسرے دن راولپنڈی کی سڑکوں پر فوج نے گشت شروع کر دیا اور شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ راولپنڈی کے سانحے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور جونہی یہ خبر ملک کے دیگر حصوں میں پہنچی تو عوامی مظاہروں کا سلسلہ چل نکلا۔ کرفیو کے باوجود دوسرے دن بھی راولپنڈی میں مظاہرے مزید شدت اور جوش و جذبے کے ساتھ منظم کیے گئے جن میں خورشید حسن میر پیش پیش تھے۔ دوسرے دن کے مظاہروں کے دوران مزید دو افراد شہید ہو گئے۔ سیاسی کارکنوں اور طلبا کی گرفتاریوں کا آغاز کر دیا گیا۔ 9 نومبر 1968ء کو ذوالفقار علی بھٹو مغربی پاکستان کے ثقافتی، سیاسی اور ادبی مرکز لاہور کی طرف ٹرین کے ذریعے روانہ ہوئے جہاں انہوں نے ایک سال قبل اپنی پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ مسٹر بھٹو نے حکومت کے خلاف مزاحمت کا اعلان کر کے ایک حقیقی عوامی قائد کی حیثیت سے تاریخی فریضہ سرانجام دینا شروع کر دیا۔ ٹرین کے لاہور پہنچنے پر لاہور شہر میں میلے کا سماں تھا۔ ہر قدم ریلوے سٹیشن کی جانب رواں تھا جہاں عوامی تحریک کا قائد ایک طویل جدوجہد کا اعلان کرنے آ رہا تھا۔ 10 نومبر کو جب ذوالفقار علی بھٹو لاہور پہنچ رہے تھے اسی روز فیلڈ مارشل ایوب خان کی سرکاری کنونشن مسلم لیگ کے جلسے میں ایک نوجوان نے ایوب خان پر دو فائر کر دیئے۔ اس واقعہ نے اقتدار پر براجمان آمروں کو فرسٹریٹ کر دیا۔ اس حملے میں ایوب خان کی جان تو محفوظ رہی البتہ

www.bhutto.org

حکومت کی طرف سے اپوزیشن خصوصاً مسٹر بھٹو کے خلاف پراپیگنڈا محاذ کا دائرہ وسیع کر دیا گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو ملک بھر میں عوامی تحریک کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے کہ 13 نومبر 1968ء کو رات کے ڈیڑھ بجے پولیس نے ان کو ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ ممتاز علی بھٹو، غلام مصطفیٰ کھر، ارباب سکندر خان، رسول بخش تالپور، ڈاکٹر مبشر حسن، اجمل خٹک، ملک اسلم حیات، محمد حیات شیر پاؤ، شوکت لودھی، امان اللہ خان اور احمد رضا خان کو بھی گرفتار کیا۔ اس سے دوسرے روز مزید دس راہنماؤں کو گرفتار کیا گیا جن میں محمود الحق عثمانی (سیکرٹری جنرل نیپ) زاہد علی، نواز بٹ، الطاف آزاد، امیر فیصل درانی، اللہ بخش رند، عزیز اللہ ہاشمی، اظہر عباس، منظر حسین اور زین الدین خان شامل تھے۔ پی پی پی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو چونکہ اس وقت پاکستانی سیاست کا محور بن چکے تھے اس لیے ان کی گرفتاری نے عوامی بیداری کی چنگاری کو شعلوں میں بدل دیا۔ مغربی پاکستان میں طلبا اور نوجوان طبقے نے مزدوروں کے ساتھ مل کر شہروں اور قصبات میں تحریک کی قیادت کا فریضہ سرانجام دینا شروع کر دیا۔ روز بروز ریاستی تشدد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان واقعات نے ریٹائرڈ فوجی افسروں کو بھی عوامی جدوجہد کے دھارے میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان جو پاکستان کی فوجی افسر شاہی میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کے واقعہ کے بعد سیاست میں آنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ پہلے مشرقی پاکستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ایس ایم مرشد نے بھی ایوب خان کے خلاف آواز بلند کر دی۔ جنرل ریٹائرڈ اعظم خان بھی اصغر خان کی طرح ایوبی آمریت کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ ان واقعات نے ذوالفقار علی بھٹو کے مؤقف کو مزید تقویت پہنچائی جبکہ آٹھ اپوزیشن جماعتوں نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (D.A.C) کے نام سے ایک نیا محاذ بنا لیا۔ ڈی اے سی نے بھی ایوب حکومت کے نظام کو مسترد کر کے مکمل جمہوریت کا مطالبہ کر دیا۔ ڈی اے سی نے اگلے صدارتی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کرنے کے ساتھ ہی آٹھ مطالبات پیش کر دیے:

(1) وفاقی پارلیمانی نظامِ حکومت۔

(2) براہ راست طریقۂ انتخاب، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر۔

(3) فوری طور پر سٹیٹ ایمرجنسی کا خاتمہ (یہ 1965ء کی جنگ سے چلی آ رہی تھی)۔

(4) فوری طور پر بنیادی حقوق کی بحالی، تمام کالے قوانین کی منسوخی، خصوصی طور پر بغیر مقدمہ چلائے نظر بندی کے قانون کا خاتمہ اور یونیورسٹی آرڈیننس کا خاتمہ۔

(5) تمام سیاسی قیدی، طالب علم، صحافی، صنعتی کارکن، بشمول خان ولی خان، شیخ مجیب الرحمٰن اورذوالفقارعلی بھٹو کی فوری رہائی، تمام سیاسی قیدیوں پر قائم مقدمات کا فوری خاتمہ۔

(6) سیکشن 144 کا خاتمہ۔

(7) صنعتی مزدوروں کو ہڑتال کا حق۔

(8) صحافت پر عاید تمام پابندیوں کا خاتمہ ''چٹان'' اور دیگر جرائد کے ڈیکلریشن کی منسوخی کا خاتمہ۔

ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (ڈی اے سی) میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ سمیت سیکولر اور مذہبی جماعتیں شامل تھیں۔اب شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کی قومی آزادی کے رہبر کے طور پر اپنا مقام بنا چکے تھے جبکہ مشرقی پاکستان کے دوسرے اہم راہنما مولانا عبدالحمید بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے بھی آئندہ انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا۔مولانا بھاشانی نے جو مطالبات پیش کیے وہ درج ذیل ہیں:

(1) بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کروائے جائیں۔

(2) مشرقی پاکستان کو صوبائی خودمختاری دی جائے۔

(3) ون یونٹ سکیم کا خاتمہ کیا جائے۔

مولانا بھاشانی کی یہ رائے بھی تھی کہ دفاع، کرنسی اور خارجہ تعلقات بدستور مرکز کے پاس رہنے چاہئیں۔نیشنل عوامی پارٹی (مولانا بھاشانی گروپ) اور پاکستان پیپلز پارٹی نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (ڈی اے سی) میں شمولیت اختیار کیے بغیر ایوب حکومت کے خاتمے کے مطالبے کو بنیادی حیثیت دی اور اگلے انتخابات کا دونوں جماعتوں نے بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا۔اسی طرح ان دونوں جماعتوں نے ون یونٹ کے خاتمے کا مطالبہ بھی سرفہرست رکھا جبکہ ڈی اے سی نے اپنے مطالبات کے علاوہ بھرپور انداز میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور جدید عوامی جمہوریت، سماجی، معاشی اور اقتصادی انصاف کا نعرہ بلند کیا۔

ذوالفقارعلی بھٹو کی گرفتاری کے بعد ان کی شریکِ حیات محترمہ نصرت بھٹو نے عوامی جلوسوں کی قیادت کا فیصلہ کیا۔نصرت بھٹو کے اس فیصلے نے عوام کے مورال کو مزید بلند کردیا۔مسٹر بھٹو کی گرفتاری کے بعد بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں لاہور میں نکلنے والے جلوس نے حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ان جلوسوں میں طلباونوجوان، مزدور، محنت کش، شاعر، ادیب، دانشور، صحافی اور تانگہ بان ورکشا ڈرائیور

www.bhutto.org

شامل تھے۔ اب حکومتی ہتھکنڈے بے معنی ثابت ہوئے۔ دفعہ 144 کا نفاذ، لاٹھی، گولی، آنسو گیس اور روایتی تشدد کے حربے عوامی جدوجہد کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ عوامی تحریک نے مغربی و مشرقی پاکستان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کے بعد مغربی پاکستان ہائیکورٹ میں نصرت بھٹو نے ایک رٹ پٹیشن دائر کی جسے جسٹس مولوی مشتاق حسین اور جسٹس قاضی محمد گل پر مشتمل ایک سپیشل بنچ نے سماعت کے لیے منظور کر لیا جبکہ جیل میں مسٹر بھٹو کو قواعد وضوابط کے مطابق سہولیات فراہم نہ کی گئیں تاکہ مسٹر بھٹو کے عزم کو کمزور کیا جا سکے لیکن حکومت کے ان اقدامات نے بھٹو اور عوام کے جوش و جذبے میں کمی کے بجائے مزید اضافہ کیا۔ اب اس مقدمے پر عوامی نگاہیں مرکوز ہو گئیں اور ذوالفقار علی بھٹو پاکستانی سیاست کا محور بن گئے۔ مسٹر بھٹو نے نہایت خوبصورت انداز میں عدالت میں اپنے مقدمے کو Politicize کر کے اپنی سیاسی اور آئینی جنگ کو عوامی حمایت کے ساتھ جوڑ دیا۔ انہوں نے عدالت میں ایک حلفی بیان دیا جس میں ٹوٹتے نظام کے جبر اور فرسودہ روایت پر مبنی نوآبادیاتی ڈھانچے کے عوام دشمن کالے قوانین بشمول ڈیفنس رولز آف پاکستان پر سخت تنقید کی۔ مقدمے کی کارروائی نے عوامی تحریک کی شدت میں اضافہ کیا۔ مسٹر بھٹو نے بیانِ حلفی کے آخری پیراگراف میں کہا:

''میری جدوجہد کا منتہیٰ قومی احیاء ہے۔ میں قائدِ اعظم اور اقبال کا جھنڈا سربلند رکھنا چاہتا ہوں تاکہ دنیا پر ثابت کر دیا جائے کہ بارہ کروڑ جیالے عوام کی یہ اسلامی ریاست اوجِ کمال کو پہنچ سکتی ہے اور جس آزادی اور مساوات (Equality) سے اسلام نے تہذیب کا چراغ روشن کیا اس سے بہرہ ور انسانوں کے آدرش کو لباسِ مراد پہنا سکتی ہے۔ میری آواز ہے کہ عدل و انصاف کا وہی نور ایک بار پھر دل افروز تقاضوں کے اجتماع کو سندر کر دے۔ میری آرزو ہے کہ ہمارے عوام اخوت کے جذبے سے سرشار ہو کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوں اور مساوات کی آب و تاب میں یکساں حصہ دار رہیں۔ وقت آئے گا کہ قسمت کا پہیہ گردش کرے گا اور اس کی گردش کے انقلاب سے ایک بہتر مستقبل طلوع ہوگا۔''

مقدمے کے دوران مسٹر بھٹو نے عدالت میں مرکزی حکومت کے ہوم سیکرٹری اے بی اعوان، مرکزی خفیہ پولیس کے ڈائریکٹر ایس اے رضوی اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کے کمانڈر انور آفریدی پر خود جرح کی۔ مسٹر بھٹو کے اس انداز نے ان کو نئے دور کے عوامی لیڈر کے طور پر متعارف کروایا۔

ایوب حکومت نے عوامی تحریک کو De-fuse کرنے کے لیے گول میز کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا اور تمام سیاسی جماعتوں کو مذاکرات کی دعوت دی۔ عوامی لیگ (نوابزادہ نصراللہ گروپ) کے

قائد نوابزادہ نصر اللہ خان مذاکرات پر آمادہ کرنے کے لیے یکا یک متحرک ہو گئے۔ گول میز کانفرنس عوام میں خاص اہمیت نہ پا سکی کیونکہ عوام نام نہاد آئینی و سیاسی اصلاحات سے زیادہ بنیادی انقلابی تبدیلی کے خواہاں تھے جبکہ ایوب حکومت عوام کی انقلابی جدوجہد کے بعد ان پر ''آئینی احسانات'' کا اعلان کر رہی تھی۔ 10 فروری 1969ء کو عدالت نے حکم دیا کہ مسٹر بھٹو کو تا حکم ثانی ان کے آبائی مکان المرتضیٰ لاڑکانہ میں نظر بند کر دیا جائے۔ مسٹر بھٹو کے ساتھیوں اور نصرت بھٹو کے مشوروں کے مطابق انہوں نے جہاز کے بجائے ٹرین کے ذریعے لاڑکانہ جانے کو ترجیح دی۔ 11 فروری کو مسٹر بھٹو بذریعہ ٹرین لاڑکانہ روانہ ہوئے۔ المرتضیٰ پہنچنے کے بعد مسٹر بھٹو اپنے ساتھیوں عبدالوحید کٹپر اور شاکر علی جونیجو کے ہمراہ ڈیفنس آف پاکستان رولز اور ایمرجنسی کے خاتمے کے مطالبے پر بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں عوام مردانہ وار ریاستی طاقت کے خلاف عوامی انقلابی جدوجہد میں مصروف رہے۔ سینکڑوں جانیں ایوبی آمریت کے اوچھے ہتھکنڈوں کا شکار ہو رہی تھیں۔ اپوزیشن کے کئی راہنما حکومت سے مذاکرات کے ذریعے ایک طے شدہ کھیل کے مطابق حکومت حاصل کرنے میں مصروف عمل تھے جبکہ حکومت گول میز کانفرنس کے ذریعے ایک ابھرتے ہوئے انقلاب کو سبوتاژ کرنے میں مصروف تھی۔ 14 فروری 1969ء کو حکومت نے اعلان کیا کہ 17 فروری کو ہنگامی حالت ختم کر دی جائے گی اور اسی کے ساتھ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار تمام راہنماؤں کی رہائی کا اعلان کیا گیا جس کے مطابق شام 6:45 پر چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو رہا کر دیا گیا لیکن مسٹر بھٹو نے بھوک ہڑتال جاری رکھنے کا ارادہ برقرار رکھا۔ یہ حکومتی اعلان ایوب آمریت کی پہلی شکست تھی جبکہ مولانا بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو نے حکومت کی گول میز کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ جب اپوزیشن کے دیگر راہنما ایوب خان سے گول میز کانفرنس میں مذاکرات کے لیے بے چین تھے تو مسٹر بھٹو کراچی میں عوامی ریلے کے ساتھ قائدِ اعظم کے مزار کی جانب گامزن تھے۔ اس موقع پر مسٹر بھٹو نے کہا:

''سیاستدان ابھی تک گول میز کانفرنس میں دستور بنانے اور نظامِ حکومت پر گفتگو میں مصروف ہیں۔ قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ اس ملک کا دستور عوام کی خواہش کے مطابق ہوگا لیکن بابائے قوم کا یہ فرمان ابھی تک پورا نہیں کیا گیا۔ موجودہ جدوجہد کو تحریک کہنا غلط ہے۔ یہ تحریک نہیں انقلاب ہے اور عوامی انقلاب کا تمام تر سہرا عوام کے سر ہے۔

میں قائدِ اعظم کے مزار پر عہد کرتا ہوں میں ذاتی مفاد کو کبھی عوام کے مفاد پر ترجیح نہیں دوں گا

اور ان کے نام پر کوئی سودے بازی نہیں کروں گا۔ عوام کی جدوجہد میرا ایمان ہے۔ میں اس ملک سے سامراج کے پٹھوؤں کو ختم کرنے کی آخری دم تک جدوجہد کرتا رہوں گا۔"

شروع میں حکومت نے شیخ مجیب کو پیرول پر رہا کر کے گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جو مجیب نے مسترد کر دی۔ شیخ مجیب نے غیر مشروط طور پر رہائی اور اگرتلہ سازش کیس کے خاتمہ اور دیگر 34 افراد جو اگرتلہ سازش میں ملوث تھے کی رہائی کی شرائط پر گول میز مذاکرات میں شمولیت کا مطالبہ کیا۔ 22 فروری 1969ء کو شیخ مجیب سمیت اگرتلہ سازش کیس میں ملوث دیگر 34 افراد کو حکومت نے رہا کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ اگرتلہ سازش کیس ختم کرنے کا بھی اعلان کیا۔ 26 فروری 1969ء کو گول میز کانفرنس کے تحت حکومت اور اپوزیشن کے مابین مذاکرات کا آغاز ہوا۔ گول میز کانفرنس میں:

(1) نوابزادہ نصر اللہ خان (ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی)

(2) عبدالسلام (عوامی لیگ، پی ڈی ایم گروپ کا حامی)

(3) شیخ مجیب الرحمٰن اور سید نذر الاسلام (عوامی لیگ)

(4) نور الامین اور حمید الحق چودھری (این ڈی ایف)

(5) میاں ممتاز دولتانہ اور خواجہ خیر الدین (کونسل مسلم لیگ)

(6) چودھری محمد علی اور مولوی فرید احمد (نظامِ اسلام)

(7) مولانا مودودی اور پروفیسر غلام اعظم (جماعتِ اسلامی)

(8) مفتی محمود اور پیر محسن الدین (جمعیتِ علمائے اسلام)

(9) خان عبدالولی خان اور پروفیسر مظفر احمد (نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ)

نے اپنی اپنی جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی۔ اس کے علاوہ آزاد حیثیت میں ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان، جسٹس ریٹائرڈ ایس ایم مرشد اور جنرل ریٹائرڈ اعظم خان نے بھی حکومت کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اسی دن ذوالفقار علی بھٹو راولپنڈی میں عوام سے خطاب کے لیے تشریف لائے تو عوام نے اپنے قائد کا تاریخی استقبال کر کے ان کے موقف کی حمایت کا مظاہرہ کیا۔ لیاقت باغ راولپنڈی میں مسٹر بھٹو نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"گول میز کانفرنس قومی بحران کا حل نہیں۔"

گول میز کانفرنس کسی ایک نقطے پر پہنچنے کے بجائے مختلف مطالبات اور خواہشات کا شکار

www.bhutto.org

ہو چکی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات کے مطالبے پر بضد تھے۔ مفتی محمود نفاذ شریعت پر، جماعتِ اسلامی اپنے اندازِ فکر کے مطابق نظامِ اسلام پر اور اسی طرح دیگر راہنما اپنی اپنی سیاسی فکر کے حوالے سے آوازیں بلند کر رہے تھے۔ گول میز کانفرنس کا پہلا راؤنڈ عملی طور پر نفسانفسی کا شکار ہو کر ناکام ہو چکا تھا اور یہ طے پایا کہ گول میز کانفرنس کا اگلا راؤنڈ 10 مارچ 1969ء کو کیا جائے جبکہ ذوالفقار علی بھٹو مسلسل عوامی رابطے کی مہم کے ذریعے حکومت کی طرف سے انقلابی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کے خلاف شہر سے قصبات تک عوامی جدوجہد کے پرچم کو بلند کیے ہوئے تھے۔ 10 مارچ کو گول میز کانفرنس دوبارہ بری طرح ناکامی کا شکار ہو گئی چونکہ اسی دوران اگرتلہ سازش میں ملوث ایک فلائٹ سارجنٹ ظہور الحق کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ حکومت کا موقف تھا کہ وہ فوج کی تحویل سے بھاگنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن کسی نے بھی اس کہانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس حادثے کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں عوامی ردِعمل کا ایک نیا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ڈھاکہ میں دو مرکزی وزیروں کے گھر جلا دیے گئے، سٹیٹ گیسٹ ہاؤس اور کنونشن مسلم لیگ کے دفتر کو بھی نذرِ آتش کر دیا۔ پورا شہر تشدد کی لہر کی لپیٹ میں آ گیا جس کے بعد شہر میں کرفیو نافذ کر کے شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں ان واقعات کے بعد مغربی پاکستان کے خلاف نفرت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ شیخ مجیب نے کھلے عام کہنا شروع کر دیا کہ اب پاکستان ٹوٹ جانا چاہیے۔ شیخ مجیب نے اپنے اس مطالبے کے حوالے سے کہا کہ:

"میں اپنے الفاظ واپس نہیں لوں گا، یہ میرے نہیں عوام کے الفاظ ہیں، یہ عوام کا مطالبہ ہے، ہم نے بیس سال تک انتظار کیا ہم ابھی اس پر عمل چاہتے ہیں۔"

ایوب خان کے خلاف مغربی پاکستان میں عوامی تحریک میں جو جانی نقصان ہوا ایک تحقیق کے مطابق وہ درج ذیل ہے:

نومبر 1968ء	4 افراد ہلاک	1000 افراد گرفتار
دسمبر 1968ء	11 افراد ہلاک	1530 افراد گرفتار
جنوری 1969ء	57 افراد ہلاک	4710 افراد گرفتار
فروری 1969ء	147 افراد ہلاک	100 افراد گرفتار
مارچ 1969ء	90 افراد ہلاک	356 افراد گرفتار

جبکہ ہزاروں افراد ان پانچ مہینوں میں زخمی ہوئے۔ اسی طرح درجنوں پولیس ملازمین عوامی

www.bhutto.org

جھڑپوں میں ہلاک ہوئے اور لاتعداد پولیس سٹیشن اور سرکاری عمارات نذرِ آتش ہو گئیں جس کے بعد پولیس شہروں میں غیر موثر ہوتی چلی گئی اور سرکاری ملازمین نے حکومت کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا جبکہ صدر ایوب خان کا طویل عرصہ سے خرابیِ صحت کی بنا پر حکومتی مشینری میں اثر و رسوخ دن بدن ختم ہوتا جا رہا تھا۔ امن و امان کا مسئلہ بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ اس عوامی بے چینی اور بیداری اور حکومتی ڈھانچے میں کمزوری کے باوجود حکومت اپنی ہٹ دھرمی پر مسلسل قائم تھی لیکن کھوکھلا نظام تا حال عوامی طاقت کے فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ حکمران طبقے کو علم تھا کہ یہ ایک انقلاب ہے۔ اس کی مکمل کامیابی کا مطلب ہے کہ سرمایہ داری، جاگیرداری، سول و فوجی افسر شاہی کی بنیادوں پر قائم نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ اور ایک ترقی پسند نظام کی نئی بنیادیں جو کہ حکمران طبقے کو کسی طرح بھی قبول نہ تھیں۔ اس لیے کھوکھلے نظام نے نئی بیساکھیوں کا سہارا لیا اور یوں 26 مارچ 1969ء کو ملک میں دوسرا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ صدر ایوب خان نے اقتدار کی طاقت کمانڈر انچیف جنرل محمد یحییٰ خان کو منتقل کر دی۔

www.bhutto.org

دوسرا مارشل لاء اور انتخابات

ایوب خان حکومت کے خلاف عوامی جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان میں پی پی پی کی شکل میں ایک ترقی پسند، جمہوریت پسند اور سامراج دشمن سیاسی جماعت معرضِ وجود میں آئی جبکہ ایوب خان کی آمریت کے خلاف پاکستان کے عوام نے جو جدوجہد کی اس میں امریکہ دشمنی کے عوامی جذبات سرِفہرست تھے۔ پاکستان کے عوام نے ملک میں جدید ترقی پسند سیاسی، سماجی و معاشی نظام کی جدوجہد کی تھی۔ ان کے نزدیک آمریت اور نوآبادیاتی نظام کے تحت ترقی و خوشحالی ناممکن تھی۔ اسی لیے عوامی مظاہروں میں امریکہ کی بالادستی کے خلاف عوامی نفرت نمایاں تھی۔ عوام نے یہ بھی کہا کہ امریکہ نے پاکستان کے ساتھ فوجی و اقتصادی ترقی کے معاہدات کے باوجود مشکل وقت میں پاکستان کی حمایت سے ہاتھ پیچھے کرلیا۔ 1965ء کی جنگ میں امریکہ نے اتحادی ہونے کے باوجود پاکستان سے جو بے وفائی کی اس نے امریکہ کے استعماری اور خودغرض رویئے کی تصدیق کردی تھی جبکہ عوامی جمہوریہ چین نے پاکستان کی سلامتی اور بقاء کے لیے جو کردار ادا کیا اس نے چین کے ساتھ پاکستانی عوام کی حمایت میں اضافہ کیا۔ امریکی اقتصادی و عسکری امداد نے حکمران طبقے کی خوشحالی اور مراعات میں تو اضافہ کیا جبکہ عوامی ترقی میں امریکی امداد کے کوئی اثرات مرتب نہ ہوئے اور یہ بات بھی عوامی شعور میں پختگی کا سبب بنی کہ امریکہ جو پاکستان کو امداد دیتا ہے وہ حکمران طبقے کی حکومتی طاقت کا سبب بنتی ہے جو کہ اپنے ہی عوام پر حکمرانی کر کے ان کے سماجی، سیاسی، معاشی اور جمہوری حقوق سلب کیے بیٹھے تھے۔ دراصل عوام کو اب یقین ہوگیا تھا کہ سول و فوجی افسر شاہی امریکی سامراج کا ایک Instrument ہے جو پاکستانی نوآبادیاتی ڈھانچے کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔ اسی لیے امریکہ پاکستان میں جنم لینے والے انقلاب سے شدید خوفزدہ تھا۔ اگر پاکستان میں ایک سامراج دشمن انقلاب کامیاب ہوجاتا اور سرد جنگ کے عروج کے اس زمانے میں

www.bhutto.org

پاکستان اس کے ہاتھوں سے نکل جاتا تو امریکہ کو علاقائی امریکی عسکری مفادات کے حوالے سے شدید دھچکا لگتا تھا۔ اسی لیے امریکہ۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے خلاف چیلنج تصور کر رہا تھا۔ امریکیوں کی کوشش تھی کہ اس انقلاب کو مزید التوا میں ڈال دیا جائے اور ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے کہ پاکستان عالمی سطح پر امریکی اثر و رسوخ کے دائرۂ کار میں ہی رہے اور پاکستان میں امریکہ کی پسند کی حکومت کا تسلسل چلتے رہنا چاہیے۔ چنانچہ پہلے مارشل لاء کی طرح دوسرے مارشل لاء کو بھی امریکی سرپرستی حاصل تھی۔

پانچ ماہ تک مسلسل عوامی جدوجہد ایک انقلاب آفرین جدوجہد تھی جو 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے خاتمے کے بعد فوجی حکمران جنرل ایوب خان کے سامراج نواز کردار کی عوام میں حقیقت عام ہونے کے بعد آہستہ آہستہ پھوٹی تھی۔ سسکتے ہوئے نظام کی نام نہاد ترقی، سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مزدوروں کی انقلابی جدوجہد اور طلبا و نوجوانوں کی ریڈیکل تحریک نے بے نقاب کر کے رکھ دی تھی۔ عوامی انقلابی جدوجہد نے یہ ثابت کر دکھایا کہ پاکستان پر مسلط غیر جمہوری نظام کے علاوہ معاشی، اقتصادی اور معاشرتی نظام پر بھی چند خاندانوں، قبیلوں اور جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ سول و ملٹری بیوروکریسی نے پورے ملک میں خوشحالی اور سماجی انصاف کا راستہ روک رکھا ہے اور یہ حکمران طبقات امریکی سامراج کے بل بوتے پر اپنے عوام کو غلام بنائے بیٹھے ہیں۔ یہ جدوجہد Neo-colonialism کے خلاف ایک جدوجہد تھی۔ عوام سماج کی تشکیلِ نو کے خواہاں تھے۔ پوری دنیا میں اسی طرح کی انقلابی تحریکوں نے امریکہ اور اس کے گماشتوں کے خلاف اس عرصے میں ایسی ہی تاریخ مرتب کی تھی۔ ویتنام کے عوام نے دنیا کی سپر طاقت کے خلاف جس تاریخ ساز انداز میں جدوجہد کی تھی اس نے بھی پاکستان میں پھوٹنے والے انقلاب کو تقویت پہنچائی اور پاکستان میں اس انقلابی فضا میں ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں نچلے طبقات نے ایک انقلابی جماعت کو جنم دیا جس نے غیر طبقاتی نظام کی تشکیل کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا تھا۔ اس جماعت نے اپنی تشکیل کے ایک سال بعد مغربی پاکستان میں ایک انقلابی تحریک کی قیادت کر کے عوامی خواہشات کی راہنمائی کی تھی۔ اس عوامی جدوجہد کو مشرقی پاکستان کے عوام کی حمایت بھی حاصل تھی۔ تقریباً نصف سال تک پاکستان کے لوگ سڑکوں، گلیوں، محلوں اور بازاروں میں آمریت کے خلاف نبرد آزما رہے جبکہ دوسری جانب حکمران ایک نئے انقلاب کو ملتوی کرنے میں مصروف تھے۔ اسی لیے ایوب حکومت نے اقتدار اپنے کمانڈر انچیف کو منتقل کر کے پاکستان کی سیاست کو مزید پیچیدگی سے دوچار کر دیا۔ ایوب خان نے یحییٰ خان کو اقتدار منتقل کرتے وقت یہ وعدہ بھی لیا کہ ان کی اور ان کے بیٹوں کی

جائیداد کی پوری طرح حفاظت کی جائے گی۔ یحیٰ حکومت بنیادی طور پر ایک عبوری حکومت تھی لیکن یحیٰ خان نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عوامی تحریک کے دباؤ کے نتیجے میں لاتعداد سیاسی، اقتصادی اور معاشی خصوصاً (مزدوروں کی) اصلاحات کیں جن میں ون یونٹ کا خاتمہ، پیرٹی کا خاتمہ (یعنی دونوں حصوں کی برابر نمائندگی کا خاتمہ اور ایک ووٹ ایک آدمی کی بنیاد پر انتخاب) سول بیوروکریسی میں اصلاحات، اور اس طرح مشرقی و مغربی پاکستان کے حوالے سے اقتصادی اصلاحات سرِفہرست ہیں۔

28 جولائی 1969ء کو سپریم کورٹ کے جسٹس عبدالستار کو چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا جبکہ 30 مارچ 1970ء کو لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) جاری کیا گیا جس میں انتخابات کے اصول اور منتخب اسمبلی کو قانون ساز اسمبلی قرار دیا گیا۔ لیگل فریم ورک آرڈر میں یہ شرط عائد کی گئی کہ منتخب اسمبلی 120 دن کے اندر نیا آئین منظور کرے گی وگرنہ مقررہ مدت کے خاتمے کے بعد اسمبلی خود بخود تحلیل تصور کی جائے گی اور صدرِ مملکت کو آئین پر سند دینے کا حتمی اختیار ہوگا۔ یحیٰ حکومت نے جن پیچیدہ اقدامات کا آغاز کیا اس کا خمیازہ جلد ہی ملک وقوم کو بھگتنا تھا۔ درحقیقت یہ انقلاب کو التوا میں ڈالنے کے راستے تھے اور یہ عالمی حقیقت ہے کہ جب انقلاب کو جبری طور پر روکا جائے تو ملکوں کے جغرافیے بدل جاتے ہیں۔ ون یونٹ کے خاتمے کے بعد قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی درج ذیل سیٹوں کی تقسیم کی گئی اور یوں ایک عوامی انقلابی تحریک کے بعد پاکستان میں انتخابات منعقد کیے جا رہے تھے:

قومی اسمبلی میں صوبوں کی نشستوں کی تعداد

صوبے	جنرل سیٹیں	خواتین کی مخصوص سیٹیں	ٹوٹل
مشرقی پاکستان	162	7	169
پنجاب	82	3	85
سندھ	27	1	28
صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا)	18	1	19
بلوچستان	4	1	5
قبائلی علاقہ جات	7	X	7
	300	13	313

www.bhutto.org

صوبوں میں اسمبلیوں کی نشستیں

صوبے	جنرل سیٹیں	خواتین کی مخصوص سیٹیں	ٹوٹل
مشرقی پاکستان	300	10	310
پنجاب	180	6	186
سندھ	60	2	62
صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا)	40	2	42
بلوچستان	20	1	21

ملک میں عام انتخابات کے اعلان کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی نے یکم جولائی 1970ء کو سندھ کے معروف روحانی پیشوا اور پی پی پی کے راہنما مخدوم زماں محمد طالب المولیٰ کے قصبہ ہالہ میں ایک اہم اجلاس کا انعقاد کیا۔ اس اجلاس میں یہ طے کرنا تھا کہ کیا اگلے انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے یا حصہ لیا جائے؟ چونکہ پارٹی میں اس وقت دو آراء تھیں ایک یہ کہ انتخابات پاکستان کے گھمبیر مسائل کا حل نہیں۔ مسائل کا حل اور نیا نظام ایک معرکہ خیز مقابلے کے بعد ہی معرضِ وجود میں آ سکتا ہے جبکہ دوسری رائے یہ تھی کہ گو انتخابات مسائل کا حل نہیں لیکن منزل کو حاصل کرنے کا ایک مرحلہ ہے۔ یہ کانفرنس پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہالہ کانفرنس کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ہالہ کانفرنس میں اپنی حکمتِ عملی کا فیصلہ کرنا تھا۔ ماؤزے تنگ سے متاثر نوجوان معراج محمد خان، ڈاکٹر شمیم زین الدین اور دوسرے ترقی پسند راہنماؤں کا نقطہ نظر تھا کہ انتخابی پلیٹ فارموں سے عوام کو خبردار کیا جائے کہ انتخابات ملک کے 22 اجارہ دار سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور نوکر شاہی کے مظالم سے پیدا ہونے والے مسائل اور مشکلات کے حل میں معاون ثابت نہیں ہوں گے۔ سرمایہ داری نظام میں اس قسم کا ڈھونگ چہرے بدلنے کے لیے رچایا جاتا ہے۔ اس فریب کاری سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ عوام کو جاگیرداری ختم کرانے کے لیے جدوجہد کو جاری رکھنا ہوگا۔ انہیں اجارہ دار، سرمایہ دار اور نوکر شاہی کے مظالم کے خلاف اپنی جنگ کو مزید تیز کرنا ہوگا کیونکہ پارلیمان سے عوام کے مسائل کبھی حل نہیں ہوں گے۔

جبکہ دوسری طرف رائے یہ تھی کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے مگر وہ اپنے عوامی مشن کو منتشر نہ ہونے دے۔ مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں، نوجوانوں اور طلبا سے انتخابات

www.bhutto.org

شاہنواز بھٹو اور لیڈی خورشید (والدہ ذوالفقار علی بھٹو 1925ء)

نوجوان ذوالفقار علی بھٹو۔ بمبئی 1940ء

www.bhutto.org

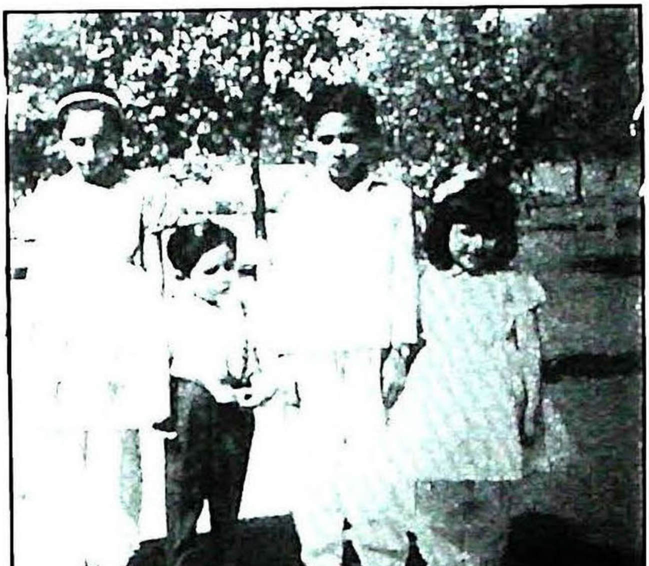

بائیں سے دائیں طرف بے نظیر بھٹو، شاہنواز بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو اور صنم بھٹو۔ 1963ء

www.bhutto.org

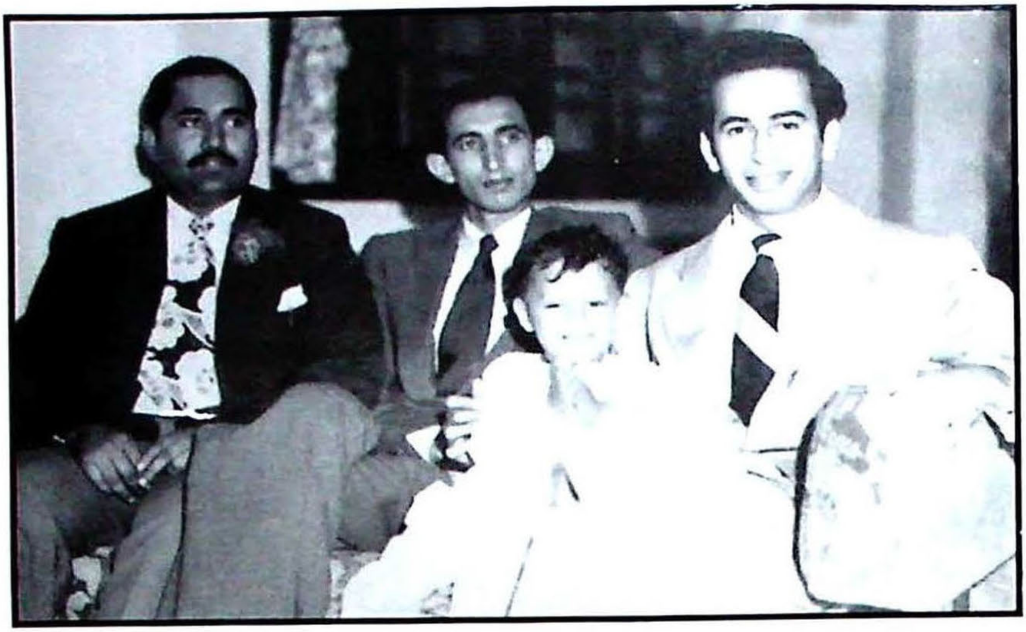

جواں سال بھٹو

ایک تقریب میں جواں سال ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

اپنی لاڈلیوں پنکی اور صنم کے ہمراہ

بے نظیر بھٹو، صنم بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو

www.bhutto.org

غریبوں کا راہنما ذوالفقار علی بھٹو ننگے پاؤں ایک مزدور کے ساتھ

www.bhutto.org

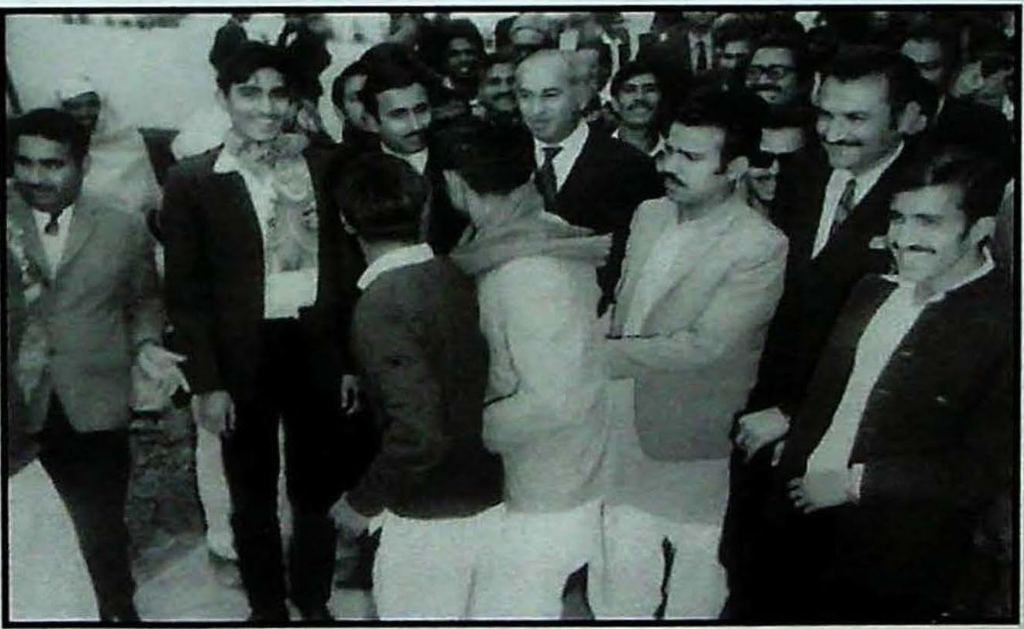

www.bhutto.org

عوام کا بھٹو

www.bhutto.org

2 دسمبر 1971ء اقتدار کی منتقلی جنرل یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور غلام اسحٰق خان

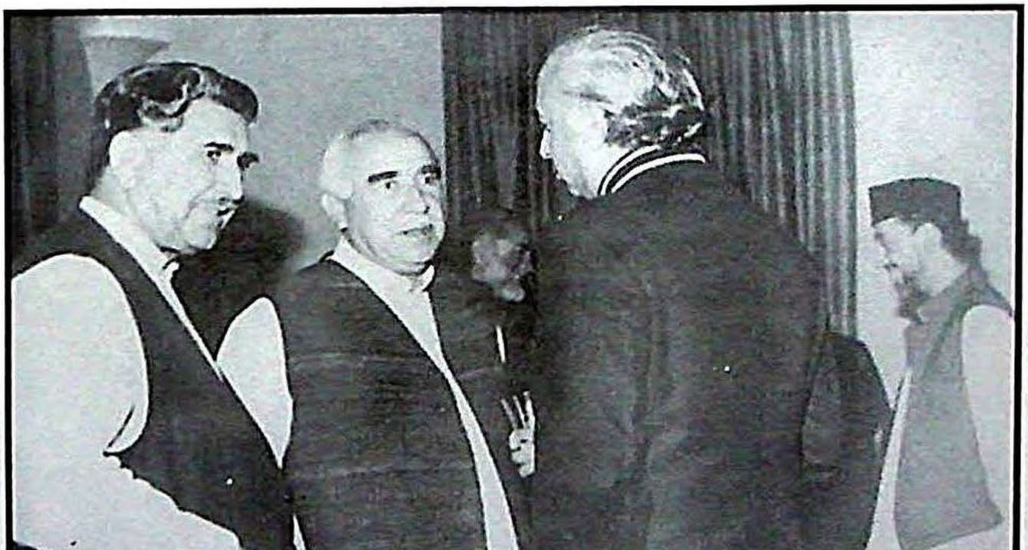

خیر بخش مری، ذوالفقار علی بھٹو اور غوث بخش بزنجو

www.bhutto.org

چواین لائی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور ماؤزے تنگ

وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو۔ مصر کے راہنما جمال ناصر اور صدر ایوب خان کے ہمراہ

www.bhutto.org

جولائی 1972ء۔ شملہ معاہدہ کے بعد اندرا گاندھی اور غلام مصطفیٰ جتوئی کے ہمراہ

غلام مصطفیٰ جتوئی۔ حفیظ پیرزادہ اور روئیداد خان کے ساتھ

www.bhutto.org

امریکہ کے ایک دورے کے دوران، پس منظر میں ہنری کسنجر اور بیگم نصرت بھٹو

صدر نکسن اور ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

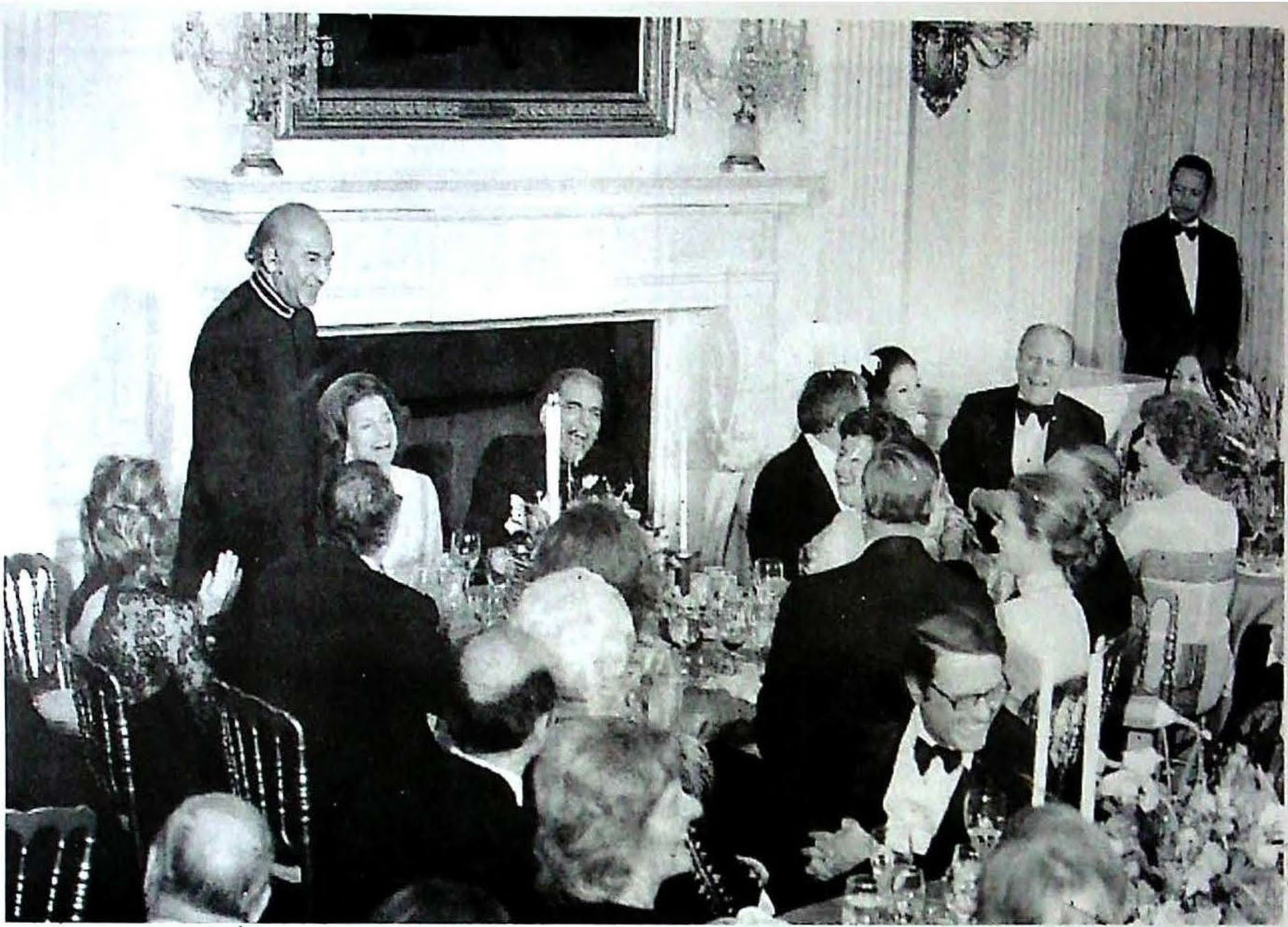

ذوالفقار علی بھٹو امریکی صدر فورڈ کے عشائیے میں خوشگوار لمحات کی ایک یادگار تصویر

www.bhutto.org

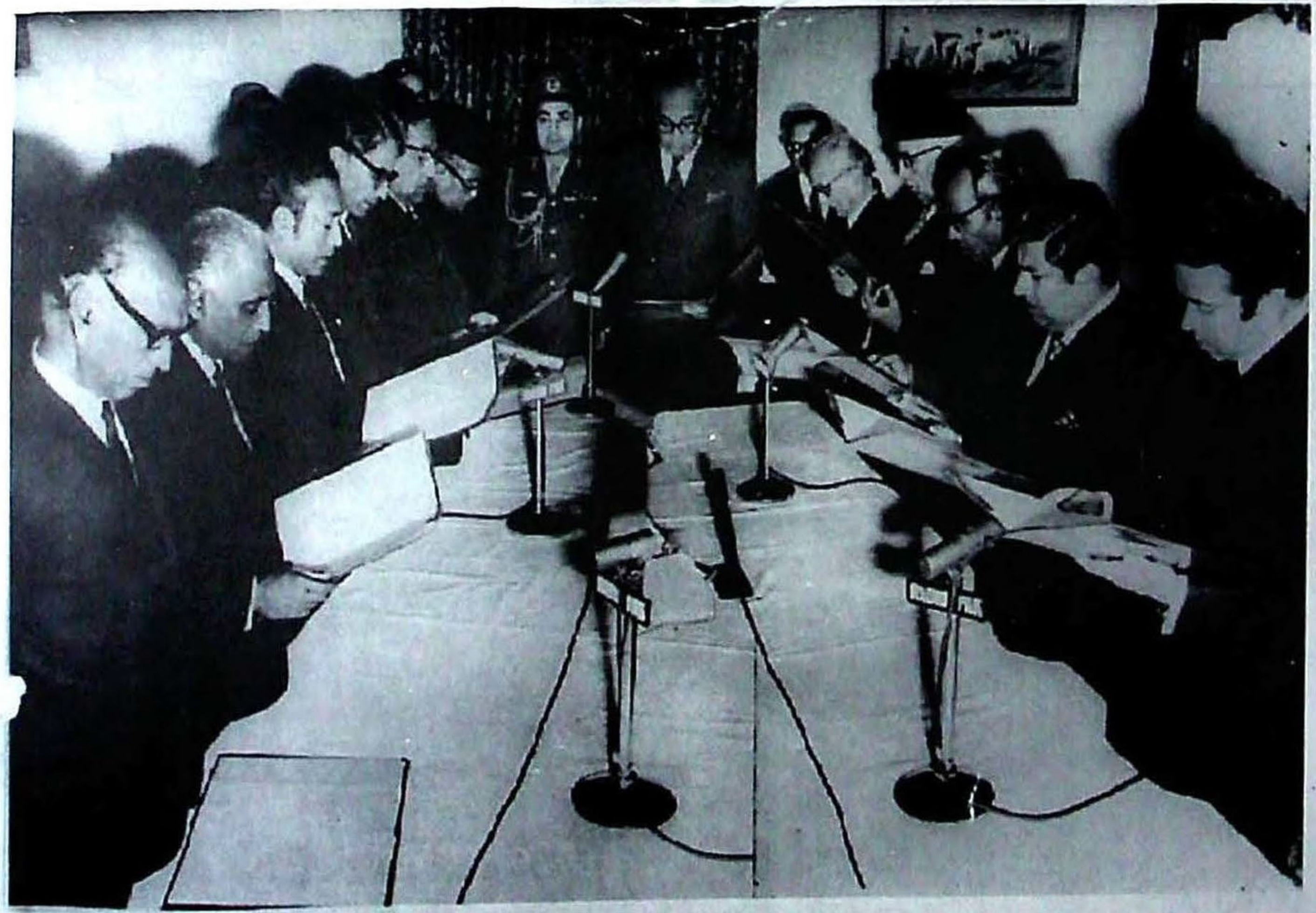

ذوالفقار علی بھٹو اپنی پہلی کابینہ سے حلف لیتے ہوئے۔ دسمبر 1971ء

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کی گود میں شیخ محمد رشید مرحوم

www.bhutto.org

اپوزیشن رہنماؤں کے ساتھ آئین پر دستخط کے بعد 20 اکتوبر 1972ء

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب

26 اکتوبر 1974ء ماسکو۔ ذوالفقار علی بھٹو اور سوویت راہنما کوسیگن کے ساتھ

www.bhutto.org

کے دوران رابطہ برقرار رکھا جائے اور منزل کے حصول کو کبھی بھی فراموش نہ کیا جائے۔ ہالہ کانفرنس میں اکثریت کی رائے ان ہی نکات پر متفق تھی جن لوگوں نے اس نقطۂ نظر کی حمایت کی ان میں ڈاکٹر مبشر حسن، ملک معراج خالد، احمد رضا قصوری، بدیع الحسن زیدی، حق نواز گنڈا پور، نثار محمد خان، میاں گل قادری، حق غریب نواز، جے اے رحیم، ولی الٰہی، سیف الرحمٰن کیانی، میاں محمد افضل، مولانا عبدالحق ربانی، صاحبزادہ فاروق، ذکاء اللہ لودھی، شیخ محمد رشید، میجر جنرل محمد اکبر خان، عبدالحفیظ پیرزادہ، محمد حیات خان شیر پاؤ اور رسول بخش تالپور نمایاں تھے۔ لہٰذا ہالہ کانفرنس کے تاریخ ساز اجلاس میں اگلے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا گیا۔

مار یں گے، مر جائیں گے، سوشلزم لائیں گے۔

مانگ رہا ہے ہر انسان روٹی کپڑا اور مکان۔

جیہڑا واہوے او ہو کھاوے۔

چھین لو چھین لو جاگیریں چھین لو۔

گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو۔

امریکہ کے غم خواروں کو ایک دھکا دو۔

امریکی سامراج مردہ باد۔

آمریت مردہ باد۔

سرمایہ داری و جاگیرداری مردہ باد۔

جمہوریت زندہ باد، سوشلزم زندہ باد۔

ساڈا بھٹو آوے ای آوے، چھا گیا چھا گیا ساڈا بھٹو چھا گیا۔

ان نعروں کی گونج میں ذوالفقار علی بھٹو انتخابی مہم میں داخل ہو گئے۔ ان انتخابات کے موقع پر ذوالفقار علی بھٹو نے بہ بانگِ دہل کہا کہ:

''ہم تشدد کے خلاف ہیں لیکن قربانی سے نہیں ڈرتے...... پریس ٹرسٹ پہلے ایوب خان کی خوشامد کرتا تھا اب وہ رجعت پسند لیڈروں کی قصیدہ خوانی کر رہا ہے۔ ہم نے گزشتہ پانچ ہزار سال میں ہندوؤں، مغلوں، افغانوں، انگریزوں، سکھوں اور جرنیلوں کا راج دیکھا ہے مگر عوامی راج نہیں دیکھا۔ اب عوامی راج آنے والا ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر سیاسی قیدیوں کو رہا نہ کیا گیا تو اس کے بڑے

www.bhutto.org

دوررس نتائج ہوں گے۔ ممکن ہے مجھے بھی گرفتار کرلیا جائے۔ میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔ آپ بھی عہد کریں کہ آپ بھی وطن کے لیے ہر قربانی دیں گے۔"

"میں پچھلے دروازہ کا قائل نہیں۔ یہ پچھلا دروازہ آپ کا راستہ ہے۔ میں تو سامنے کے دروازے کا قائل ہوں۔ اگر مجھے اقتدار کی ہوس ہوتی تو میں پارٹی نہ بناتا، غریبوں کی جدوجہد شروع نہ کرتا، میں سیٹھوں کا سرمایہ داروں کا ساتھ دیتا۔ میں لمبا راستہ اختیار نہ کرتا۔ میں وڈیروں کا ساتھ دیتا۔ وڈیروں کے خلاف جدوجہد نہ کرتا۔ میں نے عوامی راستہ، تانگے والوں کا، رکشے والوں کا، محنت کشوں کا، غریبوں کا راستہ اختیار کیا ہے۔ تم بھٹو کو نہیں روک سکتے۔ بھٹو اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہاں کے عوام ہیں۔ مزدور اور کسان ہیں۔ تم ان کو نہیں روک سکتے۔ تم امریکہ اور بھارت کے ایجنٹ بن کر عظیم الشان تحریک کو روک نہیں سکتے۔ مجھے روکنا یعنی عوام کے حقوق کو دبانا۔ مجھے روکنا یعنی استحصال کو جاری رکھنا۔ میں عوام ہوں، میں عوام کی آواز ہوں۔"

مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو سوشلزم کے پاپولر نعرے پر اپنی انتخابی مہم چلا رہے تھے جبکہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اپنی جماعت کے چھ نکاتی پروگرام کے ساتھ انتخابی مہم میں مشرقی بنگال کے کونے کونے میں گئے۔ یہ ایک طویل انتخابی مہم تھی ملک میں تسلسل کے ساتھ انتخابی جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایک نئے انداز کے ساتھ انتخابی مہم چلائی۔ ایک دن میں 22 شہروں اور قصبات میں انتخابی جلسوں سے خطاب کر کے روایتی جاگیردار سیاستدانوں کی نیندیں حرام کردیں۔ ایک دن میں اتنے شہروں اور قصبات میں عوامی رابطہ کی یہ مہم پاکستانی سیاست میں ایک ریکارڈ ہے۔ سیاست اور انتخابی مہم جو حویلیوں کی بیٹھکوں میں شروع اور ختم ہوئی تھی اب اس کو ذوالفقار علی بھٹو گلیوں اور بازاروں میں لے آئے جس نے روایت پسند اور رجعتی سیاستدانوں کے نظام کو درہم برہم کردیا۔ ان انتخابات میں شیخ مجیب کی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو کی پی پی پی نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے چونکہ دونوں جماعتیں ایک سے دوسرے بازو میں عوامی جڑیں نہیں رکھتی تھیں گو مشرقی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے 16 اگست 1969ء کو ڈھاکہ میں پی پی پی کے کنونشن میں بنیاد رکھی لیکن یہ نوخیز جماعت، مشرقی پاکستان میں ایک باقاعدہ سیاسی جماعت کے طور پر نہ ابھر سکی۔ یہ دور مشرقی پاکستان میں Bengali chauvinism کا دور تھا۔ جوں جوں انتخابی مہم تیز ہورہی تھی مشرقی پاکستان میں بنگالی قوم پرستی کا جنون اپنی انتہا کو چھو رہا تھا جبکہ مغربی پاکستان

میں Class concsiousness اپنے عروج پر تھا۔ اس کے بعد بھی آج تک پاکستان میں اس قدر طبقاتی شعور نظر نہیں آسکا۔ عوام ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں انتخابات کے ذریعے ایک پرامن انقلاب برپا کرنے جارہے تھے۔ اپنی انتخابی مہم میں مسٹر بھٹو نے کہا:

> ''وہ آزادی جو انتخابات کی وجہ سے میسر آتی ہے کسی اور ذریعے سے نہیں مل سکتی ماسوائے انقلاب کے۔ انتخاب اور انقلاب ہی تبدیلی اور عزم نو کے وہ زبردست ذرائع ہیں جن سے تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اگر تشدد کے ذریعے تبدیلی کو رد کردیا جائے تو صرف ایک ذریعہ باقی رہتا ہے، انتخاب۔ جسے قبول کرلینا چاہیے۔''

مسٹر بھٹو نے انتخابی مہم میں اپنے کرشماتی کردار کے سبب عوام میں ایک نئی زندگی اور نئے پاکستان کی امنگ پیدا کردی ورنہ اس سے قبل پاکستان میں انتخابات کے دوران سیاسی رواج یہ تھا کہ انتخابی امیدوار کسی گاؤں یا قصبے کے بڑے وڈیرے، جاگیردار، چودھری، خان یا سردار کے پاس جاکر اپنی حمایت میں ووٹوں کا وعدہ لے آتا اور یوں عوام مقامی جاگیردار کے کیے گئے فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے لیکن اب لوگ جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوکر معاشی، اقتصادی، سماجی، علاقائی اور عالمی مسائل کو سننے کے بعد یہ فیصلہ کرنے والے تھے کہ ان کا ووٹ کس طرح استعمال ہوگا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے حویلیوں اور محلات کی صدیوں پرانی ''مقدس روایات'' کو توڑا۔ سانگھڑ جو کہ پیر پگاڑہ کا آبائی شہر ہے میں انتخابی مہم سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے کہا:

> ''میں نے بڑے بڑے پیروں کو مجبور کیا کہ وہ عام جلسہ گاہوں میں آکر عوام سے بات کریں ورنہ آج تک تو وہ اپنے محلوں کی بالکونیوں سے غریب عوام کو اپنا درشن کرواتے تھے۔''

شیڈول کے مطابق انتخابات اکتوبر 1970ء میں ہونے تھے لیکن مشرقی پاکستان میں المناک سیلاب کے سبب قومی اسمبلی 7 دسمبر اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات 17 دسمبر 1970ء کو منعقد کیے گئے۔ انتخابی نتائج نے شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان کی مقبول ترین جماعتوں کے طور پر پیش کیا۔ مجموعی طور پر لوگوں نے مذہب کے نام پر سیاست کرنے والی اسلامی نظریات کی مختلف سیاسی جماعتوں کو ووٹ دینے کے بجائے سیکولر اور روشن خیال سیاسی

جماعتوں کو انتخابات میں کامیابی دلائی۔ قومی اسمبلی میں پی پی پی کی 81 سیٹوں پر کامیابی اس کی توقع سے زیادہ تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو سمیت تمام قیادت 35 سے 38 سیٹوں کی توقع رکھتی تھی جبکہ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے پانچ حلقوں لاہور، ملتان، ٹھٹھہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور لاڑکانہ سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور چار حلقوں سے بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ لاہور سے بھٹو نے علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال، احمد سعید کرمانی اور جنرل سرفراز خان کو اور لاڑکانہ سے محمد ایوب کھوڑو جیسے سیاسی برجوں کو شکست دے کر اپنا لوہا منوالیا۔ ان انتخابات میں قومی اسمبلی کے لیے عوامی لیگ نے 169 امیدوار، پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) نے 134 امیدوار، کنونشن مسلم لیگ نے 124 امیدوار جماعت اسلامی نے 148 امیدوار اور پاکستان پیپلز پارٹی نے 119 امیدوار کھڑے کیے۔

قومی اسمبلی میں 1970ء کے الیکشن کے نتائج کے مطابق
سیاسی جماعتوں کی حاصل کردہ سیٹیں

سیاسی جماعت	مشرقی پاکستان	پنجاب	سندھ	سرحد (موجودہ)	بلوچستان	کل تعداد
عوامی لیگ	160	0	0	0	0	160
پاکستان پیپلز پارٹی	0	62	18	1	0	81
مسلم لیگ (قیوم گروپ)	0	1	1	7	0	9
کونسل مسلم لیگ	0	7	0	0	0	7
جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ)	0	0	0	6	1	7
جمعیت علمائے پاکستان	0	4	3	0	0	7
نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ)	0	0	0	3	3	6
جماعت اسلامی	0	1	2	1	0	4
کنونشن مسلم لیگ	0	2	0	0	0	2
پی ڈی پی	1	0	0	0	0	1
آزاد	1	5	3	7	0	16
	162	82	27	25	4	300

www.bhutto.org

نوٹ: صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) میں 7 آزاد نشستیں جیتنے والے اراکین کا تعلق قبائلی علاقہ جات سے تھا۔ قبائلی علاقہ جات براہ راست وفاقی حکومت کے زیر انتظام ہیں۔

ڈالے گئے ووٹوں میں سے جماعتوں کے حاصل کردہ ووٹوں کی شرح فیصد

سیاسی جماعت	مشرقی پاکستان	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان	کل قومی سطح پر
عوامی لیگ	75.11	0.07	0.25	0.22	1.06	39.20
پاکستان پیپلز پارٹی	—	41.66	44.95	14.28	2.38	18.63
مسلم لیگ (قیوم گروپ)	1.07	5.42	10.70	22.64	10.94	4.46
کونسل مسلم لیگ	1.60	12.66	6.84	4.06	10.99	5.96
جمعیت علماء اسلام (ہزاروی گروپ)	0.92	5.19	4.85	25.45	20.00	3.98
جمعیت علماء پاکستان	—	9.96	6.91	0.02	—	3.94
نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ)	2.06	—	0.37	18.50	45.23	2.43
جماعت اسلامی	6.07	4.74	10.31	7.22	1.16	6.03
کنونشن مسلم لیگ	2.81	5.11	1.79	0.57	—	3.34
پی ڈی پی	2.81	2.26	0.08	0.32	0.37	2.24
آزاد	3.47	11.65	11.11	6.01	6.81	7.04

www.bhutto.org

www.bhutto.org

سقوطِ ڈھاکہ

مشرقی پاکستان کی علیحدگی جدید سیاسی تاریخ کی یہ پہلی مثال ہے کہ اکثریتی آبادی نے اقلیتی آبادی سے آزادی یا علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ ایک وسیع اور اہم موضوع ہے۔ اس سانحے کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ یہ ہی ہے کہ متحدہ پاکستان یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک طویل جغرافیائی فاصلہ تھا۔ اس فاصلے کے بیچ بھارت جیسا وسیع اور پاکستان کے ساتھ شدید اختلافات رکھنے والا ملک موجود تھا جس کی عالمی اور علاقائی سیاسی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جس کے ساتھ پاکستان کی دو جنگیں 1948ء اور 1965ء میں ہو چکی تھیں جبکہ تیسری جنگ 1971ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان کے اندرونی بحران سے فائدہ اٹھا کر لڑی۔ بھارت نے عوامی لیگ کی سیاسی، اقتصادی اور عسکری حمایت کر کے ثابت کر دکھایا کہ بھارت پاکستان کے ٹکڑے کرنے پر کاربند تھا۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) مشرقِ بعید کے سرے پر اور مغربی پاکستان مشرقِ وسطیٰ کے سرے پر واقع ہیں۔ دونوں بازوؤں میں صرف ایک چیز قدرِ مشترک تھی۔ وہ مذہب اسلام تھا لیکن مذہب کا یہ مضبوط ترین ستون دونوں حصوں کو متحد رکھنے میں ناکام ثابت ہوگیا اور مغربی پاکستان کے اوپری طبقے کے سیاسی، معاشی، اقتصادی اور ثقافتی استحصال نے مشرقی بازو کو علیحدگی پر مجبور کر دیا اور یہ المیہ اس وقت ہوا جب ذوالفقار علی بھٹو عوامی سیاست کا پرچم لے کر خطے کی ممتاز اور مقبول شخصیت کے طور پر ابھرے تھے۔ اسی لیے پاکستان کے اندر آج تک دائیں بازو کا ایک بڑا حلقہ یہ ثابت کرنے میں مسلسل مصروف ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار شخص صرف ذوالفقار علی بھٹو ہی ہے۔ یہ حسد پر مبنی اور غیر سائنٹفک رویہ ہے۔ کسی بھی بحران پر تحقیق کی جائے تو بحران کے لاتعداد عناصر سامنے آجاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کا قیام برِصغیر کی تاریخ کا اہم سیاسی موضوع ہے جس پر لاتعداد تحقیقی

www.bhutto.org

کتابیں تا حال شائع ہو رہی ہیں جن کے مطابق بھارت کی مرضی اور مدد کے بغیر بنگالیوں میں بے چینی کی تحریک اور بنگلہ دیش کا قیام ناممکن تھا۔ اسی لیے آج خود بھارت کو بنگلہ دیش کی جو قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ بھارت کے اندر علیحدگی کی تحریکوں کو بنگلہ دیش کے قیام کی مثال نے مضبوط اور Militant کیا جن میں آزاد خالصتان اور کشمیر کی تحریکیں سرِ فہرست ہیں۔ درحقیقت بنگلہ دیش کے قیام نے خود بھارت میں Balkanization کے عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔

مشرقی پاکستان، پاکستان کی 52 فیصد آبادی پر مشتمل بنگلہ زبان بولنے والوں کا صوبہ تھا۔ روپئے کے لحاظ سے بنگال برِصغیر پاک و ہند کے سیکولر صوبوں میں سرِ فہرست ہے۔ بنگالی قوم پرستی اور سیاسی شعور میں اپنی مثال آپ ہیں۔ برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی چنگاریاں بنگال ہی میں سلگیں اور پاکستان کی آزادی کی قرارداد جو 23 مارچ 1940ء کو لاہور کے تاریخی شہر میں مسلم لیگ کے عوامی جلسے میں پیش کی گئی اس کے محرک بھی معروف بنگالی سیاستدان، شیرِ بنگال مولوی اے کے فضل الحق تھے اور اس اجلاس میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برِصغیر کے مسلمانوں نے برطانیہ سے آزادی کی شکل میں مسلمانوں کے علیحدہ ملک پاکستان کی تاریخی جدوجہد کا فیصلہ کیا جو تقریباً سات سال بعد حقیقت پذیر ہوا لیکن آزادی کے ایک سال بعد ہی مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلے پر بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ اس بغاوت کے بعد پاکستان کے حکمران طبقوں نے اپنے استحصال کے سبب بنگالیوں میں احساسِ محرومی کو تقویت پہنچائی۔ مشرقی پاکستان میں احساسِ محرومی کے جذبات کو پاکستان کے آئینی بحرانوں اور دونوں مارشل لاؤں نے علیحدگی کے فیصلے کے قریب تر کر دیا۔ 1955ء میں مسلط کیے گئے ون یونٹ نظام نے استحصالی ہتھکنڈوں کو مزید طاقتور کیا یاد رہے کہ 1966ء میں جب ایوب خان کے خلاف نفرت عروج پر پہنچ چکی تھی تو لاہور میں چودھری محمد علی کے گھر آل پاکستان قومی کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے مشہورِ زمانہ چھ نکاتی مطالبات پیش کر دیے جو بعد میں عملی طور پر بنگلہ دیش کی آزادی کا نعرہ بن کر ابھرے اور جن کی بنیاد پر 1970ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے انتخابات میں طاقتور حیثیت حاصل کی۔ جس وقت شیخ مجیب الرحمٰن نے 1966ء میں چھ نکاتی مطالبات پیش کیے اس وقت ان نکات و مطالبات پر مغربی پاکستان کے سیاستدانوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی مگر ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت ایوب حکومت میں وزیرِ خارجہ تھے وہ پہلے مغربی پاکستانی سیاستدان تھے جنہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن سے باقاعدہ ملاقات کر کے ان کے ساتھ چھ نکات پر بحث کر کے کسی مفاہمتی راستے پر چلنے کی کوشش کی اور انہوں نے ایوب خان کو یہ مشورہ بھی دیا

کہ اس وقت گنجائش موجود ہے کہ مشرقی پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لیے کوئی راستہ نکالا جائے لیکن پاکستان کے جلد باز حکمرانوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو جو چھ نکات کے مطالبات کے ساتھ ہی ملک کے ممتاز سیاستدانوں میں شمار ہونے لگا تھا اگرتلہ سازش کے مقدمے میں گرفتار کرلیا۔ ذوالفقارعلی بھٹو نے مقدمے کی کارروائی کے دوران بھی شیخ مجیب الرحمٰن سے عدالت میں ملاقات کر کے مشرقی بازو کے ابھرتے ہوئے لیڈر کے ساتھ ڈائیلاگ کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ مسٹر بھٹو بڑے زور شور کے ساتھ اس مقدمے کے خاتمے کا مطالبہ بھی کرتے رہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو چھ نکات کی وجہ سے پاکستانی سیاست کی اہم شخصیت بن کر ابھرے ان کی شخصیت اور پس منظر پر ہلکی سی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس مزاج، کردار اور رویے کے مالک سیاسی راہنما تھے۔

تحریک آزادیٔ پاکستان مشرقی بنگال میں برِصغیرِ پاک و ہند کے دوسرے علاقوں سے کہیں زیادہ زور شور کے ساتھ چلی۔ اس تحریک کے دوران شیخ مجیب نے ایک نوجوان سیاسی کارکن کے طور پر بھرپور کردار ادا کیا۔ مسلم لیگ کے پرچم تلے بحیثیت طالب علم راہنما وہ ایک متحرک، پروقار اور جاذب شخصیت رکھتے ہوئے پاکستان کے زبردست حامی اور برطانوی استحصال کے خاتمے کے لیے مصروف کار رہے۔ تخلیقِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں جو لسانی مظاہرے ہوئے نوجوان شیخ مجیب نے ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ جب 1948ء میں قائدِاعظم محمد علی جناح ڈھاکہ میں قومی زبان کے مسئلے پر تقریر کر رہے تھے تو آتش مزاج شیخ مجیب کو کرزن ہال کے باہر مظاہرے میں شامل بنگالی زبان کی حمایت کرنے پر گرفتار کرلیا گیا۔

جب حسین شہید سہروردی نے 1949ء میں عوامی لیگ بنائی تو شیخ مجیب بھی اس نئی جماعت میں شامل ہو گئے۔ عوامی لیگ مسلم لیگ کے جاگیردار سیاستدانوں سے نالاں ملک کے دونوں بازوؤں کے سیاسی کارکنوں پر مشتمل سوشلسٹ اور نوجوان بنگالی قوم پرست عناصر پر مشتمل ایک جاندار جماعت کے طور پر ابھری تھی۔ اس جماعت میں وہ نوجوان اور طالب علم بھی شامل ہوئے جنہوں نے تخلیقِ پاکستان کے بعد لسانی مظاہروں میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ دسمبر 1952ء کو عوامی لیگ نے لاہور سے اپنا تین نکاتی بنیادی منشور پیش کیا:

(1) سربراہِ مملکت براہِ راست منتخب ہو۔

(2) بنیادی حقوق۔

(3) عدلیہ آزاد ہو۔

www.bhutto.org

لسانی فسادات کے بعد مشرقی پاکستان میں احساسِ محرومی کے علاوہ پاکستان کے حکمران طبقات کے خلاف نفرت کا ایک نیا دور 1954ء کے انتخابات سے شروع ہوا جب عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی نے متحدہ محاذ بنا کر مسلم لیگ کے خلاف الیکشن لڑا اور متحدہ محاذ نے 21 نکات پر مشتمل اپنے پروگرام پر مشرقی پاکستان میں الیکشن جیت لیا۔ ان 21 نکات میں صوبائی خودمختاری پر شدت کے ساتھ زور دیا گیا تھا اور یہ سیاسی ورثہ عوامی لیگ کو 1950ء میں مشرقی پاکستان کے طلبا کے ایک قومی کنونشن سے ملا جس کی بنا پر عوامی لیگ کی تشکیل کے وقت ان قوم پرست نوجوانوں اور طلبا نے عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ 1954ء کے انتخابات میں متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم سے شیخ مجیب دستور ساز اسمبلی میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ دستور ساز اسمبلی میں شعلہ بیاں قوم پرست شیخ مجیب کی تقریریں غیر بنگالی زبان بولنے والے استحصالی طبقات کے خلاف گھومنے لگیں۔ شیخ مجیب اس منتخب پلیٹ فارم پر مغربی پاکستان خصوصاً پنجاب کے خلاف کھل کر بولتے رہے۔ جب حسین شہید سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم منتخب ہو گئے تو شیخ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت میں وزیرِ صنعت و تجارت نامزد کیا گیا لیکن وزیر اعلیٰ عطاء الرحمٰن خان کے ساتھ اختلافات کے سبب کچھ عرصے بعد ہی مسٹر سہروردی نے شیخ مجیب کو وزارت کے قلمدان سے فارغ کر دیا۔ 1957ء میں عوامی لیگ کے اندر اختلافات پھوٹ پڑے۔ مولانا عبدالحمید بھاشانی کی قیادت میں عوامی لیگ کے سوشلسٹ نظریات کے لوگوں نے علیحدگی اختیار کر کے نیشنل عوامی پارٹی بنائی جس میں مغربی پاکستان کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس طرح عوامی لیگ کے اندر سوشلسٹ رجحان محدود ہو گیا اور عوامی لیگ ایک Militant Nationalist پارٹی کا روپ دھارتی چلی گئی اور پارٹی کے اندر اب شیخ مجیب الرحمٰن علیحدگی پسندوں کے گروپ کی قیادت کرنے لگے تھے لیکن ایک سال بعد پاکستان میں پہلا مکمل مارشل لاء لگا جس کے تحت 1962ء تک سیاسی سرگرمیوں کا حق چھین لیا گیا جس کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں دب کر رہ گئیں۔ اس دوران شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ دور مارشل لاء کی سختی اور آمریت کے خوف کا دور تھا۔ فوج، جس میں مغربی پاکستان خصوصاً پنجاب اور صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) کو بالادستی تھی کو پورے ملک میں پہلی بار کھل کر حکمرانی کا موقع ملا۔ اس مارشل لاء کے بعد آمریت کی طرف سے کیے گئے ظالمانہ اقدامات کو پنجاب کے استحصال سے تعبیر کیا جانے لگا۔ چھوٹی قومیتوں میں مارشل لاء کی وجہ سے بے چینی اور بے یقینی میں اضافہ قدرتی بات تھی۔ ایسے میں قوم پرست بنگالیوں میں قومی سوال (National Question) زور پکڑنے لگا لیکن جب شیخ مجیب جیل

سے رہا ہوئے تو تقریباً تین سال تک انہوں نے عملی طور پر خاموشی اختیار کرلی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شیخ مجیب نے مستقبل کے لیے نئے لائحہ عمل کے بارے میں سوچا جبکہ مغربی پاکستان کی طرف سے استحصال کا سمبل ایوب خان کو تصور کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے ایوب خان کی مخالف امیدوار محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ مغربی پاکستان کے محاذ پر لڑی گئی۔ بنگالی عوام کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ پاکستان کے حکمرانوں کو ان کے دفاع سے بھی کوئی دلچسپی نہیں چونکہ مشرقی بازو کے دفاع کے لیے پاکستانی حکمرانوں نے کوئی عسکری حکمتِ عملی تشکیل نہیں دی تھی جب جنگِ 1965ء کے دوران مشرقی پاکستان کے گورنر منعم خان نے مشرقی پاکستان کے لیڈروں کو طلب کر کے حکومت کی حمایت کرنے کی خواہش کی تو ان لیڈروں میں شیخ مجیب الرحمٰن بھی شامل تھے۔ اس موقع پر شیخ مجیب نے گورنر مشرقی پاکستان منعم خان کو مشورہ دیا کہ وہ بنگال کی آزادی کا اعلان کر کے نئی مملکت کے صدر بن جائیں۔ یہ شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے پہلی مرتبہ انتہا پسندانہ رویے کا اظہار تھا۔

حسین شہید سہروردی کے انتقال کے بعد شیخ مجیب عوامی لیگ کے واحد مقبول راہنما تصور کیے جانے لگے۔ 1966ء میں چھ نکاتی مطالبات کے بعد ان کی اہمیت میں شدت کے ساتھ اضافہ ہوا۔ چھ نکات کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنگ 1965ء کے بعد ایوب خان کی مقبولیت میں جو کمی واقع ہوئی اس کے بعد خود ہی حکومت نے مشرقی پاکستان کے راہنما شیخ مجیب کے ان مطالبات کو سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع ابلاغ میں خوب اچھالا تاکہ قوم کی توجہ ایک نئے مسئلے پر مرکوز کی جاسکے بلکہ اس بارے تو یہاں تک کہا گیا کہ چھ نکات ایوب خان کے دستِ راست الطاف گوہر کی ذہنی کاوش ہیں۔ ایک چیز بڑی دلچسپ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن، یوسف ہارون کی انشورنس کمپنی کے ملازم تھے۔ یوسف ہارون کی فیملی بارے میں یہ عام تاثر ہے کہ وہ امریکی پالیسی سازوں کے بہت قریب ہے اور ہمیشہ ہی پاکستان کے سیاسی بحران کی انتہا پر ہارون برادران جس طلسماتی انداز میں ٹپکتے ہیں وہ انداز دلچسپی سے خالی نہیں اور ہارون برادران کے تعلقات مسٹر الطاف گوہر سے بھی کافی گہرے تھے جو کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ جبکہ ان انتخابات سے قبل شیخ مجیب الرحمٰن برطانیہ کے دورے پر گئے جہاں پر برطانوی حکومت نے شیخ مجیب کا استقبال ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے کیا جو کہ تعجب کی بات تھی۔ انتخابات سے قبل یہ توقع نہیں کی جارہی تھی کہ شیخ مجیب اس قدر واضح اکثریت سے جیتیں گے مگر مغرب کی طرف سے جنوبی ایشیا کے ایک اپوزیشن راہنما کی بھرپور پذیرائی اس کی شخصیت کو ابھارنے اور اہم بنانے کی ایک کڑی ہوسکتی ہے۔ اس

www.bhutto.org

دورے کے دوران برطانوی دفترِ خارجہ کے پروٹوکول افسران بنگالی راہنما کو ہوائی اڈے سے ایک سرکاری گاڑی سے ہوٹل تک لائے۔ اسی دورے کے دوران شیخ مجیب الرحمٰن کی ساؤتھ میں ساحل کے کنارے امریکیوں سے علیحدگی میں ملاقات بھی ہوئی۔ ان دنوں مغرب کے میڈیا نے بنگال کے قوم پرست لیڈر کو خوب پبلسٹی دی اور شیخ مجیب جس قدر ''سوشلسٹ'' تھا اس کا اندازہ ایک انٹرویو سے کیا جا سکتا ہے جو 31 مارچ 1971ء کو فرانسیسی اخبار لے ماند میں چھپا:

"Is the West Pakistan government not aware that I am the only one able to save East Pakistan from communism? If they take decision to fight, I shall be pushed out of power and Naxalites (Maoists) will intervene in my name. If I make too many concessions, I shall lose my authority. I am in a very difficult situation."

عوامی لیگ کی قیادت امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات کی خواہاں تھی اور اسی طرح عوامی لیگ کے گوریلے جنہوں نے بھارت کے کیمپوں میں باقاعدہ ٹریننگ لی تھی وہ بھی صرف اور صرف تنگ نظر بنگالی قوم پرستی کے سیاسی فلسفے پر کاربند تھے۔ عوامی لیگ کے مسلح گوریلے مکتی باہنی (آزادی کی فوج) کسی طرح بھی ترقی پسند یا سوشلسٹ نظریات سے لیس نہ تھے حالانکہ منشور کے لحاظ سے عوامی لیگ سوشلزم کی علمبردار تھی۔

عالمی شہرت یافتہ اطالوی صحافی اوریانا فلاشی نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ایک ملاقات کے بعد اپنی جو رائے دی وہ بڑی دلچسپ ہے اوریانا فلاشی کا یہ انٹرویو 24 فروری 1972ء کو اٹلی کے ایک اخبار ''یوروپا'' میں چھپا۔

''مجیب میرے ملک اٹلی کے سابق ڈکٹیٹر مسولینی سے ملتا جلتا ہے۔ وہ بھی بڑے خبط کا مریض تھا۔ اسی طرح باتیں کرتا تھا، آواز بالکل مجیب جیسی تھی۔ دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ مسولینی اس اعتراف سے جھجکتا نہیں تھا کہ وہ فاشسٹ ہے مگر مجیب نے اپنی اصلیت کو جمہوریت، اشتراکیت اور آزادی کے پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ میں نے شیخ مجیب سے سوال کیا کہ سوشلزم کیا ہے؟ تو اس کا جواب تھا سوشلزم، سوشلزم ہے اور مجیب کو اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کے اصل دوست امریکی اور برطانوی ہیں۔ اگر نہیں تو وہ رہا ہو کر لندن کیوں گیا؟ کراچی یا تہران سے نئی دہلی جا سکتا تھا اور اندرا گاندھی کے ساتھ باون منٹ کے بجائے چوبیس گھنٹے گزار سکتا تھا۔ معاشیات کے موضوع پر مجیب ان پڑھ ہے۔ زراعت اس کے لیے معمہ ہے اور سیاست سے زبانی جمع خرچ کی حد تک آگاہ ہے۔''

1970ء کے انتخابات میں مارشل لاء حکومت نے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت نو منتخب آئین

www.bhutto.org

سازاسمبلی پر یہ تلوار لٹکا دی کہ وہ 120 دنوں کے اندر نیا آئین بنائے۔ انتخابات سے پہلے فوجی حکومت کو یہ یقین تھا کہ کوئی پارٹی اکیلے حکومت نہیں بنا سکے گی لہٰذا فوجی حکومت اپنی مرضی کی حکومت بنوا کر یحییٰ کی صدارت میں شراکتِ اقتدار کو بھی دوام بخشے گی اور حکومت کو شیخ مجیب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ انتخابات سے قبل یہ تأثر بھی دیا کہ اس کا رویہ بعداز انتخابات نرم ہو جائے گا لیکن شیخ مجیب نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے دیرینہ ارادوں پر سختی کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے غیر لچک انداز میں اپنے چھ نکات پر ڈٹے رہنے کا اعلان کیا۔

"نیا آئین چھ نکات کی بنیاد پر بنے گا، ان نکات پر تبدیلی کا کسی کو حق نہیں۔ یہ چھ نکات بنگلہ دیشی عوام کا اثاثہ ہیں اور ہمیں کوئی طاقت ان چھ نکات کی بنیاد پر آئین بنانے سے نہیں روک سکتی۔"

(پاکستان آبزرور 4 جنوری 1971ء)

شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ ایک پاپولسٹ جماعت تھی جس کو بھارت کے بورژوائی طبقہ کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ خطے کی علاقائی سیاست کے حوالے سے بھی حالات شیخ مجیب کے حق میں تھے۔ بھارت چین تنازع اور بھارت سوویت تعلقات بنگلہ دیش کے قیام کے لیے تقویت کا باعث تھے۔ لہٰذا یہ صورتحال شیخ مجیب الرحمٰن کے تنگ نظر قوم پرستانہ نظریات کے لیے بڑی آئیڈیل تھی اور پاکستان پر مسلط فوجی حکمرانوں کی عاقبت نااندیشیاں جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ فوجی حکمرانوں کو تاریخ و سیاست کا ادراک ہی نہیں تھا۔ وہ ہر معاملے کو طاقت اور ایجنسیوں کی سازش سے حل کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ بھارت بنگلہ دیش کو آزاد کروا کر دو قومی نظریئے کو چکنا چور کرنا چاہتا تھا۔ بھارت شیخ مجیب کے نسل پرست مکتی باہنی گوریلوں کو "آزادی" کی خاطر ٹریننگ، فوجی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی مدد دے رہا تھا لیکن دوسری طرف اپنے ہی ملک میں ہزاروں نکسل باڑی (ماؤسٹ) گوریلوں کو بے دریغ قتل کر رہا تھا۔ انڈین کانگریس نے درحقیقت خطے میں بھارتی بورژوائی مفادات کے تحفظ کے لیے یہ ساری حکمتِ عملی تشکیل دی جبکہ بھارت اس بات سے بھی خوفزدہ تھا کہ کہیں بنگلہ دیش کی آزادی کی جدوجہد طول نہ پکڑ جائے چونکہ ایسے میں متحدہ جمہوریہ بنگال (بشمول بھارت کی مغربی بنگال کی ریاست) کے پرچم تلے ایک ترقی پسند تحریک طاقت پکڑ سکتی تھی چونکہ مکتی باہنی کا مغربی بنگال میں رابطہ تھا اور مشرقی پاکستان کے ہزاروں بنگالیوں کو بھارتی مغربی بنگال میں مہاجر ہونے کی صورت میں ایک وسیع بنگالی نیشنلزم زور پکڑ رہا تھا جس پر چین نواز ترقی پسند اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اسی لیے شیخ مجیب، بھارت اور امریکہ جلدی سے اس

بحران کے نتیجے میں ''آزاد بنگلہ دیش'' کے قیام کی طرف جا رہے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن بڑی سختی کے ساتھ بضد تھا کہ نیا آئین بنے گا تو چھ نکات کی بنیاد پر بنے گا جبکہ ذوالفقار علی بھٹو جو مغربی پاکستان کے مقبول راہنما کے طور پر ابھرے تھے، چاہتے تھے کہ ہمیں ایک آبرومندانہ راستہ اختیار کر کے اسمبلی کے اجلاس سے پہلے آئینی مسودے پر متفق ہو جانا چاہیے جو کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے لیے قابلِ عمل ہو اور لیگل فریم ورک آرڈر کی 120 دن مدت کی تلوار ہٹا دینی چاہیے لیکن شیخ مجیب، بھٹو کے نقطہ نظر سے رتی بھر بھی اتفاق کرنے پر تیار نہ تھا۔ یہ ایک پیچیدہ اور دیرینہ بحران تھا جس نے ایک فیصلہ کن شکل اختیار کر لی تھی جس کا مشرقی پاکستان کے راہنما شیخ مجیب کو بھرپور احساس تھا کہ یہی وقت ہے جب اندرونی، علاقائی اور عالمی تناظر میں ایک نیا ملک معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔ چھ نکات کی بنیاد پر آئین کی تشکیل کا مطلب تھا کہ ایک بنگلہ دیش نہیں بلکہ مغربی پاکستان سے بھی نئے ممالک کو جنم دیا جائے اور یوں یہ وفاقی ڈھانچہ اپنی موت آپ مر جائے۔

3 جنوری 1971ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے مؤقف کے بھرپور اظہار کے لیے اپنی مشہور زمانہ تقریر کی جس کے فوراً بعد 11 سے 15 جنوری 1971ء تک صدر مملکت یحییٰ خان نے ڈھاکہ کا دورہ کر کے شیخ مجیب سے مذاکرات کیے۔ جبکہ شیخ مجیب اپنے مؤقف پر بدستور قائم رہا مگر اس سے ملاقات کے بعد صدر یحییٰ خان نے کہا کہ ''میں مستقبل کے وزیرِاعظم سے مل کر آ رہا ہوں۔'' صدر یحییٰ خان مشرقی پاکستان سے واپسی پر ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کے لیے ان کے آبائی شہر لاڑکانہ روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد 27 جنوری 1971ء کو مسٹر بھٹو، شیخ مجیب سے ملاقات کے لیے ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔ یہ مذاکرات بھی کوئی درمیانی راستہ نہ بنا سکے تو ذوالفقار علی بھٹو نے ڈھاکہ سے واپسی پر 6 نکات کے خلاف سخت لائن لینے کا راستہ اپنایا۔ 15 فروری کو پیپلز پارٹی نے اعلان کیا کہ 3 مارچ کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کی جائے گی چونکہ شیخ مجیب نے 6 نکات کی روشنی میں ایک آئینی مسودہ تیار کر لیا تھا۔ جس کی اس اجلاس میں رسمی منظوری لی جانی باقی تھی۔ اس سارے بحران کے حوالے سے آج تک مسٹر بھٹو پر ایک الزام بڑی شدت کے ساتھ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے نشتر پارک کراچی میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اُدھر تم، اِدھر ہم''

(روزنامہ آزاد 15 مارچ 1971ء)

www.bhutto.org

اور یہ کہ انہوں نے یہ نعرہ لگا کر بنگلہ دیش کی علیحدگی کے راستے کو تقویت پہنچائی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرخی صرف ایک اخبار 'روزنامہ آزاد' نے 15 مارچ 1971ء کو شائع ہونے والے شمارے میں چھاپی۔ مسٹر بھٹو پچاس منٹ تک نشتر پارک کراچی میں اس عظیم الشان جلسۂ عام سے مخاطب رہے جس میں انہوں نے شیخ مجیب سے اپنی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ:

''عوامی لیگ اپنے نکات کی بنیاد پر ایک زونل فیڈریشن قائم کرنے کی خواہاں تھی۔ اس مسئلہ پر مغربی پاکستان میں اشتعال پھیل جاتا۔ چنانچہ ہم اس نکتہ کو ماننے پر رضامند نہیں ہوئے۔ تاہم ہماری پارٹی عوامی لیگ کے چھ نکات کے قریب تر آ گئی ہے۔ ہم نے ڈھاکہ میں ان کے دو نکات تسلیم کر لیے اور مغربی پاکستان واپس آنے اور صلاح مشورہ کے بعد ایک نکتہ اور تسلیم کر لیا۔ مزید دو نکات پر تصفیہ ممکن ہے اور بیرونی امداد و تجارت کے سوال پر بھی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔''

مسٹر بھٹو کا یہ مؤقف مفاہمت کا اظہار تھا۔ سنسنی خیز صحافت کے جنون میں اخبار کی لیڈ نکالنے پر سیاق و سباق میں جائے بغیر مؤقف کی حقیقت کو بدلنا تاریخی اور صحافتی ناانصافی ہے۔ ویسے بھی دوسرے دن یعنی 16 مارچ 1971ء کے اسی اخبار 'روزنامہ آزاد' میں اس سرخی کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو کی تردید چھپی جو کچھ یوں ہے:

''نہ میں نہ تم۔ ہم دونوں۔ اور ایک پاکستان''

اور اس تردیدی بیان میں کہا گیا کہ مرکز میں پی پی پی اور عوامی لیگ کو صوبوں میں اکثریتی پارٹیوں کو اقتدار منتقل کیا جائے۔

لیکن یہ سب کوششیں اور اقدامات آئے دن غیر اہم ہوتے جا رہے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے 2 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں مکمل ہڑتال کا اعلان کر کے امنِ عامہ کے تمام معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مشرقی پاکستان کے تمام سرکاری دفتروں میں اب شیخ مجیب کے احکامات چل رہے تھے۔ غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا گیا۔ ریاستِ بنگلہ دیش کے نام پر احکامات بھی جاری کرنے شروع کر دیئے گئے۔ پولیس، عدلیہ، ایسٹ پاکستان رائفلز ہر ادارے میں اب عوامی لیگ کے احکامات چل رہے تھے۔ یہ ایسی صورتحال تھی جس میں خانہ جنگی ہی جنم لے سکتی تھی۔ یحییٰ، مجیب اور بھٹو مذاکرات کے سلسلے چلتے رہے لیکن بحران اب اس قدر پیچیدہ تھا کہ اس کے حل کی چابی صرف شیخ مجیب کے ہاتھوں میں تھی، جس کے پاس مشرقی پاکستان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ دراصل مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی

www.bhutto.org

متوازی حکومت بن چکی تھی جبکہ عوامی لیگ نے بھارت کی مدد سے ایک انتہا پسندانہ سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز 2 مارچ 1971ء کو ہی کر دیا تھا۔ اسی دوران بھارت نے بنگال کی سرحد پر ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد فوج ڈیپلائے کر دی اور بڑی تعداد میں بھارتی فوجی گوریلے سویلین روپ میں مشرقی پاکستان میں بھی داخل کر دیئے گئے۔ بھارتی اسلحے کی پائپ لائن بڑی تیزی سے ان گوریلوں اور مکتی باہنی کے کارکنوں تک اسلحہ پہنچا رہی تھی۔ سرکاری عمارتوں پر دھڑا دھڑ آزاد بنگلہ دیش کے پرچم لہرائے جا رہے تھے۔ عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی 23 مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا دیا۔ مرکزی حکومت نے جنرل ٹکا خان کو گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا کر ڈھاکہ بھیجا لیکن بنگالی چیف جسٹس نے نئے گورنر سے حلف لینے سے انکار کیا جبکہ مغربی و امریکی پریس بڑی شدت کے ساتھ بنگلہ دیش کے قیام کے لیے سرگرداں نظر آ رہا تھا۔ کیا ایسے میں کوئی صورت بن سکتی تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن ایک متحدہ پاکستان پر آمادہ ہو جاتے؟ حتیٰ کہ شیخ مجیب نے تو ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات میں بھی کہا کہ آپ مغربی پاکستان کا اقتدار سنبھال لیں اور مشرقی پاکستان کا اقتدار میرے حوالے کر دیں۔ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر اقتدار شیخ مجیب کے حوالے کر دیا جاتا تو پاکستان ٹوٹنے سے بچ جاتا۔ یہ ایک یوٹوپین خیال ہے۔ ایک آزاد ملک کے قیام کی جدوجہد کے لیے سرگرم لیڈر سے ایسی توقع رکھنا؟ بھارتی مداخلت نے مشرقی پاکستان میں متوازی حکومت بنانے میں جو کردار ادا کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں جس کی حمایت اور مدد کے بغیر مشرقی پاکستان میں کھلی بغاوت کی کامیابی ممکن نہیں تھی جبکہ متحدہ پاکستان کا دارومدار شیخ مجیب الرحمٰن کے سر تھا۔ اس پیچیدہ اور مشکل بحران میں فوجی حکومت نے 25 اور 26 مارچ 1971ء کی درمیانی شب مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کا آغاز کیا۔ ملٹری آپریشن کے توپوں اور گولوں کی گھن گرج ذوالفقار علی بھٹو نے ڈھاکہ میں ہوٹل میں اپنے کانوں سے سنی۔

ان واقعات کے بعد بھارتی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے بنگلہ دیش کے قیام کی متفقہ طور پر حمایت کا اعلان کر دیا۔ یوں بھارت کی بالواسطہ فوجی اور سیاسی مداخلت نومبر 1971ء میں بلاواسطہ فوجی مداخلت میں بدل گئی۔ 21 نومبر 1971ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اسی دوران سابق سوویت یونین کا فوجی مشن مارشل کتاکوف کی قیادت میں بھارت آیا۔ یہ وفد 19 اگست 1971ء کے بھارت سوویت دوستی کے ایک معاہدے کے تحت بھارت آیا جس کے مطابق دونوں ملک اپنے اوپر حملے کی صورت میں مدد کے پابند تھے۔ مارشل کتاکوف نے پاکستان سے جنگ کے دوران

www.bhutto.org

بھارتی اسلحے کی ضرورتوں کا جائزہ لیا جبکہ نومبر کے پہلے ہفتے ایک پاکستانی وفد ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیکنگ روانہ ہوا جس میں چیف آف دی ائیر شاف، اعلیٰ فوجی اور بحری حکام کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ وہاں مسٹر بھٹو نے چواین لائی سے ملاقات کی اور اس دورے کے دوران چین نے پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا لیکن پاکستان کا دفترِ خارجہ کوئی سفارتی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہا چونکہ عالمی رائے عامہ بھارت اور شیخ مجیب کے مؤقف سے متفق ہو چکی تھی۔ دراصل بھارت نے 1965ء کی جنگ کے دوران جس سفارتی شکست کا سامنا کیا تھا اس مرتبہ اس نے اس کا بھرپور ازالہ کرتے ہوئے عالمی طاقتوں اور رائے عامہ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پاکستان دنیا بھر میں تنہا ہو چکا تھا۔ جب 21 نومبر 1971ء کو بھارتی افواج نے مشرقی پاکستان کے اندر داخل ہونا شروع کیا تو عالمی سطح پر تنہا پاکستان بھارتی عسکریت اور توسیع پسندی کا بھی شکار ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں حملہ آوروں کو جنگ زدہ ملک میں حمایت حاصل تھی اور اس دھرتی کا دفاع کرنے والے اپنے عوام کی حمایت کھو چکے تھے۔ گو پاکستان نے 3 دسمبر 1971ء کو مغربی پاکستان کے محاذ سے بھارت پر حملہ کی ایک رسم ادا کی لیکن یہ Counter-offensive بھارت کو نقصان نہ پہنچا سکا۔ امریکہ جو پاکستان کے ساتھ عسکری معاہدات میں منسلک تھا اس نے ایک مرتبہ پھر پاکستان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا اور مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے امریکی ساتواں بحری بیڑہ جس کا ان دنوں بڑا چرچا تھا، مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے ہماری مدد سے قاصر رہا اور یوں ہم ایک دفعہ پھر 1965ء کے بعد اپنے اتحادی امریکہ کی مدد سے محروم ہی رہے جبکہ مشرقی پاکستان میں جنرل نیازی کے سرنڈر سے قبل 6 دسمبر 1971ء کو ہی بھارت نے بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کو تسلیم کر کے اپنی دیرینہ خواہشات کی تکمیل کر لی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے مشرقی پاکستان کے بحران کو شروع سے ہی سنجیدگی سے لیا تھا جب اس بحران کا لاوا ابھی ابل کر باہر نہیں آیا تھا اسی لیے مسٹر بھٹو اس کی پیچیدگی اور اس کے خوفناک نتائج سے بھی بخوبی آگاہ تھے اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ 1966ء کے بعد جب سے شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کے مقبول اور فیصلہ کن لیڈر کے طور پر ابھرتے ہوئے آزاد بنگلہ دیش کے بانی بن کر سامنے آئے اس دوران مسٹر بھٹو حکومت کے بجائے اپوزیشن کی سیاست کر رہے تھے اور اس دور میں انہوں نے نئی پارٹی کی تشکیل، ایک عوامی تحریک کی قیادت اور ڈکٹیٹر شپ کے خاتمے کے خلاف بھرپور اور منظم جدوجہد کی تھی۔ اپنی ان مصروفیات کے باوجود بھی وہ مشرقی پاکستان میں پائی جانے والی بے چینی سے شروع دن سے ہی

پریشان تھے۔1970ء کے انتخابی نتائج کے بعد مسٹر بھٹو پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو چکی تھی وہ اب مغربی پاکستان کے مقبول ترین منتخب راہنما کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور انہوں نے ایک منتخب مغربی پاکستانی راہنما کے طور پر اس بحران میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے کی ہر لحہ کوشش کی جس کی تفصیل ان کی کتاب ''دی گریٹ ٹریجڈی'' میں چھپ چکی ہے جس میں شیخ مجیب کی صدر یحیٰی اور ان کی یحیٰی اور شیخ مجیب سے ملاقاتوں کے دوران ہونے والی گفتگو اور واقعات بھی شامل ہیں جس کو پڑھے بغیر ہم مشرقی پاکستان کے المیے پر ایک اہم ترین راہنما کی تجزیاتی اور مشاہداتی رائے سے محروم رہیں گے۔ جب بھارت نے مشرقی پاکستان میں فوجیں داخل کر دیں تو مرکز پر مسلط فوجی حکمرانوں کو سفارتی سطح پر اپنی تنہائی کا احساس جاگ اٹھا لہٰذا صدر یحیٰی خان نے 7 دسمبر 1971ء کو مخلوط حکومت کا اعلان کر دیا۔ مشرقی پاکستان سے نورالامین کو وزیرِ اعظم جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کو نائب وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ مقرر کر دیا گیا۔ یوں بحران کی انتہا میں فوجی جتا نے اقتدار میں سیاسی قوت کو شامل کر کے اس بات کی بھی تصدیق کر دی کہ فوجی قیادتیں ملکوں کو بحرانوں سے نہیں نکال سکتیں۔

مسٹر بھٹو کو نائب وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ مقرر کرتے ساتھ ہی اقوامِ متحدہ روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت بھارتی افواج مشرقی پاکستان کے شہر جیسور میں داخل ہو چکی تھیں اور مغربی پاکستان بری طرح بھارتی فضائی حملوں کا نشانہ بن رہا تھا۔ 8 دسمبر کو مسٹر بھٹو نیویارک روانگی کے لیے کابل کے راستے تہران روانہ ہوئے وہاں ایرانی راہنماؤں سے ملاقاتوں کے بعد نیویارک روانہ ہو گئے۔

کابل روانگی سے پہلے بھٹو نے عوام کے نام ایک پیغام میں کہا:

''آج میں بیرونی دورے پر ملک سے روانہ ہوتے ہوئے اپنا دل پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں۔ میرے دل کی دھڑکنیں آپ میں سے ہر ایک کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو ہر ممکن طریقے سے قومی خدمت کرنی چاہیے۔ وہ لوگ جو پچھلے پانچ سال تک میرے ساتھ جدوجہد میں شامل رہے ہیں میں ان لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر بھرپور اعتماد کیا۔ میں کہتا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ آزمائش کی کسی گھڑی میں آپ مجھے کسی دوسرے سے پیچھے نہیں پائیں گے۔''

ذوالفقار علی بھٹو 10 دسمبر 1971ء کو نیویارک کے جان ایف کینیڈی ہوائی اڈے پر اترے

www.bhutto.org

جہاں اقوامِ متحدہ میں اس وقت کے (بعد میں وزیرِ خارجہ) مستقل نمائندے آغا شاہی، مسٹر بھٹو کو لینے کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کو دو کاغذات دیئے۔ ان میں ایک مشرقی پاکستان کے گورنر ڈاکٹر اے ایم مالک کے فوجی مشیر جنرل راؤ فرمان علی کے پیغام کی نقل تھی جو جنرل راؤ نے ڈھاکہ سے اقوامِ متحدہ کے ذریعہ سیکرٹری جنرل اوتھان کو بھیجا تھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ:

"مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کے فوجیوں اور شہریوں کے بحفاظت انخلا میں مدد کی جائے۔"

جبکہ دوسرا خط حکومتِ پاکستان کی طرف سے تھا جس میں یحییٰ حکومت نے پاکستانی وفد کو ہدایت کی تھی کہ:

"ہر شرط پر صلح کرلیں۔"

ذوالفقار علی بھٹو نے جب ان کاغذات کے مندرجات پڑھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے کیونکہ ان پیغامات کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کا ڈرامہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے چونکہ اس سے پہلے سابق سوویت یونین نے سلامتی کونسل میں جنگ بندی اور فوجوں کی واپسی سے متعلق دو قراردادوں کو ویٹو کر دیا تھا جبکہ فرانس اور برطانیہ نے خاموشی کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔ یہ علامات بنگلہ دیش کے قیام کی تھیں۔ مشرقی پاکستان کے بحران میں اقوامِ متحدہ اور سلامتی کونسل نے التواء کی پالیسی جاری رکھی چونکہ جن عالمی طاقتوں نے بنگلہ دیش کے قیام کے راستے تعمیر کیے تھے وہ کیونکر بنگلہ دیش کے قیام کو رکواتے؟ جب مسٹر بھٹو اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے پہنچے تو بنگلہ دیش کے ڈرامے کے چند آخری ایکٹ ابھی باقی تھے مسٹر بھٹو نے سابق سوویت یونین کے نمائندے جیکب ملک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"روس کی امن دوستی کی باتوں سے بارود کی بو آتی ہے۔"

اس دوران بھارتی افواج مشرقی پاکستان میں پوری طرح اپنا کنٹرول قائم کر چکی تھیں۔ مسٹر بھٹو نے اس صورتحال کے بارے میں چین کے نمائندے اور امریکہ کے نمائندے جارج بش (یہی جارج بش بعد میں امریکہ کے صدر منتخب ہوئے) کے ساتھ ایک طویل ملاقات کی جس کے بعد بھارتی جارحیت کے خلاف 104 ووٹوں سے منظور شدہ قرارداد کے حوالے سے سلامتی کونسل کا اجلاس بلایا گیا۔ یہ اجلاس 12 دسمبر کو شروع ہوا۔ پوری دنیا کی نظریں پاکستان کے اس عظیم المیے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مسٹر بھٹو نے بھارتی وزیرِ خارجہ سورن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

www.bhutto.org

''سورن سنگھ تمہارے ہاتھ خون سے رنگے ہیں۔''

مسٹر بھٹو نے تمام نام نہاد سفارتی انداز مسترد کرتے ہوئے بھارت، سابق سوویت یونین، فرانس، برطانیہ اوران کے اتحادیوں کے کردار کو بےنقاب کیا۔ انہوں نے بڑے کھلے انداز میں اپنی تقریر میں کہا:

''میں سلامتی کونسل میں امن کی بھیک مانگنے نہیں آیا۔ انصاف لینے آیا ہوں۔ سلامتی کونسل نے کچھ نہ کیا تو ہمارا ایک ایک آدمی کٹ مرے گا۔ ہمارے پاس بھارت سے نصف اسلحہ بھی ہوتا تو آج ہم دہلی میں ہوتے۔ ہم تباہ ہو جائیں گے چین کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ چین پاکستان کا قابلِ اعتماد دوست ہے۔ ایشیا کا دوست، ساری دنیا کا دوست ہے۔ بھارت کو ایشیا کا داروغہ بننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تو بھارت کے دوسرے ہمسائے بھی نہیں بچ سکیں گے۔ روس کے بغیر خلیج بنگال کی ناکہ بندی نہیں ہو سکتی تھی۔ سورن سنگھ! سنہرا بنگال پاکستان کا ہے، تم نہیں چھین سکتے۔ ہم لڑیں گے اور آخری دم تک لڑیں گے۔''

15 دسمبر 1971ء کو سلامتی کونسل کا دوسرا اجلاس ہوا۔ اس وقت مشرقی پاکستان میں 16 دسمبر کی صبح تھی۔ ڈھاکہ میں پاکستان کا سورج ڈوب چکا تھا۔ بھارت کی چھاتہ بردار فوج ڈھاکہ میں اتر چکی تھی۔ اب سابق سوویت یونین بلاک کے اہم ملک پولینڈ نے جنگ بندی کی قرارداد پیش کر دی جو کہ ایک کھلا مذاق تھا۔ یہ قرارداد درحقیقت بنگلہ دیش کے قیام کی آخری دستاویز تھی۔ مسٹر بھٹو نے اس قرارداد پر بڑے جذباتی انداز میں تاریخی حقائق کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس قرارداد کو پھاڑتے ہوئے اپنے وفد کے ہمراہ اجلاس سے واپس لوٹ آئے۔ اس وقت تک مشرقی پاکستان کے کمانڈر جنرل اے کے نیازی نے بھارتی افواج کے کمانڈر جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے 90 ہزار فوج سمیت ہتھیار ڈال دیئے۔ مسٹر بھٹو نے اقوامِ متحدہ اور عالمی طاقتوں پر پولینڈ کی قرارداد اور ان کے چہروں سے نقاب اتار کر ان کی اصلی شکل پیش کرتے ہوئے کہا:

''اقوامِ متحدہ فراڈ ہے۔ تمہیں سیکرٹری جنرل کی نہیں، جلادِ اعظم کی ضرورت ہے۔ سلامتی کونسل ڈھاکہ کی بربادی کا انتظار کر رہی ہے۔ میں پاکستان کے ہتھیار ڈالنے کی کسی کارروائی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ سنو! میں پاکستان کے عوام کی

www.bhutto.org

آواز ہوں۔ وطن واپس جاؤں گا اور جنگ کروں گا۔ اہم عالمی تنازعات پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی یا ذیلی اداروں میں جو لمبی لمبی تقریریں ہوتی ہیں وہ اس حقیقت کے پیش نظر بے معنی دکھائی دیتی ہیں کہ ہر نمائندہ ووٹ دینے کی ہدایت اپنی حکومت سے لے کر آتا ہے اور وہاں پر تقریر کے ذریعہ کسی ملک کی رائے پر اثر انداز ہونے کا موقع ہی نہیں ہوتا۔"

"سلامتی کونسل نے فیصلے میں ٹال مٹول کے معاملے میں ہر دوسرے ایوان کو مات کر دیا ہے۔ میں اقوام متحدہ کے فراڈ اور سراب کو جانتا ہوں۔ نمائندے یہاں آتے ہیں اور ایک دوسرے کی تقریر سن کر کہتے ہیں ویل ڈن، ویل ڈن۔"

نیویارک میں 15 دسمبر اور مشرقی پاکستان میں 16 دسمبر کی صبح تھی۔ نیویارک میں مشہور زمانہ پولینڈ کی جنگ بندی کی قرارداد پیش کی جا رہی تھی اور ڈھاکہ میں بھارتی افواج نے آخری فیصلہ کن وار کر کے مشرقی پاکستان میں عسکری بالادستی قائم کر کے پاکستانی افواج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جس کی منظوری براہِ راست چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدرِ مملکت جنرل یحییٰ خان نے دی اور یوں پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم بحران اپنے انجام کو پہنچا۔ بنگلہ دیش کے قیام نے پاکستانی سیاست پر انمٹ اثرات مرتب کیے۔ اس المیے پر تاحال بحث جاری ہے اور اس کے کرداروں کے متعلق بھی الزامات کی ایک فہرست ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام نے پاکستانی سیاست پر جو اثرات مرتب کیے وہ تو ہم سب کے سامنے ہیں مگر بنگلہ دیش کے قیام نے بھارت کی یونین میں ایسی دراڑیں ڈالی ہیں کہ وہ ابھی تک سنبھلنے کے لیے اپنا کثیر سرمایہ اندرونی دفاع پر لگا رہا ہے۔ وہاں پر لاتعداد علیحدگی کی تحریکوں نے اس المیے کے بعد طاقت پکڑی۔ اسی لیے آج بھی ڈگمگاتا ہوا بھارت اپنے آپ کو بکھرنے سے محفوظ رکھنے میں کوشاں ہے۔

www.bhutto.org

دوسرا حصہ

www.bhutto.org

عوامی راج

20 دسمبر 1971ء کو ابر آلود موسم میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کا طیارہ نیو یارک سے اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اترا تو قوم کی امیدیں اس شخص سے وابستہ تھیں جو قوم کو بیدار کر کے ملک کی تعمیر نو کرنا چاہتا تھا۔ مسٹر بھٹو ایئر پورٹ سے سیدھے ایوانِ صدر پہنچے اور اس طرح اقتدار پاکستان کے پہلے منتخب شخص کو منتقل ہوا، جس کے ساتھ عوام کی بھرپور طاقت تھی اور یوں پاکستان کی تاریخ میں اقتدار کی منتقلی پہلی دفعہ دن کی روشنی میں ہوئی۔ مسٹر بھٹو اب مملکتِ پاکستان کے صدر بھی تھے اور سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی۔ چونکہ ملک میں کوئی آئینی ڈھانچہ موجود نہ تھا اس لیے مارشل لاء کو عبوری دور کے لیے جاری رکھنا لازمی تھا۔

اسی دن جنرل یحییٰ خان، جنرل عبدالحمید، لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ، میجر جنرل عمر، میجر جنرل خداداد، میجر جنرل کیانی اور میجر جنرل مٹھا کو ریٹائرڈ کر دیا گیا اور لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو قائم مقام کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں مسلح افواج نے جنرل نیازی کی قیادت میں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں نام نہاد "مردِ آہن" نے اپنا پستول بھارتی جرنیل جنرل اروڑہ کے سپرد کر کے اپنے سمیت ساری فوج کو نہتا کر دیا۔ وہی پستول ہندوستان نے فتح کی نشانی کے طور پر دلی کے عجائب گھر میں رکھ دیا ہے تاکہ اپنی نسلوں کو مسلمانوں کو دی گئی شکست سے متعارف کروا سکیں۔ نوے ہزار فوجی جنگی قیدی بنے اور مغربی پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ بھی بھارت فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لاتعداد مسائل آمریت اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی اور دنیا بھر کے سیاسی راہنما پاکستان کے قائم رہنے کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ چونکہ پاکستان اقتصادی اور سیاسی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا اور ہندوستان اپنی فتح کو مزید آگے بڑھانے کے درپے تھا۔ یوں عوامی حکومت کو لاتعداد مسائل کا سامنا تھا۔ مسٹر بھٹو نے 18 دسمبر 1971ء کو نیو یارک میں پاکستان روانگی سے قبل پریس کانفرنس کے دوران کہا جہاں وہ

www.bhutto.org

پاکستان کی طرف سے یو این میں نمائندگی کر رہے تھے۔

''ساری دنیا سے کہہ دو ہماری پیٹھ پر سے دور ہٹ جائے۔ ہم پر اپنا بوجھ حتیٰ کہ اپنا سایا تک نہ ڈالے۔ ہمیں صرف اپنی دعاؤں میں یاد رکھے۔ اس کے سوا ہمارے لیے کچھ نہ کرے۔

ہمیں مہلت دیں تاکہ ہم اپنے گھر کو ٹھیک ٹھاک کرلیں۔ ہم پر جو وقت آن پڑا ہے وہ بڑا سخت ہے مگر ہمارے اندر اس سخت وقت سے نمٹنے کی پوری ہمت ہے اور ہمیں اپنے اوپر بھروسہ ہے کہ ہم اپنے قومی جسم کے چاروں طرف بکھرے ہوئے اجزا کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

کوئی بات نہیں یہ بکھرے ہوئے اجزا خواہ کتنے چھوٹے چھوٹے ہیں ہم ان چھوٹے اجزا کو جوڑ کر ایک نیا مضبوط و مستحکم اور ہر لحہ آگے کی سمت رواں پاکستان تعمیر کریں گے۔''

اقتدار کی منتقلی کے بعد 20 دسمبر کی رات کو صدر بھٹو نے ٹی وی ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میں کسی سازش کے تحت آپ پر مسلط نہیں ہوا۔ میں آپ سے صاف کہہ رہا ہوں کہ مجھے اقتدار کی بھوک نہ تھی، میں اگر اقتدار کا بھوکا ہوتا تو تاشقند میں اغیار کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا اور بات چیت کو منقطع کر کے عوام کے پاس نہ آتا۔ میں عوام کے مفاد کے تحفظ کے لیے پچھلے ساڑھے پانچ سال سے مسلسل جدوجہد کرتا رہا ہوں حالانکہ میں دو آمروں کا نشانہ بنا لیکن پھر بھی میں نے عوامی جدوجہد جاری رکھی۔ مجھے جیل میں ڈالا گیا میری پیٹھ پر ابھی تک لاٹھی چارج کے نشانات ہیں۔ میرے خلاف آنسو گیس استعمال کی گئی۔ مجھ پر پانچ مرتبہ قاتلانہ حملے کیے گئے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب کسی صنعتی ادارے میں تالہ بندی نہیں ہوگی۔ مزدوروں سے کوئی صنعت کار کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کر پائے گا۔ میں صنعتی اداروں سے اپیل نہیں کرتا۔ ان سے واضح الفاظ میں کہتا ہوں کہ مزدور ہمارے آقا اور مالک ہیں۔ ان سے کوئی بدتمیزی نہ کی جائے یہی لوگ دراصل دولت پیدا کرنے والے ہیں۔

غریبو اور مزدورو! سرمایہ داروں اور صنعت کاروں سے بالکل نہ ڈرو۔ میری حکومت میں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا اور تمہاری حق تلفی کی کسی کو جرأت نہیں ہوگی۔''

مسٹر بھٹو کی اس تقریر نے قوم کو ایک نیا حوصلہ دیا اور ایک نئے پاکستان کے لیے جدوجہد کی۔ مسٹر بھٹو کے اس رویے نے ایک شکست خوردہ قوم میں روح پھونک دی تھی۔ اب پاکستانی نئے ولولے کے ساتھ جدوجہد کرنے پر تیار تھے۔ مسٹر بھٹو نے بائیس امیر ترین خاندانوں کے پاسپورٹ فوری طور پر

www.bhutto.org

ضبط کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ قوم کا خون چوسنے والوں کو بھاگنے نہیں دیا جائے گا جبکہ 23 دسمبر کو صدر پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے سانحہ مشرقی پاکستان کی تحقیقات کے لیے جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کر دیا۔

31 دسمبر کو مسٹر بھٹو نے ایک ایسے ادارے کا چارج خود سنبھالا جس نے مسٹر بھٹو اور پاکستان کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ایٹمی توانائی کمیشن کا چارج سنبھالنے کا مطلب تھا کہ اس کام کو خصوصی طور پر مکمل کیا جائے گا اور یہ کام بھٹو کی جدوجہد کا اہم زینہ ہے۔ مسٹر بھٹو شروع ہی سے اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ ''ہم ایٹم بم بنائیں گے۔ چاہے ہمیں اس کے لیے گھاس ہی کیوں نہ کھانا پڑے۔'' جنگِ ستمبر 1965ء میں ان کے اس جملے کو بین الاقوامی شہرت ملی تھی۔ مسٹر بھٹو نے اقتدار میں آتے ہی دوسرا بڑا اقدام جو کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے 20 بنیادی صنعتیں بغیر کسی معاوضہ کے قومی تحویل میں لے لیں۔

پاکستان میں جن معاشی و اقتصادی اور زرعی تبدیلیوں کا ذکر پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے منشور میں کیا تھا۔ وہ بڑی انقلابی تبدیلیاں ہیں۔ اگر پاکستان پیپلز پارٹی کو سقوطِ ڈھاکہ کی شکل میں مسائل ورثے میں نہ ملتے تو ان پالیسیوں پر عمل بڑا آسان ہو جاتا۔ عوامی حکومت کو دو طرح کے مسائل کا سامنا تھا۔ اندرونی اور بیرونی مسائل۔ اندرونی مسائل میں اقتصادی بدحالی، آئینی بحران اور عوام میں شکست وریخت کے احساس سمیت علیحدگی پسندوں کا سر اٹھانا، بیرونی مسائل میں پاکستان کی عالمی برادری میں بدنامی، جو مشرقی پاکستان میں پاکستانی حکمرانوں نے فوجی آپریشن کے ذریعہ کی۔ فوج کے مظالم کی داستانوں نے دنیا بھر میں پاکستان کو رسوا کر کے رکھ دیا تھا۔ ہم سیاسی طور پر دنیا سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئے تھے۔ بیرونی مسائل میں دوسرا مسئلہ ہندوستان کے ساتھ جنگی قیدیوں کی واپسی اور پانچ ہزار مربع میل کے علاقے کی واپسی کا تھا جبکہ بنگلہ دیش یہ کہہ رہا تھا کہ ہم جنگی جرائم میں ملوث فوجی افسروں کے خلاف مقدمات چلائیں گے۔ اقتصادی طور پر بدحالی کا یہ حال تھا کہ عالمی بنک کے سربراہ میکنامارا نے کہا تھا کہ ''پاکستان کی اقتصادی بدحالی پاکستان کو تباہی کے گڑھے تک لے آئی ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔'' بھٹو حکومت نے ورلڈ بنک کو یہ کہہ دیا کہ آپ کی مرتب کردہ 5 سالہ منصوبہ بندی ہی پاکستان کی اقتصادی بدحالی کا سبب ہے اور آپ ہی اس کے ذمہ دار ہیں لہٰذا اس بحران میں ہم آپ کے قرضے واپس نہیں کر سکتے۔ دنیا بھر کے ممالک نے پاکستان کے ساتھ تجارت اور سرمایہ کاری میں عدم دلچسپی کا رویہ اپنایا ہوا تھا جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کا پروگرام ایک انقلابی پروگرام تھا۔ اس پر عمل درآمد کے لیے بڑے حوصلے

اور جرأت کی ضرورت تھی۔ یہ بھٹو کے لیے ایک چیلنج تھا لیکن مسٹر بھٹو نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنے ارادوں اور پارٹی کے منشور پر کسی حد تک عملدرآمد کرنے کا راستہ اپنائے رکھا۔ جس سے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کی ناراضگی بھی لازمی تھی اور وہ مسٹر بھٹو کے لیے مسائل بھی کھڑے کرنے لگے تھے۔ اپوزیشن نے ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کا فیصلہ کیا تا کہ بھٹو حکومت کا مقابلہ کیا جائے اور عوامی اصلاحات کو ناکام بنا دیا جائے نتیجتاً عوام بھٹو کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

لیکن مسٹر بھٹو نے ان مسائل اور بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے جمہوری راستے پر چلنے کی ہر ممکن سعی کی تا کہ جمہوریت کو کسی قسم کا دھچکا نہ لگے۔ 10 جنوری 1972ء کو پاکستان پیپلز پارٹی نے نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیتِ علمائے اسلام کے ساتھ تعاون کا سمجھوتہ کیا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اپنے ملک کا وقار بحال کرنے کے لیے جس جانفشانی اور فراست کے ساتھ اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے تھے وہ کوششیں بڑی قابلِ تعریف ہیں۔ مسٹر بھٹو نے ہمیشہ ہی آزاد خارجہ پالیسی پر زور دیا تھا جس سے زیادہ سے زیادہ قومی مفادات حاصل کیے جا سکیں۔ جنوری ہی کے مہینے میں مسٹر بھٹو نے خارجہ تعلقات کی نئی حکمتِ عملی کے تحت ظاہر شاہ کے ساتھ مذاکرات کیے اور ہنگامی بنیادوں پر ترکی، مراکش، مصر، شام اور چین کے دورے کیے۔ اسی طرح پاکستان دوستوں کی تلاش میں کوشاں تھا اور اس زہر کو زائل کرنے میں کامیاب نظر آ رہا تھا جو پاکستان کے خلاف استعمال کیا گیا تھا۔ اڑھائی ماہ کی مختصر مدت میں دولتِ مشترکہ سے علیحدگی اور پھر امریکہ کی طرف سے فوجی اور اقتصادی امداد کی بحالی کا اعلان یقیناً مسٹر بھٹو کی آزاد خارجہ پالیسی کے سبب ہوا۔ سابق سوویت یونین کا مارچ کے مہینے میں پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو کا دورہ بھی پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں کو عمل میں لانے کا سبب بنا۔ مسٹر بھٹو کو مغربی ممالک اور سوشلسٹ ممالک کے ساتھ متوازن خارجہ پالیسی اپناتے ہوئے بین الاقوامی طور پر جنگی قیدیوں اور پاکستان کے علاقے کی واپسی پر دباؤ ڈالوانے میں کامیابی ہوئی۔ مسٹر بھٹو کو اسلامی ممالک اور تیسری دنیا کے چند ممالک کو پاکستان کے قریب لانے میں جلدی کامیابی ہوئی۔ اس طرح ہندوستان کے ساتھ مذاکرات میں ایک حوصلے اور اعتماد کے علاوہ دنیا کی حمایت پاکستان کے مؤقف کے حق میں کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔

اپوزیشن نے جلد ہی عوامی حکومت کے خلاف مورچہ زنی شروع کر دی۔ جمعیت علمائے اسلام اور نیپ نے اس معاہدے سے اپریل ہی میں علیحدگی کا اعلان کر دیا جو پی پی پی حکومت کے ساتھ 10

www.bhutto.org

جنوری کو طے پایا۔ اپوزیشن نے "بنگلہ دیش نامنظور" کے نعرے کو عوامی حکومت کے لیے ایک مسئلے کے طور پر اپنایا۔ اپوزیشن بنگلہ دیش کے ایشو کو قوت دینے کے درپے تھی اور اس کا یہ مؤقف تھا کہ بھٹو حکومت ہندوستان سے جنگی قیدیوں اور علاقے کی واپسی عمل میں نہیں لاسکتی کیونکہ ایسی صورت میں حکومت بنگلہ دیش کو منظور کرنے میں مجبور ہوگی۔

بھٹو نے فرانسیسی اخبار "لی موند" کو ایک انٹرویو میں کہا:

"یہ ان شکست خوردہ پارٹیوں کی داخلی سیاست ہے جو بنگلہ دیش کے جذباتی مسئلہ پر خود کو بحال کرنا چاہتے ہیں۔ بنگلہ دیش کا مسئلہ جذبات سے معمور ہے لیکن اگر میں اپوزیشن میں ہوتا تو ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا جو وہ کر رہے ہیں۔ میں اس صورت میں بھی مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے اچھے تعلقات قائم کرنے کا خواہشمند ہوتا لیکن یہ لوگ عوام کے جذبات مشتعل کر رہے ہیں جن کا واحد مقصد حکومت کو خوف زدہ کرنا، اسے کمزور کرنا اور غیر مقبول بنانا ہے۔ یہی ان کا بنیادی مقصد ہے۔ وہ طلبا کو گلیوں میں لانا چاہتے ہیں، مظاہرے کرنا چاہتے ہیں اور تشدد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کو پسند نہیں کرتے وہ مسٹر بھٹو کو پسند نہیں کرتے کیونکہ اس نے انہیں انتخابات میں بری طرح شکست دی ہے۔ وہ بدلہ لینا چاہتے ہیں ان کی یہ آخری کوشش مایوس کن اور حسرت ناک ہے۔ ان پر ترس کرنا چاہیے میں ان پر ترس کھاتا ہوں کیونکہ واقعی وہ کھوکھلے لوگ ہیں۔ یہ عقل سے خارج بوڑھے اور مکمل طور پر کمزور ہیں اور اب یہ آخری کک لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی سے یہ کام کر رہے ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ کام کر چکا ہوں میں ان کا نقطۂ نظر سمجھتا ہوں۔ میں ان کی جرأت سے بھی واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کس پانی میں تیر سکتے ہیں اور کس میں نہیں۔ میں ان کے چہرے کے نقوش پہچانتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس طرح کا ردعمل ظاہر کریں گے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کیوں؟

شملہ معاہدہ کے فوراً بعد وہ کراچی میں زبان کا مسئلہ کھڑا کر کے لوگوں کی توجہ ہٹانا چاہتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ جب فوجوں کی واپسی ہوگی وہ کامیابی کو مٹانے کے لیے کچھ بدلے ہوئے ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔"

مسٹر بھٹو کے ان خیالات سے یہ آگاہی ہوتی ہے کہ اپوزیشن نے کس طرح بحران کے وقت بھی عوام کو جذباتی حوالے سے جمہوری حکومت کے خلاف اکسانے کے لیے بنگلہ دیش کے معاملے کو ایک قومی ایشو بنانا چاہا جس میں اپوزیشن کو یقیناً مایوسی ہوئی۔

www.bhutto.org

21 اپریل 1972ء کو حکومت عبوری آئین نافذ کرنے اور مارشل لاء ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مسٹر بھٹو نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ چھوڑ دیا اور ملک میں مکمل جمہوریت بحال کر دی گئی۔ مسٹر بھٹو نے اقتدار سنبھالتے وقت وعدہ کیا تھا کہ میں ایک لمحہ بھی مارشل لاء جاری نہ رکھوں گا، جب ملک میں آئین تیار ہو جائے گا مارشل لاء ختم کر دیا جائے گا۔ تقریباً چار ماہ کی قلیل مدت میں بھٹو حکومت کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ قوم کو مارشل لاء کی لعنت سے نجات دلا کر ملک کو آئینی راستے پر ڈال دیا۔

28 جون 1972ء کو ذوالفقار علی بھٹو ہندوستان سے مذاکرات کے لیے شملہ چلے گئے۔ یہ ایک ایسا موقع تھا کہ ایک شکست خوردہ ملک کا حکمران ایک فاتح ملک سے مذاکرات کے لیے گیا تھا۔ یہ مذاکرات تاشقند مذاکرات سے یکسر مختلف تھے۔ تاشقند میں پاکستان کی پوزیشن شملہ سے زیادہ مضبوط تھی۔ اب ہمارا علاقہ اور قیدی ہندوستان کے پاس تھے لیکن بڑے ممالک ہندوستان کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جب مسٹر بھٹو ہندوستان کے ساتھ مذاکرات کرنے گئے تو انہوں نے اپوزیشن کو بھی اعتماد میں لیا۔ مسٹر بھٹو ایک ماہر ڈپلومیٹ بھی تھے۔ اندرا گاندھی کو شاید یہ علم نہ تھا کہ مسٹر بھٹو میں مذاکرات کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ پھر بھی شملہ مذاکرات میں کامیاب ہوتے نظر نہ آ رہے تھے۔ لوگ مایوس ہو چکے تھے۔ مسٹر بھٹو اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور گفتگو کو چلانا بھی چاہتے تھے۔ مسٹر پیلو مودی اپنی کتاب ''ذلفی میرا دوست'' میں لکھتے ہیں کہ ''معاہدہ ہوتے نظر نہ آتا تھا۔''

2 جولائی 1972ء کو رات کے بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر دونوں ملکوں کے سربراہوں نے شملہ معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور یوں مسٹر بھٹو کی کامیاب ڈپلومیسی کی بدولت ایک مشہور زمانہ پاک و ہند معاہدہ ظہور پذیر ہوا۔ حقیقتاً مسٹر بھٹو نے اس معاہدے کے روپ میں ڈپلومیٹک میدان میں اندرا گاندھی کو شکست سے دوچار کیا مسٹر بھٹو نے کہا کہ:

''میں ہاکی میچ دیکھنے کے لیے شملہ نہیں گیا تھا میں گول کرنے کے لیے شملہ گیا تھا۔ دیکھو! کیسا گول کیا۔''

مسٹر بھٹو نے شملہ معاہدہ کے بعد ایک غیر ملکی صحافی کو کہا ''شملہ معاہدہ ایک حقیقت ہے اور اس قسم کی ڈپلومیسی کرنے والا میں آخری شخص ہوں گا۔'' حقیقتاً ایسا ہی ہوا مسٹر بھٹو نے شملہ معاہدہ کے دوران جو ڈپلومیسی اپنائی آج تک پاکستان میں اس قسم کی ڈپلومیسی کرنے والا کوئی نہیں آ سکا۔

شملہ معاہدہ پاکستان کی سیاسی فتح ہے، شملہ معاہدہ پاکستان کی ایک ایسی فتح ہے کہ جس نے

ہندوستان کو حیرت میں ڈال دیا۔ جو جنگ ہم نے ملکی سرحدوں پر ہاری وہ جنگ مسٹر بھٹو نے ہندوستان کے اندر جا کر میز پر جیت لی۔ اس معاہدے کے تحت جہاں پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات بحال ہونے کے امکانات پیدا ہوئے وہاں اس معاہدے کے تحت کشمیر کا مسئلہ متنازع مسئلہ طے پایا، جس کو ہندوستان کبھی بھی متنازع کہنے پر آمادہ نہ تھا اور یہ بھی طے پایا کہ آئندہ معاملات دونوں فریقین باہمی گفتگو سے حل کریں گے اور کسی تیسرے ثالث کو بیچ میں نہیں ڈالیں گے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ شملہ معاہدہ نے امن کے راستے کھول دیئے۔ یہ ایک باعزت معاہدہ ہے۔ اس معاہدے میں قوم کے وقار کو مدنظر رکھ کر دوستی کا راستہ اختیار کیا گیا۔ یہ باوقار معاہدہ ہی ہے تو ہم آج بھی ہندوستان کے ساتھ شملہ معاہدے کے تحت بات چیت کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے فرانسیسی اخبار "لی مونڈ" کے ایک سوال کہ "آپ اب بھی ایک ہزار سال تک جنگ جاری رکھنے پر یقین رکھتے ہیں" کے جواب میں کہا کہ "اس بات کا فیصلہ عوام کریں گے۔ آپ جانتے ہیں اگر میں نے عوام کو غلط تأثر دیا ہوتا تو انہوں نے اسے رد کر دیا ہوتا۔ یہ بات طول کیوں پکڑ گئی دو فقرے تو دہرائے جاتے ہیں لیکن ہمیں دوسرے الفاظ یاد نہیں رہتے۔ ہم خیر مقدم بھی کرتے ہیں۔ ہم سلام بھی کرتے ہیں۔ لوگ یہ نہیں پوچھتے کہ کیا میں اب بھی خیر مقدم میں یقین رکھتا ہوں لیکن دو باتیں یاد رکھیں کیونکہ وہ ان مسائل کی جان ہیں۔ انہوں نے تأثر قبول کر لیا جو ایک تو ہزار سال جنگ کا تھا۔ میں نے یہ بات استعارہ کے لحاظ سے کہی تھی۔ اس بات کو کہنے سے میرا مطلب برصغیر کی ساری تاریخ سے متعلق تھا۔ آخر کار گزشتہ ایک ہزار سال میں یہاں تصادم رہا ہے۔ اب اگر ہمارا ماضی ایک ہزار سال ہے تو ہمارا مستقبل بھی ایک ہزار سال ہو سکتا ہے۔"

پاکستان کے اندر اپوزیشن کے راہنماؤں نے مسٹر بھٹو کے اس جملے کو بھی ایشو بنا کر مسٹر بھٹو کو DAMAGE کرنے کی کوشش کی کہ ایک طرف تو مسٹر بھٹو ہزار سال لڑنے کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف شملہ معاہدہ اور پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسٹر بھٹو نے جہاں ہندوستان کے ساتھ امن اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا وہاں مسٹر بھٹو نے اپنے وطن کے دفاع کے لیے پچھلی حکومتوں سے کہیں زیادہ توجہ دی۔ اپوزیشن نے شملہ معاہدہ پر دستخط کے بعد عوام میں یہ تأثر قائم کرنے کی کوشش کی کہ جموں و کشمیر کا سودا کر دیا گیا ہے اور مسٹر بھٹو نے شملہ میں پاکستان کو بیچ ڈالا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپوزیشن کا یہ الزام از خود غلط ثابت ہوا اور اس بات کی دلیل ہے کہ آج پاکستان شملہ معاہدے کے تحت بات چیت کرنے کے لیے بار بار اپیلیں کر رہا ہے۔ لہٰذا اس معاہدے کو جاننے کے لیے مسٹر بھٹو کا انٹرویو توجہ طلب ہے جو انہوں نے "لی

www.bhutto.org

موننڈ" کو دسمبر 1972ء کو دیا۔ اس کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

سوال: کیا یہ واقعہ ہے کہ فوجوں کی واپسی پر معاہدے کے بعد مسئلۂ کشمیر حل ہو گیا؟

صدر: ہرگز نہیں مسئلۂ کشمیر حل نہیں ہوا ہے کیونکہ خود معاہدۂ شملہ میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ دونوں فریقوں کو تسلیم شدہ پوزیشن پر اثر انداز ہوئے بغیر کنٹرول لائن کا تعین کیا جائے گا۔ خود دستاویز میں اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے چنانچہ دستاویز میں ریاستِ جموں و کشمیر کی متنازع حیثیت تسلیم کی گئی ہے مزید برآں اگر مسئلۂ کشمیر کو اس صورت سے طے کرنا ہوتا تو اسے کنٹرول لائن نہ کہا جاتا بلکہ بین الاقوامی سرحد اور کنٹرول لائن کے درمیان ایک بین فرق ہے۔ یہ ہوا دوسرا نکتہ۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جب تھا کو چک کے چھوٹے سے علاقہ پر تعطل پیدا ہو گیا تھا تو ہم نے کہا تھا کہ اس کے بدلے میں ہمیں کوئی دوسرا علاقہ دیا جائے۔ ہمیں یہ علاقہ اس کے بدلے میں مل گیا۔ علاقوں کا اس قسم کا تبادلہ تسلیم شدہ بین الاقوامی سرحدوں پر نہیں ہوا کرتا صرف متنازع علاقے کی صورت میں اس نوعیت کا باہمی تبادلہ ممکن ہو سکتا ہے۔ چوتھے یہ کہ ہندوستانی وزیرِ خارجہ اور حکومتِ ہندوستان نے بھی یہ بیانات دیئے ہیں کہ یہ صرف ایک نئی جنگ بندی لائن ہے اور اس سے جموں و کشمیر کا سوال طے نہیں پایا۔ ہم نے اس معاملے میں اپنی پوزیشن بالکل واضح کر دی ہے۔

سوال: جنابِ صدر آپ کے خیال میں آئندہ اقدام کیا ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی پوزیشن یہ ہے کہ آپ پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کریں اور اس کے بعد عدم جارحیت کے معاہدے پر یا اس قسم کے کسی معاہدے پر رضامند ہوں۔ آپ کے خیال میں آئندہ اقدام کیا ہونا چاہیے؟

صدر: ہمارے خیال میں آئندہ اقدام جو درحقیقت واقفیت پر مبنی ہے، یہ ہے: اگر آپ معاہدۂ شملہ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں کہا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے افسران ملاقات کریں اور مسز اندرا گاندھی اور میرے درمیان دوسری ملاقات کے متعلق باتیں طے کریں۔ ہم نے معاہدۂ شملہ پر دستخط کیے ہیں اور ہم اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ اس معاہدے کے لحاظ سے دونوں ممالک کے لیے یعنی ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے یہی اگلا منطقی اقدام ہے ہمیں امید ہے کہ فوجوں کی واپسی مکمل ہونے کے بعد ہم دہلی میں یا یہاں دونوں ملکوں کے افسروں کے درمیان ملاقات کے لیے حکومتِ ہندوستان سے رجوع کر سکتے ہیں بشرطیکہ حکومتِ ہندوستان اس سے قبل اس بارے میں ہم سے رجوع نہ کرے۔ یہ افسران طریقۂ کار پر اور آئندہ میٹنگ کے ایجنڈے پر غور و خوض کر سکتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم معاملہ ہمارے ستر ہزار جنگی قیدیوں اور تقریباً بیس ہزار شہریوں کی واپسی کا

www.bhutto.org

ہے جن میں عورتیں، بچے اور صحافی بھی شامل ہیں۔ ہمارے تقریباً ستر ہزار فوجیوں کو ایک انسانی عجائب گھر کی طرح پنجروں میں بند رکھا گیا ہے اور دنیا میں ان کے لیے کوئی آنسو نہیں بہا رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں ان نام نہاد مظالم کے لیے تو جو وہاں خانہ جنگی کے زمانے میں ہو رہے تھے دنیا کثرت سے آنسو بہاتی ہے۔ خانہ جنگیاں ہمیشہ خوفناک ہوتی ہیں۔ قوموں کے درمیان جنگ سے بھی زیادہ خوفناک۔ یہ سپین کی خانہ جنگی کی طرح خانہ جنگی تھی جس نے انسانی زندگیوں پر گہرے نشانات چھوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ میں بھی خانہ جنگی ہو چکی ہے اور نائجیریا میں بھی، ہمارے یہاں بھی خانہ جنگی تھی اور ہمارا مقصد ملک کی سالمیت اور اتحاد کو برقرار رکھنا ہی تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے ہوں وہ افسوسناک ہوں لیکن پاکستان 25 سال قبل اس ملک کے دونوں حصوں کی آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں عالم وجود میں آیا تھا۔ یہ اتحاد استعمار پسندوں نے نہیں کیا تھا بلکہ درحقیقت انہوں نے تو دونوں علاقوں کو ایک مملکت کی صورت میں ملانے کی مخالفت کی تھی۔ جب پاکستان ایک متحدہ مملکت کی حیثیت سے اپنے وجود کے لیے جنگ کر رہا تھا تو لوگوں نے حق خود اختیاری کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ پاکستان ایک مملکت تھا جو مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں متحد تھا۔ یہ معاملہ بدیہی طور پر علیحدہ ہونے کا معاملہ تھا۔ انہوں نے اسے حق خود اختیاری کا نام دیا اور کہا کہ غریب بنگالیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ خود ہمارے آدمی انہیں کیوں قتل کرتے؟ غیر مہذب اور سفاک لوگوں کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن یہ بات فراموش کر دی گئی کہ مملکت کے ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ مملکت کی سالمیت کا تحفظ کرے اگر کل برٹانی کے باشندے فرانس سے علیحدہ ہونے کی کوشش کریں تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ علیحدگی کو روکنے کے لیے فرانس کی یہ کوشش نامناسب ہے۔ ہم یہاں سے اپنے اینڈری مال راکس کو اس معاملے پر تقریر کرنے کے لیے نہیں بھیجیں گے بلکہ ہم کہیں گے کہ نہیں یہ فرانس کا ایک اندرونی معاملہ ہے اور انہیں اپنے قومی اتحاد کے تحفظ کی کوشش کرنے کا پورا حق ہے۔ درحقیقت ہم قومی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے ان کی کوششوں سے ہمدردی رکھیں گے۔ اب لیجئے بنگلہ دیش کی اس مملکت کو یہ مملکت ہندوستانی جارحیت کے نتیجہ میں قائم ہوئی ہے ہم نہیں جانتے کہ مملکتوں کے درمیان آئندہ تعلقات پر اس مثال کا کیا اثر پڑے گا۔ بائبل میں کہا گیا ہے کہ ''جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔'' اگر کوئی ملک دوسرے ملک کی بھٹی میں اپنی انگلیاں ڈالتا ہے تو وہ انگلیاں یقیناً جلیں گی۔ لہٰذا جن لوگوں نے اس آگ میں اپنی انگلیاں ڈالی ہیں وہ انگلیاں جلنے والی ہیں ممکن ہے وہ اب تک جل اٹھی ہوں۔ اگر آج

www.bhutto.org

آپ ڈھاکہ جائیں تو آپ ہندوستانی "نجات دہندگان" نام نہاد نجات دہندگان کے متعلق ایک مختلف رویہ دیکھیں گے لیکن آپ دیکھیں گے کہ کس قسم کی باتیں رونما ہوں گی۔ اس مثال کا نتیجہ آئندہ دیکھنے میں آئے گا۔ دنیا کے بہت سے ملکوں نے بعض مغربی یورپ کے ملکوں برطانیہ اور بعض دوسرے ملکوں نے اس مثال کی حمایت کی تھی۔ کئی ملکوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ اسے اقوام متحدہ کا ممبر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں تاہم خدا کا شکر ہے کہ اب بھی ایسی مملکتیں موجود ہیں جو بین الاقوامی نظام کے اصولوں پر یقین رکھتی ہیں اور انہوں نے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بغیر اس ناپاک داخلے کو روکا ہے۔ جنگ ختم ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ اس کے بعد معاہدۂ شملہ ہوا۔ اب اس معاہدۂ شملہ کے نتیجہ میں ہمیں امید ہے کہ فوجوں کی واپسی 20 یا 21 تاریخ تک مکمل ہو جائے گی۔ اب ان جنگی قیدیوں کو ہندوستانی پنجروں میں ہندوستانی انسانی عجائب گھروں میں یرغمال کے طور پر رکھنے کی کیا مناسب وجہ ہے؟ ان جنگی قیدیوں کو اس طرح رکھا جا رہا ہے گویا وہ جانور ہیں۔ آخر اس کی کیا معقول وجہ ہے؟ ہندوستان نے بنگلہ دیش قائم کرنے کے لیے مسلح جارحیت کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ آج یہ مملکت اپنی آزادی کی سالگرہ منا رہی ہے۔ ایک سال ہوا جنگ ختم ہو چکی۔

جنگ بندی ہو چکی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں معاہدۂ شملہ پر 2 جولائی کو دستخط ہوئے تھے۔ اب 20 یا 21 دسمبر کو فوجوں کی واپسی عمل میں آ رہی ہے۔ ہمارے جنگی قیدیوں کو ہندوستان میں مقید رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب آپ فوجوں کو واپس کر لیں تو آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تعلقات پرامن رہیں گے اور جنگ کا کوئی امکان نہیں ورنہ آپ اپنی فوجوں کو واپس نہیں کرتے بلکہ مقبوضہ علاقے میں ان کو رکھنے دیتے ہیں۔ اسرائیل اور مصر میں جنگی قیدیوں کو واپس کیا جا چکا ہے حالانکہ ان کی فوجوں کی واپسی عمل میں نہیں آئی بلکہ منطقی بات تو یہ ہے کہ فوجوں کی واپسی سے قبل جنگی قیدیوں کو واپس کیا جانا چاہیے لیکن یہاں الٹی بات ہے گھوڑے کے آگے گاڑی لگائی گئی ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہمارے فوجی اور شہری قیدیوں کو ہندوستان میں مقید رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ دیولالی میں ایسے واقعات وہاں ہو چکے ہیں جن میں انہیں سفاکانہ طور پر ہلاک کر ڈالا گیا ہے۔ ہم نے کسی شخص کو ان واقعات پر روتے یا احتجاج کرتے نہیں سنا۔ اہم ترین نکتہ تین جینوا کنونشنوں کی موجودگی کا ہے۔ کیا ان کنونشنوں میں ایسی کوئی شق موجود ہے جس میں کہا گیا ہو کہ ان کا اطلاق پاکستان کے سوا تمام دنیا پر ہوگا؟ پاکستان کے ٹکڑے ہونے پر دنیا کے ردعمل میں پاکستان کے ساتھ ایک انوکھا رویہ اختیار کیا گیا۔ اگر دنیا کی کسی اور مملکت کے اس طرح

www.bhutto.org

ٹکڑے ہوئے جس طرح ہمارے ملک کے ٹکڑے ہوتے ہیں تو اس پر بین الاقوامی طور پر احتجاجات ہوتے تو پھر کیا وجہ ہے کہ بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی اصولوں پر عملدرآمد کے سلسلے میں ہمارے ساتھ ایک انوکھا رویہ اختیار کیا جارہا ہے؟ جنیوا کنونشنوں میں کہاں لکھا ہے کہ صرف پاکستانی جنگی قیدیوں کو جنگ بندی کے بعد بھی واپس نہیں کیا جائے گا؟ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کا پاکستان پر اطلاق نہیں ہوگا۔ یہ ایک بہت اہم اخلاقی اور سیاسی سوال ہے ہم خود تو اس سلسلے میں اپنی انتہائی کوششیں کررہے ہیں لیکن ہمیں وہ ہمدردی نظر نہیں آئی جس کا اظہار علیحدگی پسندی کے مقصد کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ ہمدردی اس انسانی مسئلہ کے لیے نظر نہیں آرہی بلکہ اس کے برخلاف آپ اس طرح کے ایک بنیادی انسانی مسئلہ کے بارے میں ایک مجرمانہ غفلت دیکھتے ہیں لہٰذا یقیناً یہ انتہائی اہم مسئلہ ہے یعنی جنگی قیدیوں کا مسئلہ ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جب تک جنگی قیدی ہندوستان میں رہیں گے ہم کشمیر کے بارے میں بات تک نہیں کرسکتے کیونکہ اس کے معنی جبر کے ماحول میں مذاکرات کرنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہم سودے بازی کو بھی پسند نہیں کرتے۔ اگر ہم سودے بازی پر یقین رکھتے تو میں 7 جنوری کو شیخ مجیب الرحمٰن کو غیر مشروط طور پر کبھی رہا نہ کرتا۔ میں نے انہیں اس لیے رہا کیا کہ میں مستقبل پر نظر ڈالنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں ایک بہتر مستقبل چاہتا تھا۔ میں جلد اور معقول طریقے سے اپنے تمام مسائل حل کرنے کے لیے ایک اچھی فضاء قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ ہم دیگر مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کرسکتے لیکن ہم نے شیخ مجیب الرحمٰن کو غیر مشروط طور پر رہا کیا اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ اس کا کوئی بدل نہیں دیا گیا۔ میں کسی تنگ معنی میں بدل نہیں چاہتا۔ جب تک ہمارے تمام مسائل کا مکمل تصفیہ نہ ہوجائے ہمیں بنگلہ دیش تسلیم کرنے سے کس فائدہ کی توقع ہوسکتی ہے؟ آج مجیب الرحمٰن آپ کو یہ بتائیں گے کہ اگر بنگلہ دیش تسلیم کرلیا جائے تو سب باتیں ٹھیک ہوجائیں گی۔ ہم نے پہلے بھی یہ سنا تھا کہ اگر مجیب الرحمٰن کو رہا کردیا جائے تو سب باتیں ٹھیک ہوجائیں گی۔ آپ کو یہ مقولہ یاد ہوگا کہ مومن ایک سوراخ سے دومرتبہ نہیں ڈسا جاسکتا۔ ہم ان فرضی داستانوں پر یقین نہیں کرسکتے۔ ہم سنتے ہیں کہ دنیا ہمارے معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتی البتہ دیگر ہر معاملہ سے اس کو دلچسپی ہے، اسے چاند کے آدمیوں سے دلچسپی ہے، مریخ سے دلچسپی ہے، اسے مالٹا سے دلچسپی ہے، اسے لی مونڈ سے دلچسپی ہے، اسے سنگاپور سے دلچسپی ہے لیکن گیارہ کروڑ انسانوں کی یہ مملکت جو یورپ کی بیشتر مملکتوں سے بھی بڑی ہے بحرِ ہند کے کنارے واقع ہے بحرِ ہند اس وقت تو بڑا اہم بن جاتا ہے جب وہ ہندوستان کا ساحل

www.bhutto.org

چھوٹے لیکن جب پاکستان کے ساحل سے ٹکراتا ہے تو اس کی اہمیت نہیں سمجھی جاتی۔ خلیج فارس کو اس وقت اہم سمجھا جاتا ہے جب وہ امارتوں کے ساحل سے ملے لیکن جب ساحلِ مکران سے وہ چھوئے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ کیا دنیا کو نہیں معلوم کہ ہم افغانستان، روس اور چین کے پڑوسی ہیں؟ پاکستان کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن یہ ہے وہ طریقہ جس سے دنیا پاکستان کو دیکھتی ہے۔ لہٰذا اب ہم مزید فرضی داستانوں کو نہیں سن سکتے۔ اب سمجھوتے کے لیے ٹھوس مذاکرات ہونے چاہئیں۔ ہم مناسب وقت پر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ہمیں اپنے جنگی قیدی واپس مل جائیں اور ان کی واپسی کے لیے مکمل ضمانت دی جائے اور طریقۂ کار طے پائے۔ ہم اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے جنگی قیدی وہاں مقید رہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کل وہ جنگی قیدیوں کے مسئلے کو کسی اور مسئلہ سے منسلک کر دیں گے اور اس کے بعد کسی اور ہی مسئلہ سے۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں ہمیں بڑا تلخ تجربہ ہوا ہے۔ ہم نے نیک نیتی سے کام لیا لیکن دوسرے فریق نے اس کا خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ہمیں اس امر کا قطعاً یقین دلایا جائے کہ اول ہمارے جنگی قیدیوں کو واپس کیا جائے گا۔ دوم کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا یعنی وہ نام نہاد مقدمات جو جناب مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان میں چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور سوم پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان غیر ملکی قرضوں اور اثاثوں اور مالی ذمہ داریوں کے تمام سوالات کو اطمینان بخش طریقے سے طے کیا جائے گا۔ قبل اس کے کہ ہم تسلیم کرنے کی جانب کوئی قدم اٹھا سکیں، ماضی کی ان باتوں کو لازماً طے کرنا ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر یک طرفہ کے بجائے قطعی دو طرفہ بنیاد پر کارروائی کرنا ہوگی۔ یہ کام ہمہ گیر بنیاد پر کرنا ہوگا یعنی جہاں تک جنگی قیدیوں اور تسلیم کرنے کا سوال ہے اس کے متعلق ہندوستان کے ساتھ دیگر بہت سے مسائل پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان 1965ء سے کوئی تجارت نہیں ہو رہی ہے حالانکہ ہم ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ ان کو بھی نقصان ہوا ہے اور ہمیں بھی۔ ہم تجارت کی بحالی، شہری پرواز کے سمجھوتوں، مواصلات، ڈاک، تار اور سفارتی تعلقات کی بحالی کے امور پر گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تمام باتیں خصوصاً ایسی صورت میں کافی اہمیت رکھتی ہیں جب ایک سال ہوئے جنگ ہو چکی ہو اور ہمارے ملک کو ٹکڑے کرنے کے لیے انتہائی فاسد طریقے اختیار کیے جا چکے ہوں۔ ہندوستان نے ہمارے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ہندوستان ہمارے صرفہ پر ایک بڑا ملک بن گیا ہے۔ اس نے 1948ء میں حیدر آباد پر قبضہ کر لیا اور پھر جوناگڑھ، مانا وادر اور کشمیر کے ایک حصہ پر اور اب مشرقی پاکستان پر قبضہ کیا ہے۔ لہٰذا آپ سمجھ سکتے

ہیں کہ یہ باتیں بھی ہمارے لیے خوشگوار نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ ہمارے ہم وطنوں کا ایک ردِ عمل ،ایک خاص صورت میں دیکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پڑوسیوں کے تعلقات کا قیام نہ صرف ایک معقول بلکہ مناسب بات بھی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ میں یہ نہیں کرسکتا کہ پاکستان کو اٹھا کر یورپ یا امریکہ میں لے جاؤں۔ ہم دونوں کے درمیان پڑوسیوں کے تعلقات ہونے چاہئیں۔ لیکن ہماری قوم کو 25 سال کے دوران میں اتنی جراحتیں پہنچی ہیں اور اتنے المناک واقعات پیش آئے ہیں کہ وہ اب عقلی لحاظ سے کسی امر پر غور کرنے کے مزاج میں نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ مجھے درپیش ہے۔ میں ان کے پاس جاتا ہوں اور ان کو بتاتا ہوں کہ وہ زمین پر پاؤں رکھیں، اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور پاکستان کو برِ صغیر میں ایک طاقت ور ملک کی حیثیت سے تعمیر کریں لیکن کسی جارحیت کے لیے نہیں۔ آپ جرمنی سے نہیں لڑتے ،آپ سائنٹفک سوسائٹی اور اپنی قوم کو طاقتور بنانا چاہتے ہیں، آپ کو اس بات پر فخر ہے کہ بعض دیگر ملکوں کے مقابلے میں آپ کی معیشت نے بہتر طور سے ترقی کی ہے ،ان ہی معنوں میں ہم پاکستان کو برِ صغیر میں سب سے زیادہ خوشحال مملکت بنا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس وسائل ہیں ہمارا سب سے بڑا وسیلہ ہماری افرادی قوت ہے آپ گزشتہ سال کے تجربہ کی روشنی میں یہ نہ دیکھیں۔ 1971ء کے واقعات تو ابتدا سے آخر تک ایک شدید غلطی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملک ایک بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ ہماری ناکامی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہمارے ہم وطن اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے مناسب صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اگر آپ ہر کام ایک پاگل آدمی کے سپرد کردیں تو اس قسم کی صورتِ حال دنیا میں کسی جگہ بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ قطعاً حماقت تھی۔ آپ باہر سے یہ دیکھ سکتے تھے کہ یہ تباہی کو دعوت دینا تھا چنانچہ اس سے قطع نظر آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری افرادی قوت کم از کم ایشیا میں بہترین افرادی قوتوں میں سے ایک ہے۔ یہ لوگ بڑے جفاکش، مخلص اور مشینوں کو استعمال کرنے کے شائق ہیں۔ وہ مشینوں سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آپ سیالکوٹ میں چھوٹے چھوٹے مکانوں میں جائیں تو دیکھیں گے کہ وہ لوگ ایسے آلاتِ جراحی تیار کر رہے ہیں جو یورپ تک میں خریدے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اچھے کاشتکار بھی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے زرعی وسائل ایسے ہیں کہ اگر تھوڑی کوشش اور کی جائے اور خوشحال ملکوں سے کچھ اور تعاون حاصل ہو جائے تو ہم اپنی ضروریات میں خود کفیل ہو سکتے ہیں۔ آپ نے بنگلہ دیش کو ایک بین الاقوامی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ اقتصادی امداد غذا اور دیگر تمام چیزوں کی صورت میں بنگلہ دیش کی بڑی مدد کی جارہی ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ وہ

اپنا غیر ملکی زرمبادلہ خرچ نہیں کر رہے ہیں۔ امریکی امداد اور مغربی یورپ کی امداد کی بنا پر وہ اسے بچا کے رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں اس کا ایک تہائی بھی بلکہ اس کا دسواں حصہ بھی مل جاتا تو ہم بہت کچھ کامیابی حاصل کر سکتے۔ بہر حال ہمارے ملک کے ٹکڑے کیے گئے اور ہمیں بھی اس قسم کی امداد ملنی چاہیے تھی لیکن کنسورشیم کے ساتھ ہمارے مذاکرات آئندہ ماہ مارچ میں شروع ہونے والے ہیں۔ اس دوران میں ہم نے اپنے سکہ کی قیمت کافی حد تک کم کر دی ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس کا مثبت جواب دیا جائے گا لیکن اب تک کوئی مثبت جواب ہمیں نہیں ملا۔ آپ کے ملک کے ساتھ بھی اب ہمیں ایک سال کے مذاکرات کے بعد دوبارہ مذاکرات کرنا ہوں گے۔ اگر ہمیں بین الاقوامی امداد حاصل ہوتی تو آج ہم کو در پیش مسائل حل ہو چکے ہوتے۔ ہماری غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی اب 83 ملین ڈالر ہے۔ یہ آمدنی اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی اس وقت تھی جب مشرقی اور مغربی پاکستان یکجا تھے۔ ہمارے یہاں مزدوروں کے تنازعات پیش آئے ہر قسم کے مسائل سامنے آئے لیکن اب ہمارے یہاں نسبتاً صنعتی امن ہے اور ہماری پیداوار بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری برآمدات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور ہمارے لوگ اپنا کام کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اگر ہمیں کیمیائی کھاد کی کمی نہ ہوتی تو ہم گندم میں خود کفیل ہو سکتے تھے۔ ہم کیمیائی کھاد کے مزید کار خانے قائم کرنے کے لیے جنگی بنیادوں پر کوشش کرنے والے ہیں اور ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر آئندہ سال نہیں تو اگلے سال تک ہم گندم میں خود کفیل ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہم چینی کے معاملے میں بھی خود کفیل ہونے والے ہیں اور اس کے لیے ہم نے بعض سخت اقدامات کیے ہیں۔ ہم چاول اس وقت بھی برآمد کر رہے ہیں اور کپاس بھی نیم تیار شدہ صورت میں برآمد کر رہے ہیں۔ ہم اس بات کا انتظام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ خام روئی سے زیادہ سوتی مصنوعات اور نیم مصنوعات برآمد کریں۔ چمڑے اور کھالوں کی برآمد میں بھی ہمیں بڑی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں ہم اپنے وسائل کو بہت اچھے طریقے سے بروئے کار لا رہے ہیں۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ہم پر دفاع اور ترقی کی دہری ذمہ داریاں ہیں۔ اگر دفاع کو ترقی کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل نہ ہوتی تو ہم دو سال کے اندر پسماندہ علاقوں کو صاف کر لیتے۔ اپنے تمام دیہات میں بجلی پہنچا دیتے، تمام اہم سڑکوں اور پراجیکٹوں کی تعمیر مکمل کر لیتے اور کم لاگت کے مکانات بنا سکتے۔ ہم نے نسبتاً بڑے پیمانے پر یہ پروگرام شروع کر دیا ہے۔ ہم دیہی تعمیرات کے پروگرام کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں اور دیہی بستیاں تعمیر کر رہے ہیں لیکن بہر حال ہمیں ان اسباب کی بناء پر جن کا میں آپ سے ذکر کر چکا ہوں اپنی دفاعی ضروریات کا بھی لحاظ رکھنا ہے۔ اپنی دفاعی

www.bhutto.org

ضروریات اپنے ترقیاتی تقاضوں دونوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارا بار بہت زیادہ ہے۔ بنگلہ دیش میں کوئی بڑی فوج نہیں ہے اور نہ اس کو اس کی ضرورت ہے۔ اگر ہماری بھی اس قسم کی پوزیشن ہوتی تو آپ ایک بڑا فرق دیکھتے۔

سوال: لیکن جنابِ صدر کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان پاکستان کے لیے واقعی ایک چیلنج ہے یا یہ ایک توسیع پسند قوت ہے؟

جواب: یہ تو آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس نے 25 سال میں کیا کیا ہے۔ 1947ء میں جونا گڑھ کی جنگ اور کشمیر کی جنگ اور اس کے بعد 1948ء میں حیدر آباد اور بعد ازاں گوا کی جنگ اور پھر میرے خیال میں پانڈیچری کی جنگ اور یقیناً اس کے بعد "ہندوستان اور چین کی جنگ۔" ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ لڑائیاں کس نے شروع کیں۔ ہندوستان کی ہٹ دھرمی کی پالیسی اور تاران کے سوال پر سیلون (سری لنکا) کو دھمکیاں دینے کا رویہ، برما کے ساتھ اتنے عرصے تک سرحدوں کے مسئلوں کو حل نہ کرنا، بھوٹان اور سکم پر اقتدار اور پھر نیپال کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش اور پھر اس کے بعد ہمارے ساتھ 1965ء کی جنگ اور اس کے بعد 1971ء کی جنگ۔ 25 سال کے عرصے میں یہ سب کچھ جو اس نے کیا ہے اس پر تو چنگیز خان بھی شرمندہ ہو جاتا۔ وہ بڑی معصومیت کے ساتھ خود کو امن پسند کہتے ہیں۔ وہ ہمیں جارح کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پاکستان کی جارحیت کی وجہ سے پریشان ہیں ہندوستان کے کتنے انچ علاقے پر ہم نے قبضہ کر رکھا ہے؟ پھر اگر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کشمیر پر اس کے باشندوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ نہیں کر رکھا ہے تو وہ کشمیر میں رائے شماری کیوں نہیں کراتے؟ لہٰذا ہمیں اپنی حفاظت کا خیال رکھنا ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے، مومن کو ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ اب جو کچھ بھی ہمارے پاس رہ گیا ہے ہم اسے خطرے میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم جنگ نہیں چاہتے لیکن ہم خطرے مول نہیں لے سکتے۔ جہاں تک ہندوستان کی توسیع پسندانہ پالیسیوں کا تعلق ہے میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ گزشتہ تاریخ الفاظ کی نسبت زیادہ وضاحت کر رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں ہندوستان کی وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ نے بیان دیا ہے کہ امریکہ کو چاہیے کہ وہ حقیقت کو تسلیم کرے کہ اس وقت ہندوستان برِصغیر میں ایک حاکمانہ طاقت رکھتا ہے۔ ہم اس بات کو چند وجوہات کی بناء پر تسلیم نہیں کرتے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بات مملکتوں کی خود مختارانہ آزادی کے منافی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ دھمکی اور نفرت کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم کسی ملک کی حکمرانی قبول نہیں کریں گے خواہ ہمیں اس سے زیادہ قربانیاں دینا پڑیں۔ ہم ان کی حکمرانی یا طاقت کو قبول

www.bhutto.org

نہیں کریں گے۔ مساوی طور پر خود مختاری؟ ہاں ہم برابری کے اصول پر زندہ رہنے کے لیے تیار ہیں۔ دوستوں کی حیثیت سے اچھے ہمسایوں کی طرح سے اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی بنیادوں پر اور تنازعوں کے باعزت تصفیے کی صورت میں ہم رضامند ہیں۔ یہ سب باتیں ہم قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اچھی دوستی پر امن بقائے باہمی، تعاون جہاں کبھی اس کی ضرورت ہو برصغیر میں بھی اور عالمی حلقوں میں بھی، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن یہ کہ وہ ہمارے حاکم ہوں اور ہم ان کے زیرِ سایہ رہیں یہ بات ہم کبھی منظور نہیں کریں گے۔ بہتر بات تو یہ ہے کہ ہندوستان والے ایسی باتیں نہ کریں کیونکہ ان باتوں سے ہمارے عوام مشتعل ہوتے ہیں۔ کسی ملک کی طاقت کا انحصار اس کے بڑے ہونے پر نہیں ہوتا۔ برطانیہ خود اتنا بڑا نہیں تھا جب اس کی سلطنت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ ہندوستان اپنے آپ کو حکمران طاقت کیسے کہہ سکتا ہے؟ اگر امریکہ نے اسے خوراک کی مدد نہ دی تو اسے قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کسی ملک کی طاقت کا انحصار چالاکی، دھوکہ دہی اور جارحیت پر نہیں ہوتا۔ ملک کی طاقت کا انحصار درحقیقت آخرِ کار اس ملک کے عوام کی خوشحالی پر ہوتا ہے اور جب ہندوستان کی فی کس آمدنی پاکستان کی فی کس آمدنی کے برابر ہے اور جب ہندوستان کا ایک کسان خوراک کے معاملے میں پاکستانیوں کی نسبت دوسروں کا زیادہ محتاج ہے تو پھر ہم کیسے اس بات کا یقین کرلیں کہ وہ بڑی طاقت ہے؟ جب کلکتہ کے عوام سڑکوں پر سوتے ہیں تو پھر حکمران طاقت کہلوانے کی خواہشمند کیوں ہے؟ جب امریکن نیٹو داخل ہوئے تو کیا انہوں نے مغربی یورپ کے ممالک سے یہ کہا تھا کہ وہ پہلے انہیں حکمران طاقت کی حیثیت سے تسلیم کریں، اس کے بعد ہی وہ ان کے ساتھ اتحاد کریں گے؟ یقیناً نہیں۔ درحقیقت جب امریکہ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا تو جنرل ڈیگال جیسی عظیم شخصیت نے کہا کہ وہ امریکہ کی حکمرانی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو بات دراصل یہ ہے کہ ہندوستان کو چاہیے کہ وہ پرامن ہمسائے کی طرح سے رہنا سیکھے ،محاذ آرائی کو ترک کردے۔ انہیں ہمارے ساتھ برتری کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ہم ایسی باتیں نہیں کرتے ہیں۔ ہمیں مساوات کے اصول پر ملنا اور زندگی گزارنی چاہیے۔ میں تصادم کی پروا نہیں کرتا۔ اگر آپ میری ذاتی رائے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ اگر ہندوستان نے ہم پر حملہ نہ کیا ہوتا تو میں یہ تاثر کبھی نہ دیتا۔ اگر ہندوستان نے جارحانہ پالیسی اختیار نہ کی ہوتی تو ہم نے تصادم کی پالیسی کبھی بھی اختیار نہ کی ہوتی۔ آپ کیا کرتے ہیں، اگر کوئی ملک جارحانہ پالیسی اختیار کرے؟ کیا آپ ہتھیار ڈال دیتے ہیں؟ اگر خدانخواستہ کل جرمن فرانس میں داخل ہونا چاہیں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ جنگ کریں گے، آپ اپنا

تحفظ کریں گے یا ہتھیار ڈال دیں گے؟ لہٰذا یہ صرف ان کا کام ہے کہ فیصلہ کریں کہ کیا تصادم کی پالیسی اختیار کی جائے یا تعاون کی۔ اگر انہوں نے جارحیت نہ کی ہوتی، اگر وہ پاکستان کا مزید علاقہ نہ چاہتے، اگر اب وہ پرامن طریقے سے رہنا چاہتے ہیں ایک حکمران طاقت کی حیثیت سے نہیں تو ہم ان سے تعاون کرنے کو تیار ہیں لیکن اگر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ تشدد کے استعمال کی بجائے کسی طرح کی بالادستی سے کام لیں تو عوام تصادم کو پسند کریں گے خواہ میں اسے چاہوں یا نہ چاہوں۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر آپ جارحیت نہیں کرتے تو آپ ایسا فقرہ بھی نہیں سنتے۔ غالباً یہ فقرہ جنگ کے دنوں کا تھا۔ چرچل کو ایسا کیوں کہنا پڑا تھا کہ ہم ان کے ساتھ ساحلوں پر لڑیں گے۔ ہم ان کے ساتھ سڑکوں پر لڑیں گے لیکن ہم کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ اگر جرمنوں نے جارحیت نہ کی ہوتی، اگر وہ ڈنکوک نہ آتے اور اگر وہ برطانیہ پر حملہ کرنے کا ارادہ نہ رکھتے تو ایسی بات کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ اسی طرح سے ہم پر جارحیت کی گئی ہندوستان کے کمانڈر انچیف چودھری نے کہا کہ اگلے روز ہم لاہور میں ہوں گے اور شراب پی رہے ہوں گے۔ لہٰذا مجھے بھی پوری طرح جواب دینا پڑا۔ ایسی صورتِ حال میں لیڈروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کو اپنا ہمنوا بنائیں اور اس فقرے کے بارے میں ہر شخص بار بار مجھ سے پوچھتا ہے اور میں نے ہر شخص پر اس کی وضاحت کر دی ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ ہزار سال تک مشین گنیں پکڑے کھڑے رہیں اور گولیاں برساتے رہیں کسی کے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ وہ اتنے عرصے تک لڑ سکے۔

سوال: جنابِ صدر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شملہ معاہدہ کی مدد سے مستقل مصالحت اور اس طرح ہندوستان کے ساتھ پرامن تعلقات کے تاریخی موڑ کے لیے حالات پیدا ہو سکیں گے؟

صدر: ہاں جہاں تک شملہ معاہدہ کا تعلق ہے میں نے بار بار کہا ہے کہ میں ہندوستانیوں سے یہ کہتا رہوں گا لیکن اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے دونوں طرف کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: جنابِ صدر کیا آپ کو ہندوستان کی طرف سے کوئی اشارہ نظر آ رہا ہے؟

صدر: ممکن ہے میں غلط سمجھا ہوں کیونکہ ایک جواب سے یہ بتانا مشکل ہے لیکن شملہ میں ہندوستان کی وزیرِ اعظم کا رویہ مساوات کی بنیاد پر امن کے لیے پرخلوص نظر آ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا ان کے ذہن میں اس رویہ کو کس نے ڈالا تھا۔ میں نے انہیں پرخلوص پایا تھا۔ وہ امن پسند نظر آ رہی تھیں۔ ایک سیاستدان کی حیثیت سے جس کا مشاہدہ تیز ہونا چاہیے میرا یہ تاثر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ایوب خان جھوٹ بولا کرتا تھا تو وہ اپنی جرابیں اتار دیتا تھا۔ اس نے جب ایسا کیا میں سمجھ لیتا تھا کہ وہ جھوٹ

www.bhutto.org

بول رہا ہے۔ آپ کو جوابات اور اضطراری افعال کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ آپ کو تیزی سے مڑنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک مخصوص نکتہ پر لوگ کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ بلاشبہ میں نے دیکھا، ہوسکتا ہے میں غلطی پر ہوں اور وہ بہت عمدہ اداکاری کر رہی ہو۔ خواہ کوئی بھی وجہ ہو وہ پرامن مستقبل چاہتی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص پاکستان سے دہلی جا کر حملہ کرتا ہے تو 30 یا 40 سال بعد اس کے بدلے میں لاہور کو نشانہ بننا پڑے۔ جیسا کہ میں نے کہا وجوہات کوئی بھی ہوں ہندوستانی وزیرِاعظم امن کی خواہشمند ضرور نظر آئی تھیں۔ میں نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن مجھے ان کے بعض وزراء میں اس قسم کا تأثر نظر نہیں آتا۔ میں یہ تأثر دینا نہیں چاہتا ہوں کہ وہ خود تو امن کی حامی ہیں اور فلاں فلاں لوگ جنگ چاہتے ہیں۔ شملہ معاہدہ ایک حقیقت ہے اور اس قسم کی ڈپلومیسی کی کوشش کرنے والا میں آخری شخص ہوں گا۔ حکومت کا نقطۂ نظر اجتماعی ہوتا ہے۔ برِصغیر میں حتیٰ کہ ایوب کے وقت میں بھی یہ کہتے تھے کہ مسٹر ایکس کو بھیجیں وہ زیادہ معقول ہے، مسٹر وائی کو نہ بھیجیں۔ ایوب خان کا وزیرِ خارجہ بہت خراب ہے، ایوب خاں بہت اچھے ہیں۔ میں اس قسم کی بات نہیں کرتا لیکن بہر حال اجتماعی فیصلے میں بھی انسانی عنصر شامل ہوتا ہے۔ آپ کے اپنے ملک فرانس میں مثال کے طور پر بعض لوگ حکومت میں ممکن ہے ایسے ہوں جن کا آپ کی سابقہ افریقی کالونیوں سے خصوصی روابط کے بارے میں دوسروں سے مختلف نقطۂ نظر ہو۔ بہر حال کابینہ بنانے کی یہی وجہ ہے۔ صرف اس نقطۂ نظر سے میں یہ کہوں گا کہ کچھ لوگ ایسے نظر آتے تھے جنہوں نے تازہ ہوا میں سانس نہیں لیا تھا، وہ ابھی تک ماضی میں غرق تھے، وہ قدیمی نام رکھتے تھے اور شملہ میں ان کے تأثرات کا اظہارِ خیال صحیح معنوں میں درخشاں نہیں تھا۔ وہ 1947ء سے 1950ء کے دور سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے ردِعمل پر ڈٹے ہوئے تھے لیکن اب پوری نئی نسل سامنے آ گئی ہے۔ اب نئے تخیلات ہیں اور بالکل نئی طرز ہے اور ہم عصر سیاست پر بالکل نئی نظر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں بھی تھوڑا سا قدیم ہوگیا ہوں کیونکہ بہر حال میں بھی 1958ء سے بین الاقوامی امور سے منسلک ہوں۔ اس عرصہ میں بہت سے عظیم لوگ جا چکے ہیں۔ مجھے نہرو، ڈیگال، میکملن، آئزن ہاور وغیرہ سے سامنا کرنا پڑا۔ صرف وزیرِاعظم چواین لائی ابھی موجود ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ کافی عرصہ تک زندہ رہیں گے۔ اب آپ کو زیادہ تر نئے لوگ نظر آئیں گے۔ میں خوش قسمت تھا کہ جب میں وزیر بنا تو جوان تھا لیکن میرے اپنے تجربہ کے نتائج بھی مختلف رہے ہیں۔ میں پہلی بار اقوامِ متحدہ میں ایک مندوب کی حیثیت سے داخل ہوا۔ 1957ء کا رویہ اور طریق Z کا ر 1965ء اور 1971ء کے مقابلے میں مختلف تھا۔ ہندوستان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو تقسیم سے قبل کانگریس کے

اجلاس میں اس وقت گاندھی، پٹیل، بوس اور نہرو سے تیسری یا چوتھی قطار پیچھے بیٹھا کرتے تھے۔ انہوں نے وہ تقریریں سن رکھی ہیں جن میں پوری دنیا سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان صرف ان کی لاشوں پر ہی قائم ہو سکے گا۔ ہندوستان میں ایسی نئی قیادت بھی ہو سکتی ہے جس نے وہ تقریریں نہ سنی ہوں لیکن وہ ابھی تک پاکستان کو ختم کرنے کے دوسرے طریقوں پر غور کرنے کے لیے خفیہ اجلاس کرنے میں معروف ہیں۔ اگر چہ ظاہری طور پر وہ یہ کہتے ہیں کہ اچھا اگر پاکستان وجود میں آ گیا ہے تو یہ ایک حقیقت ہے۔ نئی نسل کے کچھ لوگ وقت کی بدلتی ہوئی خصوصیت سے متاثر ہوں گے لیکن وہ دورنگی کا شکار ہوں گے۔ نہ تو پوری طرح ماضی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور نہ پوری طرح حال سے متاثر ہیں۔ ہندوستانی وزیرِاعظم اپنے والد اور ان کے ساتھیوں سے بہت قریب رہی ہیں لیکن فیصلہ کرنے والوں میں وہ سرگرمی سے شریک نہیں تھیں۔ اس لیے اگر سمجھا جائے تو وہ بھی اس مرحلہ میں آتی ہیں جس میں کہ ہم ہیں اور ان کا نقطۂ نظر بھی ہم سے جدا نہیں ہو سکتا ہے کہ اب سے دس سال بعد نقطۂ نظر کی تازگی اور واضح ہو جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اصول اور بنیادی نظریات ترک کر دیئے جائیں گے۔ لیکن ممکن ہے حالات مختلف رنگ میں ظاہر ہوں گے اور ان پر مختلف انداز سے غور کیا جائے گا، ذاتی وعدے ہو سکتا ہے اس قدر محکم نہ ہوں لیکن اصول، مثال کے طور پر جو کشمیر سے متعلق ہیں نہیں بدل سکیں گے۔ لیاقت کے وقت میں بھی کشمیر کا مسئلہ تھا، اب میرے وقت میں بھی ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہوا۔ 49-1948ء میں یہاں ہر شخص خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا جب اقوامِ متحدہ نے دو قراردادیں منظور کی تھیں اور پاکستان کی حکومت نے یہ محسوس کیا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ ان میں بہت سی خامیاں تھیں لیکن پھر بھی ہر شخص کو یہ توقع تھی کہ رائے شماری ہو گی۔ اگر ایسی قراردادیں 1971ء یا 1969ء میں منظور ہوتیں تو ہمارا ردِعمل مختلف ہوتا کیونکہ ہم یہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ محض ایک قرارداد ہے ہم کچھ روز میں سمجھ گئے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کس طرح کام کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جب تک بڑی طاقتوں میں اتفاق نہیں ہو گا سلامتی کونسل اپنی قراردادوں پر عمل درآمد نہیں کر سکتی اور جنرل اسمبلی صرف ایک سفارشی ادارہ ہے لیکن اس وقت ہم یہ سمجھتے تھے کہ قراردادوں سے کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ایک وزیرِاعظم نے کہا تھا کہ میں اس وقت تک دولتِ مشترکہ کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گا جب تک کہ وہ کشمیر کے مسئلہ پر بحث نہ کرے۔ ان کا جواب یہ تھا کہ وہ کشمیر کے مسئلہ پر بحث کر سکتے ہیں لیکن سوائے ایک بڑے فساد کے اور کچھ نہیں ہوا۔ ان دنوں میں ہو سکتا ہے کہ یہ بات درست ہو لیکن اس وقت نہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ اگر چہ حالات بدل گئے ہیں لیکن ایک شخص تنازعہ اور اصول نہیں چھوڑ

www.bhutto.org

سکتا۔ بلاشبہ ایک شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے اور حل کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جا سکتے ہیں، اب جمود ختم ہوسکتا ہے۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حد بندی کا سوال ہے؟

صدر: میں سمجھتا ہوں کہ ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ جمود ختم ہوسکتا ہے۔ یہ ہمارے دور میں ہی ہوسکتا ہے لیکن اگر یہ نہیں ہوتا تو ہم ماحول کو خراب نہیں کریں گے۔ اس صورت میں ہمیں بھی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ایک ملک کو اتنا اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ اصولوں پر قائم رہے خواہ بات آگے نہ بھی بڑھے۔ ایوب خان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اسے اپنے دورِ صدارت ہی میں حل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس بارے میں میں نے اکثر اس سے دریافت بھی کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کے پیشرو بھی اس نہج پر سوچتے تھے۔ فیروز خان نون جو ہمارے وزیراعظم تھے ہوسکتا ہے انہوں نے یہ کہا ہو کہ اسے میرے دور میں ہی ہونا چاہیے کیونکہ میں نہرو کو جانتا ہوں اور نہرو مجھے جانتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ غلام محمد بھی اس نہج پر سوچتے تھے لیکن میرا یہ اندازِ فکر نہیں ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ خدا نے یہ مقرر کیا کہ اسے لازمی طور پر آج فلاں فلاں کی حکومت میں حل ہونا چاہیے۔ یہ امور تاریخی عمل سے متعلق ہیں۔ میرا اولین فرض یہ ہے کہ یہ دیکھوں کہ ہماری پوزیشن کمزور نہ ہو۔ جیسا کہ ماضی میں کئی بار ہوا ہے۔ ماضی میں ہماری بعض سابقہ حکومتوں نے جس قسم کے بیانات دیئے ان سے عام طور پر ہماری پوزیشن خراب ہوئی۔ وہ حقِ خود ارادیت اور رائے شماری پر سختی سے قائم نہیں رہے۔ رائے شماری کے علاوہ دوسرے طریقوں کی پیش کش سے آپ نے بعض دفعہ یہ محسوس کیا ہوگا کہ آپ کسی حل کے قریب نہیں پہنچے اور جو کچھ بھی آپ نے کہا اپنی پوزیشن کو کمزور کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اس لیے ہم ایسا نہیں کریں گے۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ "اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہم جنگ کریں گے، ہم اپنے سفارتی تعلقات توڑ لیں گے۔" اگر آپ اپنے اصولوں پر قائم رہیں ہوسکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے عناصر سامنے آئیں، ایک نئی صورتحال پیدا ہو جائے اور نئے رویے ابھر آئیں۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ ہم اپنے اصولوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر ہم ایک اصول چھوڑ دیں تو ہوسکتا ہے کہ ہم سارے اصول چھوڑ دیں۔ اس کے علاوہ ہم ایک قدرے چھوٹا ملک ہیں۔ ہماری اس لیے حمایت نہیں کی جاتی کہ پاکستان ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ملک ہے بلکہ اس لیے کہ صحیح اصولوں کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر ہم صحیح اصولوں کو چھوڑ دیں تو ہندوستان کا وزن جو ہم سے زیادہ بڑا اور وسیع ہے ہم پر گرتا رہے گا، کیا ایسا نہیں؟ آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اصول کیا ہے اگر میں فرانس جاؤں اور

آپ سے یہ درخواست کروں کہ آپ کشمیر کے بارے میں ہماری حمایت کریں خواہ ہندوستان کے ساتھ آپ کے دوستانہ تعلقات قائم ہوں تو میں ایسا حق خودارادیت کے اصول پر کروں گا جو آپ نے الجزائر کو عطا کیا ہے جسے ڈیگال نے تسلیم کیا تھا، حتیٰ کہ یہ میٹروپولیٹن فرانس کے خلاف ہو۔ یہ ایک اصول ہے جسے ہم نہیں چھوڑ سکتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ماحول کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ اگر میں جارحیت کا شکار ہوا ہوں تو آپ کی حمایت حاصل کروں گا۔ اگر آپ یہ عطا کریں گے تو آپ پاکستان کی حمایت نہیں کریں گے بلکہ جارحیت کے خلاف اصول کی حمایت کریں گے۔

سوال: بنگلہ دیش کے بارے میں جنابِ صدر کیا میں آپ سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ اسے تسلیم کرنے کے بعد آپ اس سے کس قسم کے تعلقات استوار کرنا چاہیں گے؟

صدر: انتہائی دوستانہ، جہاں تک ممکن ہو انتہائی قریبی۔ وہ اور ہم ایک روح اور دو قالب ہیں۔ ایک ایسی صورتِ حال پیدا کی گئی جب دشمنی پیدا ہوئی اور بھائی لڑ پڑے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب خاک تہہ نشیں ہو جائے گی تو وہ یہاں آنا چاہیں گے اور سندھ کو دوبارہ دیکھیں گے اور ہم بھی وہاں جانا چاہیں گے اور گنگا کو دیکھیں گے۔ ہم نے اپوزیشن سے انتہائی مؤثر طریقے پر نمٹ لیا ہے۔ موثر طریقے کا مطلب تشدد نہیں ہے۔ یہاں مظاہروں کو روکا جا سکتا تھا۔ ہم نے قدرتی طور پر انہیں روک دیا۔ تمام ملکوں میں فساد اور تشدد کو روکا جاتا ہے، برطانیہ میں فرانس میں ہر جگہ۔ جب قبائلی گھوڑوں پر سوار ہو کر مشین گنیں لیے کوئٹہ پر حملہ آور ہوں تو میں لوگوں سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ میں اپنے ہاتھ سبزہ سے رنگوں یا سرخی سے۔ مجھے انہیں روکنا تھا۔ پورا معاشرہ قبائلی معاشرہ ہے جیسا کہ کم از کم نصف سرحد ہے۔ پنجاب اور سندھ میں بھی قبائلی معاشرے ہیں ہمارے ہاں جمہوریت ہے لیکن فرانس جیسی جمہوریت قائم کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بڑی حد تک ہم آزاد خیال اور آزادی کے پرستار ہیں تاہم اب ہم ایک آئینی سمجھوتے پر پہنچے ہیں جو ایک بہت بڑی چیز ہے۔ ایک وقت ہمارے سامنے ایک تصور تھا کہ فرانسیسی طرز کو کیوں نہ اپنائیں۔ یہ کافی تعجب خیز ہے کہ 1947ء میں قائدِ اعظم نے بھی کہا تھا کہ فرانسیسی نظام اختیار کرنے کے قابل ہے۔

سوال: کیا یہ ایک حقیقت ہے کہ مرکز اور صوبوں کے مابین امور کی تقسیم پر اختلاف کو ختم کر لیا گیا ہے؟

صدر: ہم نے صوبائی خودمختاری کے سوال کو حل کر لیا ہے۔ ہم نے ایک عبوری آئین منظور کیا ہے اور عنقریب ہم مستقل آئین بنا لیں گے۔ ہم نے مرکز اور صوبوں میں اسمبلیاں بحال کر دی ہیں۔ ہم

www.bhutto.org

نے صوبائی حکومتیں قائم کردی ہیں۔ ہم جمہوریت کی بنیاد پر سیاست کے محاذ پر تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم ایک زیادہ متوازن اور زیادہ منظم معیشت کے فروغ کے لیے تیزی سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ امور خارجہ کے شعبہ میں بھی ہم نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں یعنی شملہ معاہدہ، فوجوں کی واپسی۔ یہ حقیقت ہے کہ بہت سے ملکوں نے ابھی تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا ہے اور بنگلہ دیش کے اقوام متحدہ میں داخلہ پر چین کا ویٹو۔

سوال: کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس قسم کا پاکستان تعمیر کرنا چاہتے ہیں؟

صدر: ایک عوام کا پاکستان، خوش حال، اپنی قوت اور ترقی میں سربلند، ایک مستحکم معیشت رکھنے والا، سماجی حقیقت کا آئینہ دار اور برصغیر کے لیے ایک مثال۔ ایک ایسا ملک جو سرگرمیوں سے معمور ہو، جہاں سماجی انصاف ہو، جہاں ہماری تمام ثقافتیں ایک مجموعی معاشرہ میں باہم پھلیں پھولیں۔"

یہ شملہ معاہدہ ہی تھا کہ جس کے تحت ہمیں ہمارا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ ہندوستان کے تسلط سے واپس ملا جبکہ اسرائیل آج تک سات ہزار مربع میل علاقہ پر قابض ہے اور عرب اتنی جنگ و جدل کے باوجود اسرائیل کے ساتھ جنگ میں ہارے ہوئے علاقے کو واپس لینے میں ناکام ہیں۔ شملہ معاہدے ہی کے تحت ہمارے جنگی قیدی واپس آئے اور مسٹر بھٹو کی کوشش سے ہی اعلیٰ فوجی افسروں پر جنگی جرائم سے متعلق مقدمات نہ چلے۔ وگرنہ شیخ مجیب تو کسی طور پر بھی ان کو معاف کرنے پر رضامند نہ تھا۔ جنرل نیازی، نام نہاد "مردِ آہن" شملہ معاہدے ہی کے تحت واپس وطن لوٹا۔ 30 اپریل 1974ء کو جنرل نیازی اور دیگر تین میجر جنرلز کی ملک آمد سے جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ بھی پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ وہ "ٹائیگر جنرل نیازی" جس نے اپنے ملک اور قوم کی عزت کو پلٹن میدان میں رسوا کیا، وہ ایک سیاستدان کی ہی جدوجہد کی بدولت دشمن کی قید سے وطن واپس لوٹا۔ یہ حقیقت ہے کہ جس طرح پاکستان کے قیام میں سیاستدانوں کا بنیادی کردار ہے اس طرح پاکستان کو بچانے اور اس کو استحکام بخشنے میں بھی سیاستدانوں کا بنیادی کردار ہے۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کی ڈپلومیسی

"شملہ معاہدہ ایک حقیقت ہے اور اس قسم کی ڈپلومیسی کرنے والا میں آخری شخص ہوں گا۔"
(شملہ معاہدہ کے بعد ایک یورپی صحافی سے گفتگو)

قیامِ پاکستان کے وقت سے پاک بھارت تعلقات میں کبھی خوشگواری نہیں آئی۔ اس کی وجہ برصغیر کی دونوں ریاستوں کے تضادات ہیں اور پھر آزادی کے وقت کشمیر کے مسئلے نے دونوں ملکوں کے تضادات کو مزید اختلافات میں بدلا۔ بھارت خطے کا بڑا ملک ہے۔ بھارت کی خارجہ پالیسی شروع دن سے اپنے قومی مفادات کے تقاضے پورے کرتی آئی ہے۔ بھارتی پالیسی سازوں نے بڑے ہوش اور سنجیدگی سے اپنے قومی مفادات کے تحفظ اور تکمیل کے لیے خارجہ تعلقات کو علاقائی اور عالمی سطح پر استوار کیا۔ اس وجہ سے بھارت عالمی طاقتوں کے لیے ایک اہم اور معتبر ملک رہا ہے۔ بھارت کے بورژوا جمہوری ڈھانچے نے بھی بھارت کو مغربی ممالک میں عزت بخشی اور بھارت نے بھی اپنی اس انفرادیت کو خوب اجاگر کیا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوری مملکت کی حیثیت رکھتا ہے۔ بھارت کے چین کے ساتھ سرحدی تنازعات نے بھارت کے دفاع پر کافی بوجھ ڈالا لیکن اسی سبب بھارت کے سابق سوویت یونین کے ساتھ آئیڈیل تعلقات رہے ہیں۔ اپنی اسی ڈپلومیسی کے سبب امریکیوں کے نزدیک بھارت ہمیشہ سودے بازی کی پوزیشن میں رہا۔ خطے کے دوسرے ممالک یعنی نیپال، بھوٹان اور سری لنکا بھارت کے سیاسی اثر میں دبے ہوئے ہیں۔ بھارت نے غیر وابستہ ممالک کی تنظیم (N.A.M) کا بانی ہونے کے ناتے عالمی سطح پر بھی اپنا ایک منفرد مقام قائم کیا۔ سرد جنگ کے زمانے میں امریکہ کی کیمونزم کی Containment کی پالیسی نے بھارت کو دبے الفاظ میں منی سپر پاور کا اعزاز بھی بخشا جو خطے میں اپنے بورژوا کردار کے سبب ایک نظریاتی ساتھی بن سکتا تھا مگر بھارت نے کبھی امریکہ کے زیرِ تسلط رہ کر اپنی

www.bhutto.org

خارجہ پالیسی تشکیل نہیں دی۔ اس لحاظ سے بھارت کا دفترِ خارجہ دنیا کا ایک دور اندیش دفترِ خارجہ کہلایا جاتا ہے جس نے ہر وقت عالمی تبدیلیوں کو مدِ نظر رکھ کر اپنی خارجہ پالیسی کو طے کیا۔ بھارتی دفترِ خارجہ نے عالمی سیاست کے تضادات کو ہر وقت خوبصورت اور قوم پرست انداز میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔

مگر پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ایسے قوم پرست رجحانات بڑے کم یا مختصر عرصے میں اپنائے گئے بلکہ پاکستان کی حکومتوں خصوصاً فوجی حکومتوں نے اپنی کوئی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ فوجی حکمران، جنہوں نے پاکستان پر طویل وقت تک حکمرانی کی ہے، ملک سے باہر بنی ہوئی امریکی منصوبہ سازوں کے مطابق پالیسیوں کے لیے ایک Instrument کا کردار ادا کیا۔ پاکستان امریکہ نواز خارجہ پالیسی اپنا کر بھی قومی مفادات اور مشکل وقت میں بہتر نتائج حاصل نہ کر سکا جس کی ذمہ داری یہاں پر حکومت کرنے والے فوجی حکمرانوں اور ان کے اتحادیوں پر عائد ہوتی ہے مگر جب ذوالفقار علی بھٹو نے بحیثیت وزیرِ خارجہ پاکستان اپنی صلاحیتوں سے پاکستان کو ایک حقیقت پسندانہ خارجہ پالیسی دی تو اس کے نتائج 1965ء کی جنگ کے دوران دیکھنے کو ملے کہ کس طرح بھارت سفارتی میدان میں عالمی سطح پر تنہا رہ گیا اور دورانِ جنگ 1965ء پاکستان کے دوستوں نے پاکستانی مؤقف کی حمایت کر کے توسیع پسند بھارت کے ارادوں کو چکنا چور کر دیا، گو اس کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کو وزارتِ خارجہ سے سبکدوش کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو خارجہ امور اور عالمی تعلقات پر عبور رکھنے والے واحد قومی سیاستدان تھے۔ جب انہوں نے حکومت سنبھالی تو شکست خوردہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بھی دیوالیہ نکل چکا تھا۔ تمام تر ظلم اور زیادتیوں، جنگ اور مشرقی پاکستان میں مداخلت کے باوجود بھارت نے عالمی تعلقات میں نہایت ہوشیاری سے اپنی حمایت قائم کر کے پاکستان کو ڈپلومیسی میں بھی نیچا دکھایا مگر مسٹر بھٹو نے تمام نقصانات اور بھارتی بالادستی کے باوجود بھارت کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے مسائل کے حل کے لیے بھارتی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی سے گفتگو کا ارادہ کیا جبکہ پاکستان کا وسیع رقبہ 5,126 مربع میل اور 93 ہزار جنگی قیدی بھارت کی تحویل میں تھے اور بنگلہ دیش نے 195 اعلیٰ فوجی افسران پر جنگی جرائم کے تحت مقدمات چلانے کا اعلان کر رکھا تھا جس کی بھارت اور اس کے اتحادی بھرپور حمایت کر رہے تھے۔

28 جون 1972ء کو صدر ذوالفقار علی بھٹو، 92 افراد پر مشتمل ایک پاکستانی وفد کی قیادت میں لاہور ایئرپورٹ سے بھارت روانہ ہوئے جہاں انہوں نے شملہ کے پُر فضا مقام پر بھارتی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی سے مذاکرات کرنے تھے۔ اس وفد میں پی پی پی کی اعلیٰ قیادت اور معروف صحافیوں کے

www.bhutto.org

علاوہ ان کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو بھی شامل تھیں۔ پورے بھارت میں پاکستان کے شعلہ بیاں مقرر، راہنما اور صدر ذوالفقار علی بھٹو کے اس دورے کو اخبارات اور میڈیا کے دیگر ذرائع میں خوب اہمیت دی جارہی تھی چونکہ پاکستان کے اس راہنما نے اپنی ابتدائی عوامی سیاست میں بھارت سے ہزار سال تک لڑنے کا اعلان کیا تھا لیکن اب وہ امن کے قیام کے لیے مذاکرات کرنے بھارت آرہا تھا۔ بھارتی میڈیا اور سیاسی حلقے مسٹر بھٹو کے اس نعرے اور امن کے لیے مذاکرات کے دعووں پر بڑی حیرانی کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کررہے تھے۔ یہ پاکستان کے پہلے منتخب حکمران کی بھارتی راہنماؤں کے ساتھ ڈپلومیسی تھی جو ایک وقت تک بحیثیت وزیرِ خارجہ بھارتی حکومت، اس کے نمائندوں اور مختلف عالمی فورمز پر اپنی سفارتکاری کا سکہ جما چکا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اندرا گاندھی کے والد جواہر لعل نہرو کے ساتھ مذاکرات کا بھی موقع مل چکا تھا۔ جواہر لعل نہرو سیاسی لحاظ سے ایک عالمی سیاست کار کے طور پر بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ اب مسٹر بھٹو صدرِ مملکت پاکستان کے علاوہ قائدِ عوام کی حیثیت میں بھی بھارت کے حکمرانوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے شملہ گئے تھے۔ ایسے مشکل وقت میں کہ جب طاقت کا توازن بھارت کے پلڑے میں تھا، یوں یہ صورتحال 1965ء سے یکسر مختلف تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے معاہدہ ہونے یا نہ ہونے کی صورت میں اسلام آباد سے رابطہ اور اطلاع کے لیے اپنی ٹیم کو خصوصی دلچسپی کے ساتھ منظم کررکھا تھا۔ وفاقی دارالحکومت میں صرف ایک لائن میں معاہدے کی اطلاع پہنچائی جانی تھی جو ایک کوڈ سگنل کی شکل میں تیار تھی۔ اگر معاہدہ ہوجاتا تو یہ کہا جانا تھا کہ:

''لڑکا پیدا ہوا ہے'' اور معاہدہ نہ ہوا تو ''لڑکی پیدا ہوئی ہے۔''

مسٹر بھٹو نے اپنی ساری ٹیم بشمول اپنی بیٹی بینظیر بھٹو کو بھی یہ کہا کہ شملہ میں مذاکرات کے دنوں میں خوشی یا غمی کے کسی قسم کے تأثرات کا چہروں پر بھی اظہار نہ کیا جائے نہ ہی بھارت میں اپنے جنگی قیدیوں کی قید کے حوالے سے کوئی جملہ کسی صحافی یا بھارتی افسر کے سامنے ادا کیا جائے۔ ہر ایک موقع پر معمول کے ساتھ نارمل رویہ اختیار کیا جائے۔ مسٹر بھٹو کے بچپن کے دوست بھارت کی سوتنتر پارٹی کے راہنما آنجہانی پیلو مودی نے اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں مجھ سے کہا ''میں حیران تھا کہ میرا دوست ذلفی جو بچپن میں لڑکیوں کی طرح شرمایا کرتا تھا، بعد میں بھارت کے خلاف نفرت کو ابھار کر عوامی راہنما بنا، وہ کس منظم انداز میں شملہ میں وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات کے لیے آیا؟'' مسٹر پیلو مودی نے کہا کہ ''مجھے اپنے دوست کی کارکردگی پر فخر بھی ہورہا تھا چونکہ وہ بچپن سے ہی بڑے اور انہونے کارنامے سرانجام دینے کا خواہاں تھا اور اب تو وہ ایک تجربہ کار منجھے ہوئے سیاستدان، عوامی راہنما، عالمی مدبر اور سفارتکار کے طور پر

www.bhutto.org

بھارتی قیادت کے سامنے اپنے جوہر دکھانے آ رہا تھا جس کو تاشقند میں پاکستانی حکومت (ایوب حکومت) کی سفارتکاری کا سخت صدمہ ہوا تھا جس کی بنا پر بھٹو اور ایوب کے راستے جدا جدا ہو گئے۔"

چنڈی گڑھ میں ذوالفقار علی بھٹو کا بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ استقبال کرنے کے لیے آئے۔ وہاں سے روسی ساخت کے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر دونوں راہنما شملہ روانہ ہوئے۔ صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش کا انتظام ہماچل بھون میں کیا گیا تھا۔ تین سو سے زائد اخباری نمائندے دونوں ملکوں کی چوٹی کی کانفرنس کی کوریج کے لیے شملہ میں بے چینی سے ہر لحہ کسی بڑی خبر کے منتظر تھے جبکہ چند ماہ پہلے دونوں ملکوں کے اعلیٰ افسران مری (پاکستان) میں اس چوٹی کی کانفرنس سے متعلق کوئی حتمی ایجنڈا طے نہ کر پائے تھے۔ اس لیے ان مذاکرات کے نتائج کے متعلق کوئی پیشگوئی بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ بھارتی مذاکراتی وفد میں اندرا گاندھی کی معاونت وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ، وزیر خزانہ مسٹر چوہان، وزیر دفاع جگ جیون رام اور وزیر خوراک فخر الدین علی احمد کر رہے تھے جبکہ اعلیٰ بھارتی حکام میں ڈی پی دھر، پی این ہکسر، اندرا گاندھی کے پرسنل سیکرٹری اور ٹی این کول سیکرٹری خارجہ تمام امور کو عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کر رہے تھے۔ پاکستان کی طرف سے صدر ذوالفقار علی بھٹو کی معاونت میں رفیع رضا اور عزیز احمد سب سے نمایاں تھے۔

ہندوستان کی خواہش تھی کہ پاکستان کی کمزور پوزیشن ہے اس لیے کشمیر کی جنگ بندی لائن کو عالمی سرحد تسلیم کروا کے پاکستان کو کشمیر سے دستبردار کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔ بھارت کو بڑی توقع تھی کہ وہ پاکستان سے اپنی ان خواہشات کے مطابق معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چار روز تک مسلسل پاک بھارت چوٹی مذاکرات بے نتیجہ انداز میں چلتے رہے اور کسی معاہدے کے دھندلے سے بھی امکانات نظر نہیں آ رہے تھے۔ بھارت مسلسل درپے تھا کہ 195 اعلیٰ پاکستانی فوجی بشمول جنرل اے کے نیازی پر جنگی جرائم کا مقدمہ بھی چلایا جائے اور پاکستان سے فوری طور پر بنگلہ دیش کو بھی تسلیم کروالیا جائے۔ مذاکرات کا آغاز نہایت مایوسی اور نا امیدی کے ساتھ ہوا۔ 93 ہزار جنگی قیدی اور تقریباً پانچ ہزار مربع میل کا پاکستانی علاقہ جو 1971ء کی جنگ میں بھارت کے قبضے میں چلا گیا تھا، کو بھارت سودے بازی کے لیے پریشر کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

شملہ میں موجود سینکڑوں بھارتی اور غیر ملکی صحافی پاک بھارت معاہدے کی خبر کے منتظر رہے۔ 2 جولائی کی شام تک معاہدے کی خبر آنے کے بارے میں سخت مایوسی پھیل چکی تھی۔ بھٹو، اندرا گاندھی

مذاکرات کے تمام دور ناکام ثابت ہو چکے تھے حتیٰ کہ پاکستانی وفد کی سرکاری مہریں بھی واپس وطن روانہ کردی گئی تھیں۔ 2 جولائی کی رات کو صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے الوداعی ڈنر کا اہتمام بھی کردیا جس میں بھٹو کے بچپن کے دوست پیلو مودی اور ان کی بیگم وینا مودی بھی شامل تھیں۔ ڈنر کے آخری لمحات میں یکایک اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو محفل سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ مسٹر بھٹو نے کہا ہمیں چاہیے کہ ہم ایک بار پھر کسی معاہدے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ خطے کے امن اور ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اگر آج ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچے تو شاید آئندہ ہم کبھی نہ پہنچ پائیں گے۔ دونوں راہنما جلدی سے بلیرڈ روم میں داخل ہوئے مگر جب گیارہ بجے رات کو ایک مسودہ تیار ہو چکا تو وہاں پر ٹائپ رائٹر بھی موجود نہیں تھا۔ جلدی سے اوبیرائے ٹاور ہوٹل سے بھاگم بھاگ ٹائپ رائٹر کا انتظام کیا گیا۔ مسٹر پیلو مودی نے اپنے ساتھ ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ جب اندرا گاندھی مسودے کی نوک پلک درست کررہی تھیں وہ ایک عجیب منظر تھا، ایک افراتفری کا سماں تھا۔ اعلیٰ بھارتی افسران ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ خوشی اور کامیابی کے ملے جلے جذبات کا منظر تھا۔ لہٰذا رات 12:45 پر برصغیر کے دونوں راہنما شملہ معاہدۂ کے مسودے پر دستخط کرنے کے لیے ایک میز پر بیٹھ چکے تھے۔ معاہدۂ ان بھارتی خواہشات کے برعکس ہوا جن کا ذکر پچھلی سطور میں کیا گیا ہے۔ یہ ایک توازن کا راستہ تھا۔ مسٹر بھٹو کی ڈپلومیسی نے خطے میں دوطرفہ بنیادوں پر تعلقات کی نئی راہیں کھول دیں۔ شملہ معاہدے کی سب سے نمایاں خصوصیت ہی یہ تھی کہ یہ برابری کی بنیاد پر دو ملکوں کے درمیان عمل پذیر ہوا۔ بھارت نے پاکستان کے زیر قبضہ پانچ ہزار مربع میل کے علاقے سے دستبرداری پر اتفاق کیا۔ 195 اعلیٰ فوجی افسران پر بنگلہ دیش کی طرف سے جنگی جرائم کا مقدمہ چلانے کا ارادہ بھی ترک کیا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں 90 ہزار سے زائد جنگی قیدی واپس وطن آئے جن میں اعلیٰ فوجی افسران بھی شامل ہیں۔ جنگی قیدیوں کی واپسی کا یہ سلسلہ 30 اپریل 1974ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا جب نام نہاد آئرن ٹائیگر جنرل اے کے نیازی اور دوسرے تین میجر جنرل شملہ معاہدۂ کے تحت واپس وطن لوٹے، ایک سیاستدان کی سفارتکاری کے سبب۔

شملہ معاہدے کے تحت یہ بھی تسلیم کرالیا گیا کہ 17 دسمبر 1971ء کو جنگ بندی لائن کو لائن آف کنٹرول تسلیم کیا جائے۔ یہ مسٹر بھٹو کی ڈپلومیسی کی انتہا تھی۔ اس شق کا مطلب تھا کہ بھارت نے کشمیر کو متنازع علاقہ تسلیم کرلیا ہے۔ اسی لیے آج تک پاکستان کی تمام حکومتیں بار بار بھارت کے ساتھ مذاکرات کو شملہ معاہدۂ کی روشنی میں گفتگو کرنے کو ترجیح دیتی ہیں چونکہ یہ ہی ایک معاہدۂ ہے جہاں سے پاکستانی

www.bhutto.org

قوم کو بھارت کے مقابلے میں ایک برابری کا احساس محسوس ہوا۔ اسی لیے جب صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو واپس لاہور ایئرپورٹ پر اترے تو عوام کا ایک جم غفیر اپنے ہیرو کا استقبال کرنے آیا۔ دراصل اب تاشقند معاہدے کے بعد قوم کو وقار کے ساتھ سربلند کرنے کا ایک موقع ملا تھا۔

www.bhutto.org

عوامی حکومت اور فوج

برطانوی نوآبادیاتی نظام نے برِصغیر میں فوج کے مضبوط ادارے کی میراث پیچھے چھوڑی ہے۔ بھارت میں کانگریس نے آزادی کے بعد ایک طاقتور عوامی سیاسی ادارے کے طور پر بھارتی جمہوریت میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس کی شہری قیادت بورژوا جمہوری تقاضا پورا کرتی تھی اور اس کی سیاسی تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ سے کہیں زیادہ گہری تھی اس لیے بھارت کے آزاد ہونے کے بعد انڈین کانگریس کا اپنے ملک کے لیے جمہوری کردار بڑا مفید ثابت ہوا۔ کانگریس نے بھارتی جمہوری عمل میں اور جمہوری اداروں کی تشکیل میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا جس کے سبب برٹش ٹرینڈ اور برٹش ڈسپلن کی حامل بھارتی فوج کو بھارتی سیاست میں دخل اندازی کا موقع نہ مل سکا اور بھارتی فوج مکمل طور پر ایک پروفیشنل فوج کی حیثیت اختیار کر گئی جبکہ اس کے بالکل برعکس آزادی کے بعد پاکستان میں مسلح افواج نے براہِ راست سیاست میں اہم ترین اور فیصلہ کن مقام بنا لیا حالانکہ بھارت اور پاکستان کی مسلح افواج ایک ہی برطانوی نوآبادیاتی نظام کی پیداوار تھیں۔ آزادیٔ پاکستان کے بعد مسلم لیگ پر مکمل جاگیرداروں کی گرفت نے جمہوری عمل کو پنپنے ہی نہ دیا اور اس طرح پاکستان میں فیوڈل سیاست کو بھرپور رواج ملا جس میں تیسری دنیا کی نوآبادیاتی مزاج کی یہ فوج ایک شراکت دار کے طور پر اپنا کردار ادا کرنے لگی۔ بلکہ 1950ء کی دہائی سے فیوڈل سیاستدانوں کی شراکت دار فوج نے مکمل سیاسی کردار ادا کرنے کا آغاز کر دیا جس کو امریکہ کی بھی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ اس طرح مسلح افواج نے پاکستان کے دفاع وسلامتی کی ذمہ داری کے ساتھ سیاسی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں۔

1952ء میں جب امریکہ میں پاکستانی سفارتخانے میں ملٹری اتاشی کے طور پر بریگیڈیئر غلام جیلانی کو مقرر کیا گیا تو بریگیڈیئر غلام جیلانی کو کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے بلایا اور اس کو سختی

www.bhutto.org

سے ہدایات دیں کہ

"Your basic task is to establish a military aid relationship with the Pentagon. You must deal directly with them and don't take the Ambassador into confidence. After all, we cannot trust these civilians with such sensitive matters."

یہ وہ رویہ ہے جو پاکستان کی مسلح افواج، سویلین حکمرانوں، سیاستدانوں اور سیاسی اداروں کے بارے میں رکھتی ہیں۔ اس سے پاکستان میں فوج کے مزاج کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ وہ سویلین لوگوں کو ریاستی اور فیصلہ کن معاملات سے آگاہ رکھنے میں بھی خطرہ تصور کرتے ہیں۔ بعد میں اسی جنرل ایوب خان نے 1958ء میں ملک میں پہلا مکمل مارشل لاء نافذ کر کے پاکستان میں فوج کو ایک بڑی اور فیصلہ کن سیاسی قوت کا رنگ دے دیا جس کے بعد جنرل یحییٰ خان نے مارچ 1969ء میں دوسرا مارشل لاء نافذ کر کے اس بات پر مہر ثبت کر دی کہ فوج اب ایک سیاسی ادارے کے طور پر اپنا کردار ادا کرتی رہے گی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جب اقتدار سنبھالا تو پاکستان کی فوج کو اپنے روایتی حریف بھارت کے ہاتھوں ایک بڑی شکست ہو چکی تھی اور اس فوجی شکست کے نتیجے میں ملک کا آبادی کے لحاظ سے بڑا حصہ مشرقی پاکستان وفاقِ پاکستان سے علیحدہ ہو چکا تھا اور یہ فوجی شکست ایک فوجی حکومت کی قیادت کے زیر سایہ ہی ہوئی اس لیے فوج کے ادارے کی ساکھ کو انتہائی حد تک نقصان پہنچ چکا تھا۔ اس صورتحال میں اقتدار ایک ریڈیکل سیاسی قوت پی پی پی کو منتقل ہوا۔ یہ ایک نیا دور تھا۔ ایک نئی سیاسی، جمہوری اور مقبول حکومت کے فوج کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے تھی اور کیا تھی یہ بڑا اہم موضوع ہے۔ بھٹو حکومت نے فوج کے ساتھ تعلقات کے بارے میں شروع میں ایک ریفارمسٹ (Reformist) پالیسی اپنائی جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی جبکہ بھٹو حکومت نے شروع کے صرف چار ماہ میں 143 اعلیٰ فوجی افسران کو سبکدوش کر دیا جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

بری فوج:

جنرل	2
لیفٹیننٹ جنرل	11
میجر جنرل	10
بریگیڈیئر	6

www.bhutto.org

نیوی:

وائس ایڈمرل	1
ریئر ایڈمرل	4
کموڈور	2

ایئرفورس:

ایئر مارشل	1
ایئر وائس مارشل	2
ائیر کموڈور	3
گروپ کیپٹن	1

کل 43 اعلیٰ فوجی افسران

اہم ترین بات یہ ہے کہ بھٹو حکومت کے اپنے ہی نامزد کردہ نئے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان سے صرف تین ماہ بعد اختلافات نے جنم لے لیا۔ ان دونوں افسران پر الزام تھا کہ انہوں نے المیۂ مشرقی پاکستان کے بارے میں قائم کیے گئے عدالتی کمیشن (حمودالرحمٰن کمیشن) پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے۔ یہ واقعہ بھٹو حکومت اور فوج کے مابین تعلقات کی نوعیت کے بارے میں ایک دلچسپ حیثیت رکھتا ہے۔

نومنتخب بھٹو حکومت نے فوج کے اعلیٰ دفاعی ڈھانچے میں بھی بنیادی اصلاحات کیں جس میں برطانوی دور سے رائج پرانی شکل تبدیل کردی گئی۔ پہلے تینوں افواج کے سربراہان کمانڈر انچیف کہلائے جاتے تھے نئی اصلاحات کے تحت چیف آف دی آرمی سٹاف، چیف آف دی نیول سٹاف اور چیف آف دی ایئر سٹاف کے عہدے تشکیل دیئے گئے۔ پہلے سے رائج برطانوی نظام کے تحت تینوں افواج کے سی این سی انفرادی طور پر بھرپور طاقت واختیارات کے مالک تھے جبکہ نئے نظام کے تحت تینوں افواج کے چیفس کے اوپر ایک نیا عہدہ تشکیل دیا گیا جوکہ جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی (Joint Chiefs of Staff Committee) کہلایا جوکہ صدرِ مملکت کی کمانڈ میں کردیا گیا۔ اس نئے نظام کے تحت مسلح افواج کے تینوں شعبوں میں باہم تعلقات، بہتر کارکردگی، بہترین پلاننگ اور جنگ میں مربوط رابطے قائم کرنا مقصود تھا جبکہ چیف آف دی آرمی سٹاف کی شروع میں میعاد چار سال مقرر کی گئی، لیکن 1975ء میں یہ میعاد تین

www.bhutto.org

سال مقرر کردی گئی۔ 1947ء سے نیوی کا ہیڈ کوارٹر کراچی میں تھا جبکہ عوامی حکومت نے نیوی کا ہیڈ کوارٹر بھی کراچی سے اسلام آباد منتقل کر دیا جبکہ بری فوج کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد کے قریب ہی راولپنڈی میں موجود تھا۔ نئی حکومت نے 1973ء کے پہلے متفقہ آئین میں فوج کا پروفیشنل کردار متعین کر دیا جس سے اس بات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے کہ بھٹو حکومت کی شدید خواہش تھی کہ مسلح افواج صرف اپنا پروفیشنل کردار ہی ادا کریں جس کے تحت یہ قرار پایا کہ "مسلح افواج کا یہ آئینی کردار ہے کہ وہ وفاقی حکومت کی ہدایات کے مطابق پاکستان کو بیرونی جارحیت اور جنگ سے محفوظ رکھیں اور قانون کے مطابق سول انتظامیہ کی مدد کریں جب ان کو اس کے لیے کہا جائے۔"

(اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین 1973ء کا آرٹیکل 245)

اسی طرح 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت یہ بھی طے کیا گیا کہ:

(1) کوئی بھی شخص جو بزور قوت یہ مظاہرۂ قوت یا کسی دیگر غیر آئینی طریق سے آئین کی تنسیخ کرتا ہے یا ایسی کسی کوشش یا سازش میں ملوث پایا جاتا ہے شدید قسم کی غداری کا مرتکب ہوگا۔

(2) بعینہٖ وہ شخص بھی شدید قسم کی غداری کا مرتکب ہوگا جو ذیلی دفعہ نمبر 1 میں بیان کیے گئے اقدامات میں کسی کی معاونت کرتا ہے۔

(3) شدید قسم کی غداری کے مرتکب اشخاص کو قرار واقعی سزا دینے کے لیے پارلیمان قانون وضع کرے گی۔

آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت قانونی طور پر ملک میں فوج کی طرف سے مارشل لاء مسلط کرنے کی کوشش کو غیر ممکن بنانے کی کوشش کی۔

جبکہ مئی 1976ء پاکستان کی اعلیٰ دفاعی آرگنائزیشن کے بارے میں بھٹو حکومت نے ایک وائٹ پیپر بھی جاری کیا جو بھٹو حکومت کے فوج کے بارے میں رجحان کو سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے 4 مارچ 1972 کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"پاکستان کے عوام اور مسلح افواج کو چاہیے کہ دونوں ہی بوناپارٹزم (Bonapartism) کا مسلح افواج سے اثر ختم کر دیں۔ یہ رجحان پاکستان کی سیاسی زندگی کو بے حد آلودہ کر چکا ہے۔ بوناپارٹزم کا مطلب ہے پیشہ ور سپاہیوں کو پیشہ ور سیاستدان میں بدل دیا جائے۔ میں بوناپارٹزم کا لفظ اس لیے استعمال

www.bhutto.org

کر رہا ہوں کہ پاکستان میں 1954ء سے کیا ہو رہا ہے خصوصاً 1958ء سے کھلے
عام پیشہ ور جرنیل سیاست میں کود پڑے، صرف پروفیشن کی حد تک نہیں بلکہ
لوٹ مار کی حد تک نتائج برآمد ہوئے۔ اس رجحان نے پاکستان کی سیاسی وسماجی
زندگی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ اسی طرح جس طرح بوناپارٹزم نے اٹھارویں اور
انیسویں صدیوں میں یورپ کو متاثر کیا۔ پاکستان اور مسلح افواج کے مفاد میں
یہی ہے کہ فوری طور پر بوناپارٹزم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔"

مسٹر بھٹو کی یہ تقریر اپنے اقتدار کے پہلے سال کے دوران کی ہے جس میں وہ فوج کو زیادہ سے زیادہ پروفیشنل اور غیر سیاسی کرنے کے خواہاں ہیں بلکہ چند ایک مرتبہ انہوں نے پیپلز آرمی کے تصور کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا اور کہا کہ روایتی فوج کو ختم کر کے ویتنام کی طرز پر فوجی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔ یہ خیالات ظاہر کرتے ہیں کہ اقتدار میں آتے وقت بھٹو کو اس بات کا شدت کے ساتھ احساس تھا کہ فوج کو غیر سیاسی کر کے سیاسی عمل سے دور رکھنے میں ہی جمہوری عمل کی کامیابی اور پاکستان کا مفاد ہے۔ پولیس کے ادارے کو بھی پہلے سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی گئی خصوصاً پولیس کا کمیونیکیشن کا نظام وقت اور وسائل کے مطابق جدید بنایا گیا اور اس کے ساتھ فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ اکتوبر 1972ء میں ایک نیم فوجی تنظیم فیڈرل سکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) قائم کی گئی۔ وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام یہ تنظیم سول انتظامیہ اور پولیس کی مدد کے لیے لا اینڈ آرڈر کو برقرار رکھنے کے لیے معرضِ وجود میں آئی تا کہ زیادہ سے زیادہ فوج پر انحصار کم کر دیا جائے۔ شروع میں ایف ایس ایف کی تعداد 13,875 افراد پر مشتمل تھی جبکہ 1976ء تک یہ تعداد 18,563 تک پہنچ گئی۔ ایف ایس ایف کے پاس جدید اسلحہ اور کمیونی کیشن کا جدید نظام تھا بلکہ یہ منصوبہ بھی بنایا گیا کہ ایف ایس ایف کو فوج کے ریکنڈیشن ٹینک بھی دے دیئے جائیں۔ فروری 1976ء میں ایف ایس ایف کے کردار میں مزید اضافہ کیا گیا جس میں یہ شامل کیا گیا کہ ایف ایس ایف قومی تعمیر کے منصوبہ جات اور ترقیاتی کاموں میں بھرپور حصہ لے گی بلکہ شہری کالونیوں کی تعمیر کا کام بھی اس کو سونپا جائے گا۔ اس کے علاوہ Integrated Rural Development Programme، سیلاب کی روک تھام اور تعلیم بالغاں کی ذمہ داریاں بھی ایف ایس ایف کو سونپ دی جائیں۔ ایک وفاقی ریاست میں ایسی تنظیم کا قیام کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن اپوزیشن نے ایف ایس ایف کے خلاف بھرپور مہم چلائی اور عوام میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش

کی کہ ایف ایس ایف بھٹو کی حکمران جماعت پی پی پی کے مفادات کے تحفظ اور اپوزیشن کو کچلنے اور ملک میں فاشزم کا نظام لانے کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔

دسمبر 1973ء کو وزارت دفاع کے تحت ''ڈیفنس پروڈکشن ڈویژن'' تشکیل دیا گیا جس کا مقصد دفاعی پیداوار میں اضافہ کے لیے قائم یونٹوں کو وسعت دینا اور نئے منصوبوں کا قیام تھا۔ واہ آرڈیننس فیکٹری کو مزید وسعت اور جدید بنانے کا عمل بھی اسی ڈویژن کے تحت کیا گیا جبکہ تین اور آرڈیننس یونٹ گوادر (بلوچستان)، نجوال اور حویلیاں میں تعمیر کرنے کے منصوبوں کا آغاز کر دیا گیا۔ ٹیکسلا کے نزدیک کامرہ ایروناٹیکل انجینئرنگ کا قیام پاکستان کی فضائیہ کے لیے ترقی کا ایک پیش خیمہ ثابت ہوا جہاں پر جہازوں کی اوور ہالنگ اور چھوٹے جنگی جہاز سازی کا پلانٹ نصب کیا گیا۔ اس کے علاوہ عوامی جمہوریہ چین کی مدد سے پاکستان میں پہلا ہیوی مکینیکل کمپلیکس ٹیکسلا کا قیام دوسری صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ پاکستان میں دفاعی صنعت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح کا ایک اور پلانٹ Machine Tool Factory لانڈھی کراچی میں بھی نصب کیا گیا۔

دسمبر 1973ء میں سابق سوویت یونین کی مدد سے پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی منصوبہ کراچی سٹیل ملز کے نام سے شروع ہوا جس کی سالانہ پیداوار 101 ملین ٹن ہے۔ یہ منصوبہ 1985ء میں مکمل ہوا۔ کراچی سٹیل ملز نے بھی پاکستانی دفاعی مصنوعات کو فروغ دیا۔ بھٹو حکومت کے مختصر عرصے میں جتنے دفاعی صنعتی منصوبے شروع کیے گئے وہ نہ بھٹو حکومت سے پہلے اس شدت یا رفتار کے ساتھ وجود رکھتے تھے اور نہ ہی تاحال کوئی قابلِ ذکر منصوبہ پاکستان میں عمل پذیر ہو سکا ہے۔ ان تمام دفاعی صنعتی منصوبوں کے علاوہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام نے پاکستان کی شکست خوردہ قوم اور فوج کو ایک نیا حوصلہ دیا۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام خطے میں طاقت کے توازن کا سبب بنا جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب حکومت کے دوران فروری 1975ء میں امریکہ کی طرف سے پاکستان پر اسلحے کی فروخت کی پابندی بھی اٹھالی گئی اور بھٹو حکومت امریکہ سے اپنے خاتمے تک جدید امریکی جنگی طیاروں اے سیون کی خریداری کے لیے مذاکرات کرتی رہی۔ بھٹو حکومت کے ان اقدامات نے پاکستان کے دفاع کو مزید مضبوط اور جدید بنایا جبکہ ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ بھٹو حکومت نے پاکستانی فوج کو مضبوط کیا جس کے ذریعے بھٹو نے اپنے اقتدار کو قائم رکھا۔

بھٹو حکومت نے دفاعی بجٹ میں بھی اضافہ کیا گیا جس کا نیچے دیئے گئے چارٹ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

دفاعی اخراجات 1970ء تا 1977ء

سال	دفاعی اخراجات ملین روپوں میں	دفاعی اخراجات، کل اخراجات کے مقابلے میں۔ فیصدی
1970-71ء	3,201.5	55.66 فیصد
1971-72ء	3,725.5	59.09 فیصد
1972-73ء	4,439.6	59.34 فیصد
1973-74ء	4,948.6	59.34 فیصد
1974-75ء	6,914.2	42.02 فیصد
1975-76ء	8,103.4	46.00 فیصد
1976-77ء	8,120.6	44.71 فیصد

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ 5 جولائی 1977ء کو چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء مسلط کیا جس کی حکومت اگست 1988ء تک قائم رہی۔ جنرل ضیاء الحق کے دورِ اقتدار میں حیران کن حد تک دفاعی بجٹ کم ہوتا چلا گیا حالانکہ ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں پاکستان افغانستان میں سابق سوویت یونین کی مداخلت کی وجہ سے امریکہ اور مغرب کا پسندیدہ ملک بن گیا اور افغان جہاد کے نام پر پاکستان کی کھل کر امداد کی گئی۔ درجِ ذیل چارٹ سے ضیاء دورِ حکومت میں دفاعی بجٹ کو پڑھ کر حیرانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوسکتا:

سال	دفاعی اخراجات ملین روپوں میں	دفاعی اخراجات، کل اخراجات کے مقابلے میں۔ فیصد
1977-78ء	9,674.5	42.46 فیصد
1978-79ء	10,167.6	34.06 فیصد
1979-80ء	12,654.8	36.31 فیصد
1980-81ء	15,300.1	39.01 فیصد
1981-82ء	18,630.7	43.22 فیصد

1982-83ء	23,224	34.34فیصد
1983-84ء	26,798	35.30فیصد
1984-85ء	31,794	34.88فیصد
1985-86ء	35,120	27.17فیصد
1987-88ء	38,619	25.38فیصد

افغانستان میں جولائی 1973ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا اور اقتدار پر سردار داؤد کا قبضہ ہوگیا۔ صدر سردار داؤد نے پاکستان کے خلاف ایک بڑی سیاسی مہم کا آغاز کیا اور پاکستان سے ایک نئے آزاد ملک پختونستان سے آزادی کی نام نہاد تحریک کی پشت پناہی شروع کردی۔ بلوچستان میں بھٹو حکومت نے سرداری نظام کے خلاف اصلاحات کا اعلان کردیا جس کے سبب بلوچ قبائلی سرداروں نے حکومت کے خلاف کھلی مسلح بغاوت کا آغاز کیا۔ ان دو وجوہات کے سبب بھٹو حکومت مزید فوج پر انحصار کرنے کی طرف گامزن ہوئی۔ فروری 1973ء میں جب بلوچستان کی صوبائی حکومت ختم کردی گئی تو صوبہ سرحد میں بھی مولانا مفتی محمود کی صوبائی حکومت نے بلوچستان کی حکومت توڑنے کے فیصلے کے خلاف مستعفی ہونے کا اعلان کردیا جس کے بعد بلوچستان میں فوج روانہ کرنے کا قدم اٹھایا گیا۔ فوج پر بھٹو حکومت کے انحصار نے فوج کے روایتی کردار میں یکدم اضافہ کردیا حالانکہ بھٹو حکومت اپنے اقتدار کے چند مہینوں کے بعد فوج پر انحصار کرنے کی بجائے فوج کے وجود کے روایتی کردار کو مانتے ہوئے خوشگوار تعلقات استوار کرنے پر گامزن تھی لیکن اس کے باوجود فوج کی طرف سے منتخب حکومت کے خلاف مارچ 1973ء میں بریگیڈیئرز کی سطح پر ناکام فوجی بغاوت ہوئی جو کامیاب نہ ہوسکی جبکہ 1977ء میں ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کرکے یہ ثابت کردیا کہ آئین کا آرٹیکل 6 فوجی بغاوت کو روکنے کی ناکام کوشش ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپریل 1976ء میں کوئٹہ میں کمانڈ اور سٹاف کالج میں جنرل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو کے اعزاز میں دیئے گئے ڈنر کے موقع پر کہا:

''ہم میں سے وہ جو حقائق اور اعداد و شمار سے باخبر ہیں یقینی طور پر جانتے ہیں کہ پاکستانی فوج پر جو زبردست توجہ 1971ء سے اب تک دی گئی ہے اس کی مثال 1971ء سے پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ سر، میں ذاتی طور پر اور فوج کی طرف سے اس سے واضح اور روشن حقیقت آپ کو پیش نہیں کرسکتا۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ شاید ایک دن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جب آپ بھی ہم میں موجود ہوں گے،

www.bhutto.org

پاکستان کی یہ افواج ثابت کریں گی کہ آپ نے اس پر جو توجہ اور شفقت فرمائی ہے بیکار نہیں گئی۔ میں آپ کو مؤدب اور سادہ الفاظ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں، سر، جو کچھ آپ کر رہے ہیں اور جو کچھ آپ نے ہمارے لیے بطور خاص کیا ہے۔"

اسی خوشامدی مظاہرے کی ایک اور مثال بڑی اہم ہے وہ یہ کہ کھاریاں میں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو مسلح افواج کی طرف سے آرمرڈ کور کا کرنل انچیف مقرر کیا گیا۔ یہ کسی سویلین کا پہلا اعزاز ہے جبکہ کرنل انچیف کا اعزاز فوج کے کسی جنرل کے عہدہ پر فائز شخص کو ہی دیا جاتا ہے جبکہ بعد میں مسلح افواج کے چیف جنرل ضیاء الحق نے 4اپریل 1979ء کو اپنے ہی کرنل انچیف کے بلیک وارنٹ پر دستخط کر کے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا۔ جیل میں ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کے بارے میں جو تاریخی الفاظ لکھے وہ شاید بھٹو کی تمام تحریروں کا نچوڑ ہیں:

"It seems that the lesson of this coup d'état is that a via media, a modus vivendi, a compromise, is a utopian dream. The coup d'état demonstrates the class struggle is irreconcilable and that it must result in the victory of one class over the other obviously, whatever the temporary setbacks, the struggle can lead only to the victory of one class. The coup leaders will be responsible for the coming events. This is their writing on the wall, It bears their signature."

(If I am Assassinated By Zulfiqar Ali Bhutto)

درحقیقت جب بھٹو حکومت نے فوج پر انحصار کرنا شروع کر دیا تو ملٹری بیوروکریسی کو یقین ہو گیا کہ موجودہ سول حکومت اور بھٹو کی عوامی قیادت سے زیادہ طاقتور فوج کا ادارہ ہے۔ بھٹو کی حکمران جماعت پی پی پی میں اختلافات اور جماعت کے ڈھانچے میں بائیں بازو اور مڈل کلاس کے عناصر کے روز بروز گھٹتے ہوئے اثر نے بھی ملٹری بیوروکریسی کی حوصلہ افزائی کی۔

بھٹو حکومت نے 1973ء اور 1976ء کے سیلابوں میں، 1974ء میں صوبہ سرحد میں زلزلے میں فوج کے امدادی کاموں میں شامل ہونے کے علاوہ سات بار فوج کی سویلین انتظامیہ کے لیے مدد حاصل کی جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(1) جولائی 1972ء — سندھ میں لسانی فسادات کے دوران فوج کی مدد لی گئی

(2) اکتوبر، نومبر 1972ء — کراچی میں لانڈھی اور کورنگی کے علاقوں میں مزدوروں کی طرف سے برپا احتجاج کے دوران

www.bhutto.org

(3)	دسمبر 1972ء	پٹ فیڈر اور لسبیلہ میں فسادات کے دوران
(4)	فروری 1973ء	بلوچستان میں بھرپور فوجی ایکشن (اقتدار کے خاتمے تک)
(5)	جون 1974ء	احمدیوں کے خلاف فسادات کے دوران
(6)	اکتوبر 1976ء	صوبہ سرحد میں قبائلی عوام اور سول انتظامیہ کے مابین فسادات کے دوران
(7)	اپریل سے جولائی 1977ء	پی این اے کی بھٹو حکومت کے خلاف تحریک کے دوران جبکہ اسی دوران کراچی، لاہور اور حیدرآباد کے شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا.

پاکستان جہاں پر فوج کی سیاست میں مداخلت کی ایک باقاعدہ روایت تھی ایسے ملک میں ایک منتخب عوامی حکومت (ترقی پسند نظریات رکھنے والی جماعت کی حکومت) کی طرف سے روز بروز فوج پر انحصار نے فوجی بیوروکریسی کی حوصلہ افزائی کی۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں پاکستانی سیاست کے فیصلہ کن ادارے فوج کے کھوئے ہوئے وقار (پاک بھارت جنگ 1971ء کے دوران) کی بحالی بجائے بھٹو حکومت کو طاقتور کرنے کے الٹا عوامی حکومت کو کمزور کرنے کا سبب بنی۔ چونکہ سیاست کا عوامی ادارہ (پی پی پی) اپنی حکومت کے دوران ترقی پسند اور مڈل کلاس قیادت سے محروم ہوتا چلا گیا جس نے پنجاب کے شہروں اور سندھ کے دیہاتوں میں اینٹی اسٹیبلشمنٹ کردار ادا کر کے پی پی پی کی تشکیل، آمریت کا خاتمہ اور ووٹوں کے ذریعے اقتدار کے راستے تعمیر کیے تھے۔ بھٹو کے سیاست میں کرشماتی کردار پر انحصار نے پی پی پی کے مڈل کلاس کردار کو بھی کمزور کیا جس سے پی پی پی کی اعلیٰ قیادت میں شامل ترقی پسند اور درمیانے طبقے کی قیادت، حکومت اور پارٹی سے علیحدہ اور isolate ہوگئی اور یوں وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو، حکومت حتیٰ کہ پارٹی معاملات میں سول بیوروکریسی اور ملٹری بیوروکریسی پر انحصار کرنے لگے۔ یہ ایک روایتی انداز تھا جس نے بھٹو حکومت کو 1977ء کے سیاسی بحران میں داخل کیا اور یوں سیاسی بحران میں بھٹو حکومت اندرونی اور بیرونی سازشوں کا مقابلہ نہ کر پائی اور فوج کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی پالیسی اور آئین میں سول حکومت کے خاتمے کی شق آرٹیکل 6، ملٹری قیادت کو جمہوریت کی بساط لپیٹنے، آئین ختم کرنے اور عوام کے ووٹوں سے منتخب حکومت کو ختم کرنے سے نہ روک سکی۔

www.bhutto.org

منزلیں اور مرحلے

مسٹر بھٹو نے مختصر مدت میں جتنی تیزی سے مختلف شعبوں میں اصلاحات کیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مسٹر بھٹو اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں کس قدر دلچسپی لیتے تھے جبکہ اپوزیشن والے ہر لمحہ حکومت کے لیے مسائل کھڑے کرنے میں کوشاں رہے۔ ایک طرف مسٹر بھٹو نے 21 مارچ 1973ء کو بلوچستان میں ششک ٹیکس کے خاتمے کا اعلان کیا تو دوسری طرف اگست 1976ء میں گلگت و بلتستان میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے استحصالی نظام پر ایک کاری ضرب لگائی جبکہ بائیں بازو کے دو اہم راہنماؤں محمود علی قصوری اور معراج محمد خان نے اکتوبر 1972ء کو صدر بھٹو کو اپنے استعفے پیش کر دیئے اور یوں ان دونوں راہنماؤں نے مسٹر بھٹو کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لازمی تھا کہ اسی صورت میں جاگیردار، سرمایہ دار حکومت پر اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان دو استعفوں کے بعد روز بروز پارٹی اور حکومت میں بائیں بازو کے راہنماؤں کا اثر کم ہوتا چلا گیا اور پی پی پی حکومت میں جاگیرداروں اور دوسرے روایتی سیاستدانوں کی آمد کا سلسلہ چل نکلا۔

اس دوران سندھ کے اندر شکست خوردہ اپوزیشن نے لسانی فسادات کا بازار گرم کر دیا جس کو مسٹر بھٹو نے سیاسی طریقے سے حل کر لیا۔ ان حالات میں بھی مسٹر بھٹو نے اصلاحات اور پارٹی کے پروگرام پر عمل جاری رکھا۔ اگست 1972ء میں پہلے سندھ کے 97 کالجوں پھر ستمبر کے ماہ میں سندھ ہی کے 141 سکولوں کو عوامی تحویل میں لے لیا گیا۔ سرمایہ دار ممالک میں تعلیم ایک کاروبار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جیسے نیم سرمایہ داری و جاگیرداری نظام کے حامل ممالک میں تعلیم کا حصول غریب اور محنت کش کے بچوں کے لیے ناممکن ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے بڑے تعلیمی اداروں میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور ان

www.bhutto.org

سکولوں میں پڑھنے والے ہم پر حکومت کرتے ہیں لیکن مسٹر بھٹو کی تعلیمی اصلاحات، جن میں طلبا کو سفری سہولتوں کے ساتھ ساتھ میٹرک تک مفت تعلیم تھی، ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں کس حد تک انقلابی تبدیلی ہے اور National Development Volunteer Programme (این ڈی وی پی) کی سکیم بھی ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں جس کے تحت حکومت نے بے روزگاروں کو تحفظ فراہم کیا۔ رجسٹرڈ بے روزگاروں کو اس پروگرام کے تحت وظیفہ دیا گیا اور بعد میں ان کو مناسب نوکریاں فراہم کیں آج ہزاروں افراد ایسے ہیں جو این ڈی وی پی کے تحت نوکریوں میں آئے اور مستقل ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مسٹر بھٹو کی متوازن خارجہ پالیسی ہی کے تحت پاکستان نے دولتِ مشترکہ سے علیحدگی اختیار کی اور پھر 9 نومبر 1972ء کو مسٹر بھٹو نے معاہدۂ سیٹو سے علیحدگی کے بعد یہ ثابت کر دکھایا کہ ہم امریکی سامراجی عزائم میں کسی طرح بھی اس کے مددگار نہیں ہوں گے۔ ہمیں اپنا قومی مفاد افضل ہے جو تیسری دنیا کے مفادات سے وابستہ ہے۔ معاہدۂ سیٹو نے پاکستان کو امریکہ سے اس طرح نتھی کر دیا تھا کہ ہم امریکی سامراج کے گماشتے کا کردار ادا کر رہے تھے۔ سیٹو سے علیحدگی مسٹر بھٹو کی خارجہ پالیسی کا بہت بڑا انقلابی اقدام تھا اور پھر اس کے ساتھ ہی مسٹر بھٹو نے شمالی کوریا اور سابق مشرقی جرمنی کو تسلیم کر کے یہ ثابت کر دکھلایا کہ ہمارا مفاد ترقی پذیر اور ترقی پسند ممالک کے ساتھ دوستی ہی میں مضمر ہے۔

1972ء کے آخر تک بلوچستان میں حالات بگڑنے شروع ہو گئے تھے اور فوج نے وہاں پر آہستہ آہستہ نظم و نسق سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ عراقی سفارتخانے سے اسلحہ برآمدگی اور سرحد میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اس بات کی علامت تھی کہ جمہوری حکومت کو ناکام کرنے کی کوششیں تیز ہو گئی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جمہوری حکومت کے ہوتے ہوئے فوج کی کارروائی کو پسند نہیں کیا جا سکتا اور فوج کی بلوچستان میں مداخلت نے خود پاکستانی سیاست پر کسی طرح بھی اچھے اثرات مرتب نہیں کیے۔ بلوچستان کے سرداروں نے اپنے قبائل کو جدید اسلحہ کے ساتھ پاکستان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جس کے پیچھے غیر ملکی مدد کارفرما تھی۔ نیپ کی طرف سے سرحد میں دہشت گردیاں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پی پی پی سرحد کے راہنما حیات محمد خان شیر پاؤ ایک بم کے پھٹنے سے ہلاک ہوئے تھے۔ یہ نیپ کی تخریبی سرگرمیوں کی ہی کڑی ہے۔ حیات محمد شیر پاؤ شہید

نے باچا خان کے خاندان کی سیاست کو اپنی شخصیت اور پارٹی کے منشور کی بدولت بہت نیچا کر دکھایا تھا۔ حکومت کے پاس اس بات کے مستند شواہد موجود تھے تبھی تو حکومت نے نیپ کے خلاف سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کیا اور اس کو کالعدم قرار دیا۔

ان حالات میں جب بلوچستان میں گڑ بڑ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اپوزیشن نے سندھ میں لسانی بنیادوں پر فسادات کروانے کی کوششیں کیں۔ ان تمام مشکلات کے باوجود زرعی کسانوں، مزدوروں اور طلباء کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ بھٹو نے قوم کو ایک مستقل آئین دینے کی جدوجہد جاری رکھی۔ شروع شروع میں اپوزیشن نے اس کام میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی لیکن مسٹر بھٹو نے اپوزیشن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ قوم کا مفاد اسی میں ہے کہ ہم جلد از جلد آئین بنا کر اس کو نافذ کر لیں۔ 10 اپریل 1973ء کو قومی اسمبلی نے پاکستان کا مستقل آئین منظور کر لیا۔ اس آئین پر ملک کی تمام جماعتوں نے دستخط کیے۔ آئین سازی کے سلسلے میں قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا:

"یہ نہایت غیر معمولی کام ہے اور میرا قیاس ہے کہ اس کی تکمیل میں اٹھارہ ماہ سے دو سال کا عرصہ درکار ہے۔"

لیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے چھبیس سال کے بعد قوم کو جمہوری آئین ملا۔ آئین کی تشکیل پر مسٹر بھٹو نے کہا تھا:

"1973ء کے آئین کو کبھی بھٹو کا آئین نہیں کہا جائے گا جیسے ایوب کا آئین۔ چونکہ یہ آئین عوام کی منتخب اسمبلی نے بنایا ہے، اس کو ہمیشہ عوامی آئین کہا جائے گا۔"

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ 1973ء کا آئین مسٹر بھٹو کی محنت و ہمت کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ مسٹر بھٹو نے 1973ء میں آئین کی شکل میں ایک ایسا تحفہ قوم کو دیا جو استحکامِ پاکستان اور ملک میں جمہوریت کا ضامن ہے۔

1973ء کا آئین ایک وفاقی آئین ہے جس میں وفاقی اکائیوں کے اختیارات اور خود مختاری بھی شامل ہے۔ 1973ء کے آئین کے تحت مقننہ کے دو ایوان، سینٹ اور قومی اسمبلی قرار پائے۔ 1973ء کا آئین ایک اسلامی آئین ہے۔ اس آئین کے تحت مملکت کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا گیا اور اس کے علاوہ دستور میں بھی شامل کیا گیا کہ ملک میں کوئی قانون بھی

www.bhutto.org

خلاف اسلام نہیں بنایا جائے گا اور موجودہ قوانین کو بھی قرآن و سنت کے قالب میں ڈھالا جائے گا اور اس مقصد کے لیے اسلامی مشاورتی کونسل قائم کی گئی۔ آزاد عدلیہ، بلاواسطہ انتخابات، پارلیمانی نظام حکومت، بنیادی اور انسانی حقوق اور پالیسی کے اصول اس آئین کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پالیسی کے اصول سب سے پہلے سپین کے دستور میں شامل کیے گئے تھے۔ اس کے بعد آئرلینڈ 1937ء برما 1948ء اور ہندوستان نے 1950ء کے آئین میں شامل کیے تھے۔ پالیسی کے اصول ملک کا آئندہ لائحۂ عمل ہوتے ہیں۔ پالیسی کے اصول ملک کی منزل اور مقاصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس میں دس پالیسی اصول ہیں:

پالیسی کے اصول:

1- اسلامی طرز زندگی
2- مقامی حکومتی اداروں کا فروغ
3- تعصبات کا انسداد
4- خواتین کے حقوق
5- خاندان کا تحفظ
6- اقلیتوں کا تحفظ
7- معاشرتی انصاف کو فروغ اور برائیوں کا سدباب
8- عوام کی معاشرتی اور معاشی بہبود
9- فوج میں عوام کا حصہ
10- خارجہ تعلقات

جبکہ بنیادی حقوق کی تعداد 20 ہے۔ جہاں اس آئین نے ملک میں مستقل جمہوریت کا راستہ کھولا اور جمہوریت کے تحفظ کے لیے آئین میں یہ شق رکھی گئی کہ غیر آئینی طریقے یا طاقت سے دستور توڑنا سنگین غداری ہے تاکہ ملک میں آئندہ کوئی شخص قوم کی اتنی بڑی جدوجہد کے نتیجے میں معرض وجود میں آنیوالی دستاویز کو رد کرتے ہوئے آمریت نہ مسلط کردے۔ 2 فروری 1974ء کو آئین کے تحت ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کا قیام عمل میں آیا۔ 1973ء کا دستور اگست میں نافذ کر دیا گیا۔ آئین کے تحت ذوالفقار علی بھٹو 12 اگست 1973ء کو وزیر اعظم پاکستان اور فضل الٰہی

www.bhutto.org

چوہدری صدرِ مملکت منتخب ہو گئے اور یوں پاکستان میں آئینی بحران کا خاتمہ ہوا، جس کے سبب کئی بحران وارد ہوئے تھے۔ قدرت کا نظام دیکھیں، ایک طرف اگست میں 1973ء کے دستور کا نفاذ ہوا دوسری طرف پاکستان سیلاب کی تباہ کاریوں کا شکار ہوا۔ اسلامی ممالک خصوصاً سعودی عرب اور لیبیا نے اس ناگہانی آفت پر جس جوش و جذبے کے ساتھ پاکستانی عوام کی مدد کی، پاکستان کے عوام اس کو کبھی نہیں بھلا سکتے مگر اپوزیشن نے تباہ کاریوں کے باوجود اگست میں حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی ناکام تحریک چلانے کا اعلان کر دیا جبکہ حکومت نے سیلاب کی تباہ کاریوں کے سبب جشنِ آئین منسوخ کر دیا تھا۔

ہلالِ احمر جس کو پہلے ریڈ کراس کے نام سے پکارا جاتا تھا، جنوری 1974ء کو قومی اسمبلی نے ہلالِ احمر کے نام کی منظوری دے دی۔ ملک بھر میں اولیاء اللہ کے مزارات کی تعمیرِ نو اور وہاں پر سہولیات کا سہرا بھی مسٹر بھٹو کے سر ہے۔ مسٹر بھٹو نے جہاں ان مزارات کی تعمیر پر فراخدلی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا، وہاں مسٹر بھٹو نے خود اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دے کر یہ ثابت کر دکھایا کہ انسانیت کا درس دینے والے یہ صوفیائے کرام ہی برصغیر میں اسلام کے صحیح خدمت گار ہیں۔ صوفیائے کرام کا فلسفہ اور صوفیاء کرام کی شاعری انسانیت کا درس دیتی ہے۔ ہر انسان سے پیار کا درس، بلا رنگ و نسل، بغیر کسی امتیاز کے ساتھ۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے برصغیرِ پاک و ہند کے اندر اپنے عمل کی بدولت اسلام کو پھیلایا۔ چونکہ صوفیائے کرام کے کردار میں جبر نہیں، وہ پیار و امن کا درس دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ملاؤں کو مرنے کے بعد لوگ بھلا دیتے ہیں اور صوفی کے انسانیت دوست کردار کی بدولت لوگ ان کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ دراصل بھٹو کی عوامی سیاست کی بنیاد ترقی پسند نظریات اور صوفیائے کرام کے فلسفۂ انسانیت پر ہے۔

بنیادی صنعتوں کو تو مسٹر بھٹو نے برسرِ اقتدار آتے ہی قومی تحویل میں لے لیا تھا جبکہ دیگر صنعتی اداروں کو قومیانے کا سلسلہ مرحلہ وار جاری رہا۔ ستمبر 1973ء کو گھی ملوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا اس کے بعد پندرہ قومی بنکوں کو قومی تحویل میں لینے کا اقدام دوررس نتائج کا حامل ہے کہ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے صنعت کاروں نے اپنے پرائیویٹ بنک بنا کر جس طرح دونوں ذرائع سے عوام کا خون چوسنے کا عمل جاری کیا تھا وہ ہر طرح سے قابلِ مذمت

ہے۔ عوامی حکومت نے یکم جنوری 1974ء کو جب بنکوں کو قومی ملکیت میں لیا تو سرمایہ دار بوکھلا گئے صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے مزدوروں کے روزگار کو تحفظ بھی ملا اور اس پروگرام کو آگے بڑھایا گیا جس کا وعدہ پی پی پی نے اپنے منشور میں کیا تھا۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا مسٹر بھٹو کے یہ اقدامات اس حوالے سے درست ہیں جو انہوں نے پارٹی کے منشور میں کیے تھے؟ ان اقدامات سے مسٹر بھٹو کے لیے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی طرف سے مسائل کھڑے کیے گئے جبکہ ان اقدامات سے جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ سرمایہ دار اور جاگیردار کھل کر حکومت کی مخالفت میں اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ مل گئے اور دوسری خطرناک بات یہ ہوئی کہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے اپنے تحفظ اور اپنے مفاد کی خاطر پاکستان پیپلز پارٹی میں گھسنے کا آغاز کر دیا۔ ان حالات نے پارٹی کے بائیں بازو کے دل میں بددلی کی فضا بھی پیدا کی اور اس طرح سول بیوروکریسی نے بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا ساتھ دینے کی ٹھان لی تھی اور یوں پی پی پی کے راستے حکومت میں موقع پرست عناصر کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

1973ء کی عربوں کی جنگِ رمضان میں مسٹر بھٹو نے کھل کر عربوں کی عسکری اور سیاسی مدد کی۔ اسرائیل نے ستمبر 1973ء میں مصر و شام کے ساتھ جنگ کی تو نہ صرف تمام عرب ممالک اور تمام مسلم ممالک بلکہ تیسری دنیا کے دیگر ممالک بھی اکٹھے ہو گئے۔ جمال عبدالناصر اور سوئیکارنو کی غیر موجودگی نے جو خلا پیدا کیا تھا اس کو نئی قیادت نے پُر کر دیا تھا۔ مسٹر بھٹو، معمر قذافی، حافظ الاسد، شاہ فیصل اور یاسر عرفات نے مل کر صیہونیت اور امریکی سامراج کے خلاف دلیری کے ساتھ جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ سعودی عرب جو کہ امریکی بلاک میں تھا، وہ بھی اسرائیلی جارحیت کے خلاف اسی طرح ڈٹ گیا جس طرح لیبیا یا شام۔ اس جنگ میں مسٹر بھٹو کی فکری تخلیق نے دنیا بھر کو دنگ کر دیا۔ عرب ممالک جو تیل کی دولت سے مالا مال ہیں، بھٹو نے ان کو تیل بطور ہتھیار استعمال کرنے کی ترغیب دی اور اس طرح تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک نے اسرائیل کی حمایت کرنے والے اور اس کے دوست ممالک کو تیل کی برآمدگی پر پابندی لگا کر جاپان سے لے کر امریکہ تک صنعت کو جیم کر دیا۔ عربوں کا یہ ہتھیار مغربی ممالک کے لیے غیر متوقع بھی تھا اور حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ مسائل کا انبار بھی تھا۔ خود سابق امریکی صدر نکسن نے اس ہتھیار کے استعمال پر حیرانی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سیاسی سوانح عمری میں عربوں کے اس کردار کو حیران کن اور غیر متوقع

ہتھیار قرار دیا اور کہا کہ اس ہتھیار نے ہمیں بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ یہ عمل مسٹر بھٹو کی سامراج کے خلاف بہت بڑی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ سامراج مسٹر بھٹو کے اس کردار کو کسی طرح بھی بھلا نہیں سکتا۔ مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ "عربوں کی جنگ ہماری جنگ ہے۔"

اسی طرح جب ترکی کے راہنما سابق وزیر اعظم بلند ایجوت نے ترک قبرص آبادی کے تحفظ کے لیے ترکیہ کی افواج کو قبرص میں جنگ کے لیے بھیجا اور یونان کے ناجائز کردار کے خلاف ترک قبرصی عوام کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تو مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ

"یہ ترکوں کی جنگ نہیں بلکہ ہماری جنگ ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ ترکی میں ہر بچہ مسٹر بھٹو کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ تیسری دنیا اور عالمِ اسلام کو خوشحال، خودمختار اور ترقی یافتہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے یو۔ این میں پہلی تقریر کے دوران بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا تھا کہ چھوٹی مظلوم اقوام کے ساتھ زیادتی کا ایک نظام استوار کیا گیا ہے۔

24 فروری 1974ء کا دن پاکستان ہی کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی سیاست میں ایک یادگار دن ہے۔ عالمِ اسلام کے راہنماؤں نے لاہور میں مشترکہ جدوجہد کا فیصلہ کیا۔ فلسطین، کشمیر، استحصال کے خاتمے اور سامراج کے خلاف جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا۔ اسلامی بنک کے قیام کا فیصلہ اور تیل کی دولت کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلامی ممالک کی ترقی وفلاح و بہبود کا فیصلہ کیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسلامی ممالک نئے عالمی اقتصادی نظام کے لیے جدوجہد کریں گے اور مشترکہ مسلم منڈی کے مواقع پیدا کیے جائیں گے۔ پاکستان کے عوام وہ منظر کبھی نہیں بھلا سکتے۔ جب شاہ فیصل شاہی مسجد لاہور میں نماز کے بعد دعا کے دوران رو پڑے۔ ان کی آنکھوں سے چھلکتے آنسو مسلم اتحاد اور استحصال کے خاتمہ کی جدوجہد کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے ساتھ ہی صف میں قذافی اور چیئرمین اسلامی کانفرنس مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تھے ان راہنماؤں کا اتحاد ترقی پذیر ممالک کے عوام کے لیے جدوجہد کا پیغام تھا اور سفید ہاتھی اس پر بڑا ناراض تھا۔ یہ سربراہانِ مملکت اسلامی ممالک کے عوام کے لیے عملی جدوجہد کے فیصلے پر رضامند ہوئے تھے۔ مسٹر بھٹو نے اسلامی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"صدیوں سے ہم بھی تقدیر بدلنے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ اب وہ منزل آ پہنچی ہے۔

www.bhutto.org

ایک صبح کی آمد اب کوئی موہوم اُمید نہیں ہے۔ اب یہ ضروری نہیں کہ غربت اور ناداری ہمارا مقسوم ٹھہرے یا ذلت وخواری کو ہم اپنا ورثہ سمجھیں۔ اب یہ بھی ضروری نہیں کہ دنیا میں ہم محض جہالت اور ناخواندگی کی وجہ سے پہچانے جائیں۔ عالمِ اسلام کے لیے ہم خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔"

مسلم اقوام کے راہنماؤں کے اصرار پر مسٹر بھٹو نے بنگلہ دیش کو اس موقع پر تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد انور سادات نے بنگلہ دیش جا کر شیخ مجیب کو پاکستان میں سربراہ کانفرنس میں شرکت پر آمادہ کیا اور یوں شیخ مجیب اس سربراہ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ بھٹو حکومت کی اپوزیشن کا یہ غلط پراپیگنڈہ ہے کہ اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد صرف بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے کیا گیا اور یہ کہ اسلامی کانفرنس بھٹو کا ایک ڈھونگ تھا محض بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے۔

معمر قذافی پاکستان کے عوام سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے اسلامی کانفرنس کے موقع پر حکومت سے درخواست کی کہ چند دن مزید پاکستان میں قیام کروں گا اور عالم اسلام کی اس دلیر قوم سے رابطہ کا خواہاں ہوں۔ چنانچہ انہوں نے قذافی سٹیڈیم لاہور میں تاریخی خطاب کیا۔ انہوں نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ قرار دیا اور پاکستان کے عوام کو اسلام کی فوج اور مسٹر بھٹو کو اسلام کا مجاہد قرار دیا۔ عوام نے جذباتی لگاؤ کے سبب جناب قذافی کا شاندار استقبال کیا۔ مسٹر بھٹو نے اپنے دوست قذافی کی عوام سے رابطہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کو عوامی جلسوں سے خطاب کا موقع فراہم کیا۔ شاہِ ایران جو قذافی کی کانفرنس میں شرکت کی بناء پر کانفرنس میں شریک نہ ہوا تھا، اب اس نے اس بات کو بھی بڑا ناپسند کیا کہ اس کے پڑوس (پاکستان) میں آکر قذافی انقلابی خیالات کو عوام تک پہنچائے اور امریکی سامراج کو للکارے۔

کانفرنس کے اختتام کے بعد نیویارک ٹائمز کا ایڈیٹر ایران کے دورے کے بعد پاکستان کے وزیرِ خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کو ملا اور اس نے ڈاکٹر مبشر حسن کو بتایا کہ "رضا شاہ، بھٹو پر بہت ناراض ہے میں ان سے مل کر آیا ہوں۔ وہ مسٹر بھٹو کو بڑا بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ ان کا رویہ مسٹر بھٹو کے خلاف شدید ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ وہ پاکستان کی اقتصادی امداد بند کردے گا۔" امریکی صحافی نے ڈاکٹر مبشر حسن کو بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ اب پاکستان کے ساتھ ایران تعلقات بگاڑ لے گا اور اس واقعہ کے بعد جب مسٹر بھٹو اپنے وفد کے ساتھ مارچ 1974ء میں ایران گئے تو شاہ ایران ان دنوں خرج کے جزیرے میں ایک محل میں قیام پذیر تھے۔ اس دورہ میں

مسٹر بھٹو کو ایران میں خاص اعزاز کے ساتھ ریسیو نہ کیا گیا۔ جب مسٹر بھٹو اپنے وفد کے ہمراہ خرج کے شاہی محل میں رضا شاہ سے ملنے گئے تو رضا شاہ نے بڑے روکھے انداز میں وزیرِ اعظم پاکستان کو خوش آمدید کہا۔ اس نے صوفے سے اٹھے بغیر مسٹر بھٹو سے ہلکا سا مصافحہ کیا۔ مسٹر بھٹو یہ صورت حال دیکھ کر کافی حیران ہوئے۔ انہوں نے اپنے وفد کے تمام اراکین کو اپنے اپنے کمروں میں جانے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر مسٹر بھٹو اور شاہِ ایران علیحدگی میں بات چیت کرتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد مسٹر بھٹو نے اپنے ساتھیوں کو واپس کمرے میں بلا بھیجا تو پاکستانی وفد کے اراکین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شاہِ ایران اور وزیرِ اعظم پاکستان ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں اور دونوں سربراہان مملکت بہت ہی خوشگوار موڈ میں ہیں جبکہ کچھ دیر پہلے رضا شاہ مسٹر بھٹو کے ساتھ خواشگوار انداز میں ہاتھ ملانے پر بھی آمادہ نظر نہ آتے تھے۔ مسٹر بھٹو میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ دوسرے کو بڑے اچھے طریقے سے جلد ہی اپنا قائل کر لیتے تھے اس ایرانی دورے کے بعد مسٹر بھٹو پاکستان کے لیے بہت بڑی امداد لے کر آئے۔

عوامی دورِ حکومت میں 1974ء کا سال اچھے نتائج برآمد کرنے میں کامیاب ثابت ہوا۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک عوامی حکومت نے کافی کامیابیاں حاصل کیں۔ اسی سال شکاگو کے محنت کش مزدوروں کا یومِ شہادت یکم مئی پہلی مرتبہ سرکاری طور پر منایا گیا اس اقدام نے مزدوروں کو عالمی سطح پر ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ عوامی حکومت نے مزدوروں کے عالمی دن کو سرکاری طور پر منا کر مزدوروں کے حقوق کی آواز میں آواز ملائی۔ اسی سال حکومت نے ملکی ترقی کے لیے ''قدرتی وسائل کی ترقیاتی کارپوریشن'' قائم کی۔ سونے اور دیگر قیمتی دھاتوں کی تلاش کی کوششیں تیز کیں خصوصاً تیل کی تلاش کے لیے حکومت نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور لاہور میں خشک بندرگاہ قائم کر کے ملکی ترقی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سابق سوویت یونین نے بھٹو حکومت کے ساتھ تیسری دنیا کی سب سے بڑی سٹیل ملز لگانے کا معاہدہ کیا۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی منصوبہ ہے جس کو امریکہ 1954ء سے سبوتاژ کر رہا تھا لیکن سابق سوویت یونین نے پاکستان کے اس عظیم الشان منصوبے میں معاون ہو کر ثابت کر دکھایا کہ وہ ترقی پذیر ممالک کے عوام کا دوست ہے۔ یہ مسٹر بھٹو کی خارجہ پالیسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان سابق سوویت یونین سے کراچی سٹیل ملز لگوانے میں کامیاب ہو گیا۔ رجعت پسندوں نے کھل کر اس منصوبے کی بھی

www.bhutto.org

مخالفت کی اور اس کو ملکی معیشت پر ایک بڑا بوجھ قرار دیا اور غیر منطقی پراپیگنڈہ کیا کہ سٹیل ملز کے قیام سے روس کی مداخلت پاکستان میں ہوجائے گی۔ کراچی سٹیل ملز یقیناً پاکستان کی ترقی میں زبردست اثرات مرتب کر رہی ہے اور آج اس کی مخالفت کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔

مئی 1974ء میں ہندوستان نے راجستھان کے ایک مقام کوٹہ میں ایٹمی دھماکہ کیا تو مسٹر بھٹو نے اس بات کا سختی کے ساتھ نوٹس لیا۔ مسٹر بھٹو نے بھارت کے ایٹمی دھماکہ کے فوراً بعد ایک پریس کانفرنس کے دوران کہا کہ "پاکستان بھارت کے ایٹمی دھماکہ کی وجہ سے اپنی خارجہ پالیسی تبدیلی نہیں کرے گا۔"

مسٹر بھٹو نے عالمی راہنماؤں کو بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کے لیے پیغامات ارسال کیے۔ چین نے اس دھماکہ کے بعد اعلان کیا کہ "ایٹمی حملہ اور بیرونی جارحیت کے خلاف پاکستان کی بھرپور امداد کی جائے گی۔"

مسٹر بھٹو نے ہندوستان کے متعلق کہا کہ "یہ دیو بنتا جارہا ہے۔" ذوالفقار علی بھٹو نے انڈیا کی عسکری صلاحیتوں کے بڑھتے ہوئے کردار پر شدید نکتہ چینی کی اور انہوں نے کشمیر کے مؤقف پر اپنا ردعمل شدید کر دیا۔ ہندوستان کی حکومت مسٹر بھٹو کی خارجہ پالیسی سے یقیناً پریشان تھی۔ مسٹر بھٹو کی بلند قامت شخصیت کے سامنے ہندوستان جیسے بڑے ملک کی سربراہ اندرا گاندھی سیاسی طور پر بڑی چھوٹی معلوم ہوتی تھیں۔ مسٹر بھٹو نے اپنی سیاسی بصیرت کی بدولت دنیا بھر میں پاکستان کے دوست پیدا کر لیے تھے۔ 29 جنوری 1975ء کو گجرات میں ایک جلسہ عام میں وزیراعظم پاکستان نے پاکستان، کشمیر اور دنیا بھر میں کشمیری عوام سے ہڑتال کی اپیل کر دی۔ 28 فروری کو مسٹر بھٹو کی اپیل پر پاکستان، آزاد کشمیر، مقبوضہ جموں کشمیر میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں بسنے والے کشمیریوں نے کاروبارِ زندگی مکمل طور پر بند رکھا۔ ہندوستان و برطانیہ اور امریکہ میں بھی موجود ہر کشمیری نے مکمل ہڑتال کی۔ دنیا میں موجود تمام کشمیریوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر لبیک کہا۔ جہاں پر بھی کشمیری تھا اس نے اپنی دکان بند کی یا دفتر سے چھٹی کی۔ اس طرح کشمیری عوام کا کامیاب استصواب رائے ہوا۔ اس ہڑتال نے کشمیریوں کے حق خود اختیاری کو زندہ جاوید کر دیا۔ کشمیری عوام نے پاکستان پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ کشمیری عوام نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت پر اعتماد کا ووٹ دے دیا تھا۔ کشمیریوں کی اس ہڑتال نے کشمیر کے مسئلے میں

www.bhutto.org

نئی جان ڈال دی۔

مسٹر بھٹو کی جدوجہد کے ساتھی اور عرب کاز کی حمایت کے جرم میں 25 مارچ کو سعودی عرب کے شاہ فیصل کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پاکستانی عوام نے اس کی بھرپور مذمت کی۔ دراصل امریکہ کو شاہ فیصل کا وہ فعل پسند نہ آیا تھا جو انہوں نے مسٹر بھٹو کے ساتھ مل کر بوجوہ امریکہ کو تیل کی سپلائی بند کر کے کیا تھا۔ امریکہ نے چلی کے صدر الاندے کو قتل کروایا اور سی۔ آئی۔ اے نے اس کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی کہ الاندے ہمارے مفادات کے خلاف کام کر رہا تھا۔ تیسری دنیا کے ممالک میں امریکی مداخلت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ شاہ فیصل شہید کا قتل آئندہ آنے والے مزید خطرات کی بھی خبر دیتا ہے۔

مسٹر بھٹو نے جب حکومت سنبھالی تھی تو انہوں نے بلوچستان میں پٹ فیڈرز کی زرعی زمین کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر 117 کے تحت سرکاری اراضی قرار دیا۔ پھر انہوں نے مئی 1975ء میں پٹ فیڈرز کی پانچ لاکھ ایکڑ اراضی کاشت کرنے والے مزدوروں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا اس موقع پر مسٹر بھٹو نے ٹمپل ڈیرہ میں اپنی تقریر کے دوران کہا:

"اب یہ زمین بیگمات کی یا کسی آفیسر کی نہیں بلکہ یہ زمین پٹ فیڈرز کے کسانوں کی ہے اور انہیں اس حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ پٹ فیڈرز کی زمین کے اصل مالک کسان ہیں۔"

لیکن ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کیا تو جمالی قبیلے کے سرداروں نے 5 ہزار مسلح افراد کے ہمراہ یہ زمین چھین لی اور نہتے محنت کش کسانوں پر حملہ کیا۔ حملہ کرنے والوں میں مسٹر بھٹو کی حکومت کے سابق وزیر تاج محمد جمالی بھی شامل تھے۔ اس لڑائی میں 150 کسان شہید ہوئے۔ مسٹر بھٹو نے بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ کر کے اس ملک میں قرونِ وسطیٰ کے دور کا خاتمہ کیا۔ بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ بھٹو کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بلوچستان کا زیادہ تر علاقہ ان سرداروں ہی کے زیرِ اثر تھا۔ جب مسٹر بھٹو نے اقتدار سنبھالا تھا تو اس وقت صوبہ بلوچستان کا صرف 137 مربع میل کا علاقہ ہی حقیقی طور پر حکومتِ پاکستان کے کنٹرول میں تھا۔ سرداری نظام کے خاتمے نے اس صورتحال کو ختم کر دیا۔ سرداری نظام کے خاتمے سے قبل سرداروں کے کنٹرول والے علاقے میں سردار کی اجازت کے بغیر چھوٹے افسر سے لے کر صدرِ پاکستان اور وزیرِ اعظم تک کوئی بھی قدم

www.bhutto.org

تک نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس کے علاوہ مسٹر بھٹو کی حکومت نے ایک اور ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس میں معاشرے کی ایک بڑی برائی کے خاتمے کی امید بندھی، وہ ہے جہیز پر پابندی۔ قومی اسمبلی نے ایک بل پاس کیا کہ اگر پانچ ہزار سے زائد جہیز دیا گیا تو اسے ضبط کرلیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس سے غریبوں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کے گھروں میں تسلی اور سکون کی لہر دوڑی۔

20 فروری 1976ء کو وزیر اعظم پاکستان نے ملک کے مفاد کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا کے مشترکہ مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فرانس کے ساتھ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے کا معاہدہ کیا۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ ''ہماری کوشش تھی کہ ہم یہ پلانٹ کینیڈا سے لیتے چونکہ وہ کارکردگی کے لحاظ سے سب سے بہتر مانا گیا ہے اور میں نے ایوب کے دور میں بھی اس کے حصول کے لیے کوشش کی تھی لیکن ایوب خان نہ مانے اور اگر یہ پلانٹ اس وقت حاصل کرلیا جاتا تو سستا بھی رہتا اور آج پاکستان بڑے اونچے مقام پر کھڑا ہوتا۔''

مارچ 1976ء کا مہینہ پاکستان کی سیاست میں بڑا اثر انداز ہوا۔ مسٹر بھٹو نے یکم مارچ کو جنرل ضیاء الحق کو بری فوج کا چیف آف سٹاف مقرر کردیا۔ مسٹر بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کو سات جرنیلوں پر فوقیت دے کر چیف آف سٹاف مقرر کیا۔ اس نے 1945ء میں کمیشن لیا تھا۔ جنرل ضیاء بکھرسٹ کا تربیت یافتہ ہے۔ ضیاء الحق 1965ء تک صرف بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچا۔ پھر جب بریگیڈئر ضیاء الحق، شاہ حسین کے ملک اردن گیا تو اس نے اپنی کارکردگی دکھاتے ہوئے تقریباً 20 ہزار فلسطینیوں کا قتلِ عام کیا اور اس کی اس عسکری صلاحیت کی بنا پر شاہ حسین نے اس کو ترقی کے قابل ٹھہرایا اور ضیاء کو اردن کا فوجی اعزاز بھی دیا۔ درحقیقت اردن میں فلسطینیوں کے قتل عام کے بعد اس کو امریکیوں کے قریب ہونے کا بڑا موقع ملا۔ اس کے بعد پاکستان واپس آ کر میجر جنرل بنا۔ جنرل ضیاء کے متعلق شروع ہی سے یہ تأثر تھا کہ وہ سیاست سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے متعدد بار تقاریر میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو صلاح الدین ایوبی اور فرزندِ اسلام جیسے القابات سے پکارا۔ جنرل ضیاء نے وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو ملک و قوم کی اعلیٰ خدمات کے پیشِ نظر کھاریاں چھاؤنی میں ایک تقریب کے دوران سراہا اور اس سلسلے میں مسٹر بھٹو کو بکتر بند دستوں کے کرنل ان چیف کا اعزاز دیا۔ لیفٹیننٹ جنرل جیلانی اس وقت انٹر

www.bhutto.org

سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر تھے، جب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا تھا اور ان ہی کی سفارش پر مسٹر بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا۔ اس وقت جنرل جیلانی، بھٹو کے قریبی جرنیلوں میں گنے جاتے تھے۔

3 مارچ 1976ء کو پاکستان میں پہلی بین الاقوامی سیرت کانگریس ہوئی۔ دنیا بھر کے 43 علماء اور دانشور اس کانگریس میں شریک ہوئے۔ وزیر اعظم پاکستان نے سیرت کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں ایک فکر انگیز تقریر کی جس میں اسلام کے وحدانیت کے نظریے اور حضور اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ پر خیالات کا اظہار کیا۔ مسٹر بھٹو کی یہ تقریر ان کی علمی اور اسلام کے گہرے مطالعے کا واضح ثبوت ہے۔ مسٹر بھٹو نے سیرت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اس کانفرنس سے تمام قوموں میں جو انسانی برابری اور عالمگیر اتحاد پر یقین رکھتی ہیں، مذہبی سطح پر بامقصد تعاون کا نیا دور شروع ہوگا اور بنی نوع انسان کے درمیان مساوات اور اتحاد کو فروغ ہوگا۔''

عوامی حکومت نے زرعی اصلاحات کو بھی کافی حد تک مؤثر بنانے کی کوشش کی۔ فیڈرل لینڈ کمیشن کے چیئرمین شیخ رشید نے پارٹی کے منشور کے مطابق بلا لحاظ زرعی زمینوں کو قومی تحویل میں لیا جن میں پی پی پی کے اراکین اسمبلی اور حکومت کے وزراء کی زمینیں بھی شامل ہیں۔ حکومت میں موجود کئی جاگیرداروں نے مسٹر بھٹو کو اس کی شکایت کی کہ ہماری زمینیں کیوں قومی تحویل میں لی گئی ہیں جبکہ وزیر اعظم بھٹو نے ان جاگیرداروں کی شکایات کو مسترد کر دیا اور زرعی اصلاحات کے سلسلے میں انہوں نے شیخ رشید پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا۔ بھٹو حکومت نے 5 مرلے کے پلاٹوں کی تقسیم کے تحت ہزاروں خاندانوں کی رہائش کا مسئلہ بھی حل کیا۔ کچی آبادیوں کے مکینوں کو مالکانہ حقوق دیئے گئے۔ ٹیکسلا میں چین کے تعاون سے ہیوی مکینیکل کمپلیکس کا قیام عمل میں آیا۔ کامرہ کا ایرو نائیکل انجینئرنگ کا قیام پاکستان کی ترقی میں اہم سنگِ میل ہے۔ عوامی دورِ حکومت میں کھاد، سیمنٹ اور چینی کے کارخانے بھی قائم ہوئے۔ مسلح افواج کے لیے جدید اسلحہ اور ان کی سہولیات فراہم کی گئیں۔ شراب، جوئے اور ریس پر پابندی اور جمعہ کے روز چھٹی کا فیصلہ بھی بھٹو کے دور حکومت میں ہوا۔ نئے میڈیکل کالجز اور یونیورسٹیاں بھٹو کے 5 سالہ دور میں جس تیزی کے ساتھ قائم ہوئیں ہم ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافے کو بھی بھلایا نہیں

www.bhutto.org

جاسکتا اور عوامی حکومت نے اعلان کیا کہ پاسپورٹ کا حصول ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ سات دن کے اندر اندر پاسپورٹ بننے طریقۂ کار طے کیا گیا جس کے تحت لاکھوں بے روزگار اور غریب لوگ مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک میں نوکریاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بھٹو حکومت کے اس اقدام نے ملکی معیشت پر جو انقلابی تبدیلی کی اس کے اثرات آج تک قائم ہیں۔ ہمارے زرِ مبادلہ کا بڑا ذریعہ یہ تارکینِ وطن ہیں جو بھٹو حکومت کے اس اقدام کے بعد بیرونِ ملک روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ملک میں تیل کے وسیع ذخائر کی دریافت کا کارنامہ بھی مسٹر بھٹو کی خصوصی دلچسپی کے پیشِ نظر ہوا۔ ڈھوڈک اور توت کے کنوئیں اس سلسلے کی کڑی ہیں۔

دیہی علاقوں میں صحت کے مراکز اور پرائمری سکول قائم کیے گئے۔ ملک میں موٹر سازی اور ٹریکٹر سازی کی گئی۔ عوامی دورِ حکومت نے ساڑھے پانچ سال میں قوم کی ترقی کے لیے اتنے منصوبے تشکیل دیے جس کے اثرات ابھی تک برآمد ہو رہے ہیں۔ بھٹو حکومت کے دوران پاکستان تیسری دنیا کا پہلا ملک ہے، جہاں پر غربت میں اضافے کی بجائے کمی واقع ہوئی۔

7 جنوری 1977ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے ملک میں عام انتخابات کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ شیڈول کے مطابق 7 مارچ کو قومی اسمبلی اور 10 مارچ کو صوبائی اسمبلی کے لیے ووٹ ڈالنے کا دن مقرر کیا گیا۔

قومی اسمبلی کی حلقہ بندیاں:

صوبہ پنجاب سے قومی اسمبلی کی نشستیں	115
صوبہ سندھ سے قومی اسمبلی کی نشستیں	43
صوبہ سرحد سے قومی اسمبلی کی نشستیں	26
صوبہ بلوچستان سے قومی اسمبلی کی نشستیں	07
قبائلی علاقوں سے قومی اسمبلی کی نشستیں	08
اقلیتوں کے لیے قومی اسمبلی کی نشستیں	06
وفاقی صدر مقام سے قومی اسمبلی کی نشست	01

یوں پاکستان میں ایک منتخب جمہوری حکومت نے پہلی مرتبہ عام انتخابات کا اعلان کیا تھا۔ اگر وزیرِ اعظم بھٹو چاہتے تو الیکشن کو تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد کروا سکتے تھے لیکن انہوں نے

www.bhutto.org

جمہوری روایات کو فروغ دینے کے لیے ایسا کیا گیا کہ انتخابات کو التوا میں نہ ڈالا جائے مسٹر بھٹو کا بروقت الیکشن کروانا مسٹر بھٹو کے جمہوری ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ 9 جنوری کو صدر پاکستان فضل الٰہی چوہدری نے اعلان کیا کہ دس جنوری کو قومی اسمبلی توڑ دی جائے گی۔

اس وقت ملک میں سیاسی جماعتوں کی کیفیت یہ تھی کہ قیوم لیگ کا سرحد میں اثر و رسوخ کم ہو گیا تھا کیونکہ قیوم لیگ نے پیپلز پارٹی کے ساتھ حکومت میں شراکت کی اور اس کے سربراہ قیوم خان، بھٹو حکومت کے وزیر داخلہ رہے اور حیات محمد خان شیر پاؤ کی شہادت نے سرحد میں پی پی پی کی مقبولیت میں اضافہ کیا نیپ کی تخریبی کارروائیوں کی بدولت سرحد میں پوزیشن کافی کمزور ہوئی۔ مسٹر بھٹو سرحد کے ایسے علاقوں میں گئے جہاں پر آج تک علاقے کا تحصیلدار بھی نہ گیا تھا۔ ان واقعات نے بھی پختون عوام کے دلوں میں پی پی پی کے متعلق بڑا اچھا جذبہ پیدا کیا۔ ترقیاتی منصوبے بھی پی پی پی کی مقبولیت کا سبب بنے۔ اپوزیشن جماعتوں نے انتخابی اتحاد کا فیصلہ کیا اور اس طرح مختلف نظریات کی جماعتیں ایک انتخابی اتحاد کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ اس انتخابی اتحاد میں مندرجہ ذیل جماعتیں شامل تھیں:

1. مسلم لیگ
2. جماعتِ اسلامی
3. جمعیتِ علمائے اسلام
4. جمعیتِ علمائے پاکستان
5. نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی
6. پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی
7. تحریکِ استقلال
8. تحریک خاکسار
9. جموں و کشمیر مسلم کانفرنس

انتخابی اتحاد کا نام "پاکستان نیشنل الائنس" پی این اے قرار پایا۔ انہوں نے بھٹو دشمنی اور بھٹو حکومت کا خاتمہ اپنا مقصد قرار دیا۔

قومی اسمبلی کی دو سو نشستوں کے لیے کل 1199 امیدواروں نے کاغذاتِ نامزدگی جمع

کروائے۔ پاکستان قومی اتحاد کو مشترکہ انتخابی نشان دینا بھی حکومت کی فراخدلی ہے وگرنہ قانون میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔ قومی اتحاد کو مشترکہ انتخابی نشان مسٹر بھٹو کی ذاتی مداخلت پر ملا۔ انتخابی مقابلہ پی پی پی اور پاکستان قومی اتحاد کے درمیان ہی تھا۔ کوئی تیسری سیاسی قوت میدان میں نہ تھی۔ پاکستان قومی اتحاد مختلف شخصیات اور نظریات کا ایک ملغوبہ تھا جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے پاس ایک ترقی پسند منشور اور ساڑھے پانچ سالوں کی کارکردگی اور پھر مسٹر بھٹو کی کرشمہ ساز قیادت تھی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی اس الیکشن میں بھی یہ پوزیشن تھی کہ وہ جس شخص کو بھی ٹکٹ دیتی تو وہ جیت جاتا۔ لیکن اب پیپلز پارٹی پر جاگیرداروں نے مکمل طور پر قبضہ کرلیا تھا۔ جاگیرداروں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں آ کر پناہ لی تھی اور زرعی اصلاحات کو سبوتاژ کیا تھا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے جاگیرداروں کو الیکشن میں ٹکٹ دیئے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جاگیردار ''لاکھوں حامیوں'' سمیت پی پی پی میں شمولیت کا اعلان کر کے پارٹی میں ''اچھے مقام'' پر فائز ہو جاتا۔ یہ سب جاگیردار اپنے ''حامیوں'' سمیت پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر یہ تاثر دیتے کہ ہم نے پارٹی کو مضبوط کر دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ 1970ء کے الیکشن میں یہی جاگیردار بری طرح ہارے تھے اور ان جاگیرداروں کے مزارعین نے ان جاگیرداروں کے خلاف تلوار کو ووٹ ڈالا تھا۔ پارٹی میں جاگیرداروں کو شامل کر کے پارٹی کو تباہ کیا گیا۔ پارٹی کا ڈھانچہ تو بڑا خوبصورت اور منظم نظر آنے لگا جس پر نون، ٹوانے، ٹمن، ملک، قریشی، مخدوم، خان، پیر، میاں اور اعوان نظر آتے تھے مگر پارٹی مخلص اور ہر قسم کی مصیبت کا مقابلہ کرنے والی قیادت سے محروم ہو گئی۔ پارٹی میں موقع پرست جاگیرداروں کا اثر ورسوخ بڑھ گیا، جو خوبصورت کوٹھیوں، کاروں اور محلات میں رہتے تھے۔ جہاں پر مخلص کارکنوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ بیوروکریسی نے جاگیرداروں کی پشت پناہی کی اور مسٹر بھٹو کو بڑے بڑے بیوروکریٹس پارٹی سے متعلق مشورے دینے لگے۔ یہ جاگیردار پارٹی کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اور اپنے مفادات کے لیے اور پارٹی کے منشور کو رکوانے کے لیے پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ 1970ء کے الیکشن میں ان کو یہ یقین تھا کہ پی پی پی الیکشن جیتنے کی اہل نہیں چونکہ اس میں نچلے اور درمیانے طبقے کے لوگ ہیں اور ہماری عدم موجودگی میں بھلا کون جیتتا ہے بلکہ ان جاگیرداروں نے کھل کر پی پی پی کی مخالفت کی جبکہ 1970ء کے الیکشن میں موروثی انتخابی نشستیں رکھنے والے جاگیردار بھی شکست کھا گئے۔ ان جاگیرداروں کا پارٹی میں شامل ہونا جہاں پی پی پی

کے لیے نقصان دہ تھا وہاں پر بھٹو کی ذات کے لیے بھی مصیبت کا سبب تھا۔ اگر مسٹر بھٹو کسی بحران سے دوچار ہوتے تو ان جاگیرداروں نے کسی طرح بھی بھٹو کو بحران سے بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ چونکہ وہ بھٹو کو اپنا دشمنِ اول تصور کرتے ہیں جس نے پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ بھٹو کے گرد جاگیرداروں اور بیوروکریسی کا گھیرا تھا اور بھٹو کے خلاف غیر ملکی سازش بھی کارفرما تھی جس کا اظہار بھٹو بار بار کر رہے تھے۔ کیا کسی غیر ملکی سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ٹیم کارآمد ثابت ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں!

پی۔ این۔ اے کی امریکہ نے بھرپور حمایت کی۔ اندرونِ ملک سرمایہ داروں نے پی۔ این۔ اے کو بہت مدد دی کیونکہ سرمایہ دار بھٹو حکومت کی اصلاحات کا نشانہ بنے تھے۔ پی۔ این۔ اے نے انتخابی مہم کے دوران بھٹو کی کردار کشی کی۔ مسٹر بھٹو کو انڈیا کا شہری تک ٹھہرایا گیا۔ بھٹو کو ایک اخلاقی مجرم کے روپ میں پیش کیا اور یہ ظاہر کیا کہ بھٹو پی این اے سے خوف زدہ ہے اور وہ 8 مارچ کو ملک چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ اصغر خان نے اپنی تقاریر کے دوران بھٹو کو پھانسی پر لٹکانے کا بار بار اعلان کیا اور پی۔ این۔ اے نے اپنی انتخابی مہم کے دوران 1970ء کی قیمتیں واپس لانے کا وعدہ کیا۔ تاجر طبقے کو خوش کرنے کے لیے کہا کہ ہم انکم ٹیکس کا محکمہ ہی ختم کر دیں گے اور زکوٰۃ کا نظام نافذ کریں گے جس سے دکاندار طبقہ بے حد متاثر ہوا۔ دکانداروں کو ساتھ ملانے کا پی۔ این۔ اے کو یہ فائدہ ہوا کہ بازاروں میں پی۔ این۔ اے اپنی طاقت دکھانے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ پی۔ این۔ اے کی ہر اپیل پر لبیک کہتے۔ اس سے یہ تأثر ملتا کہ عوام۔ پی۔ این۔ اے کے ساتھ ہیں۔ پیپلز پارٹی کو بڑے شہروں سے زیادہ چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں مکمل حمایت حاصل تھی۔ پی۔ این۔ اے نے اپنی انتخابی مہم کے دوران بھٹو اور ان کے دورِ حکومت کو ایک فحش اور بے حیائی کا دور ٹھہرایا اور کہا کہ بھٹو دورِ حکومت میں عورت کی عزت محفوظ نہیں رہی اور عورت گھر سے نکلتے وقت اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ حالانکہ اس حقیقت کو خود اپوزیشن نے تسلیم کیا کہ خواتین کی اکثریت پی پی پی کی حامی ہے تو پھر یہ کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ بھٹو دورِ حکومت میں عورت کو سڑک پر تحفظ نہ تھا؟

قومی اتحاد نے اپنی فتح کو اسلام کی فتح اور حکومت کی شکست کو کفر کی شکست قرار

www.bhutto.org

دیا۔ پی۔ این۔ اے والے اپنی انتخابی مہم کو رنگین بنانے کے لیے ڈھاکہ کے بھگوڑے جرنیل نیازی (جس کی وردی سے ہندوستانی فوج نے اس کے تمغے اتارے تھے) کو لے آئے۔ مسٹر بھٹو کے خلاف یہ بھی پراپیگنڈا کیا گیا کہ بھٹو نے ملک توڑا ہے اور اسی لیے بھٹو حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ شائع کرنے سے اجتناب برت رہے ہیں۔ پی این اے کی قیادت نے سٹیج پر ہمیشہ گندی زبان استعمال کی۔ گالی گلوچ کے سوا ان کے پاس سیاسی مخالفت کے لیے کوئی مواد موجود نہ تھا۔

عوام نے بھرپور طریقے سے انتخابی مہم میں شرکت کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام ملک میں جمہوری عمل کو پسند کرتے ہیں۔ آج تک مسٹر بھٹو کے جلسے تو لاکھوں میں ہوتے ہی تھے لیکن اپوزیشن کے جلسے کامیاب نہ ہوتے تھے لیکن جب اپوزیشن نے اپنے جلسوں میں لوگوں کی زیادہ تعداد کو دیکھا تو وہ اس پر بڑے پھولے اور انہوں نے کہا کہ عوام نے ہمارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ اب بس رسمی طور پر 7 مارچ کو ووٹ ڈالنے ہیں۔ اب صرف انتقالِ اقتدار کا مرحلہ پیچھے رہ گیا ہے۔ حالانکہ بھٹو کے جلسوں میں پی این اے سے بھی زیادہ لوگوں نے شرکت کی تھی۔ جمہوری سیاست میں انتخابی جلسوں میں عوام کی شرکت کبھی انتخابی نتائج کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتی بلکہ جمہوری ملکوں میں جہاں پر الیکشن کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ وہاں پر عوام ہر کسی کا نقطۂ نظر سننے کے لیے جلسوں میں جاتے ہیں۔ اصل نتائج بیلٹ بکس ہی برآمد کرتے ہیں۔

مسٹر بھٹو نے اس انتخابی مہم میں بھی بالکل اسی طرح سرگرمی دکھلائی جس طرح ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد کے دوران قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو نے ایک دن میں تیس تیس جلسوں سے خطاب کیا۔ مسٹر بھٹو جس شہر یا قصبے میں بھی گئے عوام نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ عوام نے بھٹو کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ مسٹر بھٹو چاروں صوبوں کے تمام شہروں میں عوام سے ووٹ لینے کے لیے گئے تھے۔

7 مارچ کو جب انتخابی نتائج آنے شروع ہوئے تو اس نے یہ ظاہر کر دیا کہ پاکستان کے عوام نے ایک مرتبہ پھر قائدعوام ذوالفقار علی بھٹو کو اپنا متفقہ قائد تسلیم کر لیا ہے۔ مسٹر بھٹو کی فتح کی وجوہات میں سرفہرست عوامی حکومت کی اصلاحات اور بھٹو کا تیسری دنیا کے راہنما کے طور پر قائدانہ کردار شامل ہیں۔

www.bhutto.org

مارچ 1977ء کی نو منتخب قومی اسمبلی میں پارٹی پوزیشن

	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان
پاکستان پیپلز پارٹی	107	32	7	7
قومی اتحاد	8	11	15	–
قیوم لیگ	–	–	1	–

8 آزاد امیدوار وفاقی قبائلی علاقوں سے منتخب ہوئے۔

پنجاب سے ایک آزاد امیدوار کامیاب ہوا۔ بلوچستان میں پی این اے نے وہاں پر فوجی مداخلت کے سبب الیکشن کا بائیکاٹ کیا۔ صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) میں پی این اے نے 15 سیٹیں لے کر پی پی پی کو شکست دی۔ سندھ اور پنجاب پہلے بھی پی پی پی کو وفاق کی بڑی جماعت بنانے کا سبب بنے تھے۔

جنوری 1977ء کو توڑی جانے والی اسمبلی میں مختلف جماعتوں کی پوزیشن درج ذیل تھی:

پاکستان پیپلز پارٹی	109
پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ)	8
پاکستان مسلم لیگ کونسل	6
جماعتِ اسلامی	3
جمعیت علمائے اسلام	2
جمعیت علمائے پاکستان	6
آزاد	20

توڑی جانے والی اسمبلی میں بھی پی پی پی کو بہت بڑی اکثریت حاصل تھی۔ اپوزیشن کی توڑی جانے والی اسمبلی میں آزاد اراکین سمیت 33 سیٹیں تھیں جبکہ نئی اسمبلی میں سیٹیں بڑھائی بھی گئی تھیں۔ یہ انتخابی نتائج غیر متوقع نہیں تھے۔ پی پی پی سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) اور کراچی میں شکست سے دوچار ہوئی تھی۔ یہاں پر پارٹی کے بڑے بڑے راہنماؤں کو پی این اے نے ہرا دیا لیکن اپوزیشن نے ان نتائج کو قبول کرنے سے مکمل انکار کر دیا اور کہا کہ الیکشن میں وسیع پیمانے پر

www.bhutto.org

دھاندلی ہوئی ہے۔ پی این اے نے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

دراصل یہ سب کچھ ایک گہری سازش کے تحت کیا گیا۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ملک میں جمہوریت کے خاتمے کے لیے امریکہ نے ایک سازش تیار کی تھی اور اس طرح پاکستان کو بحران میں دھکیل کر پاکستان میں اپنا اثر ورسوخ قائم کیا گیا جس سے امریکہ اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پی این اے نے انتخابی مہم کے دوران تشدد کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ کراچی میں پی این اے کے کارکنوں نے ووٹروں کو ووٹ ڈالنے سے روکنے کے لیے اسلحہ کا استعمال بھی کیا۔ الیکشن میں پی این اے کے تشدد کے سبب ملک میں چار اموات واقع ہوئیں۔ تشدد کی اس مہم میں پی این اے میں شامل جماعتِ اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیتِ طلبا نے اہم کردار ادا کیا۔

پی این اے کی طرف سے دھاندلی کی ایک مثال ماڈل ٹاؤن کے ایک پولنگ سٹیشن کے واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک وکیل صاحب پولنگ بوتھ پر ووٹ ڈالنے آئے تو انہوں نے زمین پر گری ہوئی شیشی سے سیاہی اپنی انگلی پر لگائی اور پریزائڈنگ آفیسر کو اپنی طرف متوجہ کر کے فوراً اس پر ہاتھ مسل کر کہا کہ یہ سیاہی مٹ جاتی ہے۔ لہٰذا حکومت نے دھاندلی کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ آپ میری شکایت نوٹ کریں۔ پریزائڈنگ آفیسر نے کہا کہ درخواست دو تو اس نے فوراً جیب سے درخواست نکالی جو چھپی ہوئی تھی اور اس پر سائن کر دیئے۔ چھپی ہوئی درخواست نے پریزائڈنگ آفیسر کو شک میں ڈال دیا۔ اس نے دوسرے ساتھی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ سیاہی خشک ہونے پر مٹ نہیں سکتی جبکہ اس ووٹر نے چابک دستی سے ہاتھ مسل کر سیاہی مٹائی ہے اور ایک ووٹر جب ووٹ ڈالتا ہے تو اس کو اتنا وقت لگتا ہے کہ وہ سیاہی خشک ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ شخص جس نے چھپی ہوئی درخواست اپنی جیب میں ڈالی ہوئی ہے یقیناً یہ منصوبہ بندی کے تحت کارروائی ہے۔ دوبارہ سیاہی لگا کر خشک ہونے پر وہ سیاہی مٹائی گئی تو وہ نہ مٹی۔ اس پر پریزائڈنگ آفیسر نے درخواست کے پچھلی جانب اس وکیل ووٹر (جو پی این اے کا حامی تھا) کا بیان لیا اور متعلقہ حکام کو بھجوا دیا گیا، جو ریکارڈ پر موجود ہے۔ یقیناً یہ چھپی ہوئی درخواست ہزاروں کی تعداد میں ہو گی جو پی این اے نے اپنے کارکنوں کو دی ہوئی تھیں اور یہ سب کچھ منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا تھا۔

www.bhutto.org

دھاندلی کے واقعات کی شکایات دنیا کے ہر ملک میں ملتی ہیں جن کا ازالہ بھی جمہوری طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جہاں قومی اتحاد کو دھاندلی کی شکایات تھیں وہاں پی پی پی کے بھی کئی امیدواروں نے پی این اے کی طرف سے طاقت کے بل بوتے پر دھاندلی کے الزامات لگائے۔ حکومت نے الیکشن کمیشن کو خاص طور پر ہدایت بھی کی کہ الیکشن میں بدعنوانی کی درخواستوں کا فیصلہ چھ ماہ کے اندر اندر سنا دیا جائے۔ دھاندلی کے واقعات انفرادی تھے اور مسٹر بھٹو نے ان کی شدید مذمت بھی کی۔

عام انتخابات کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے 12 مارچ کو نشری تقریر کے دوران اس بات پر زور دیا کہ "قومی اسمبلی کے الیکشن کے سوا قومی اتحاد کے ساتھ ہر امور پر بات چیت ہو سکتی ہے۔ پی این اے والے غریبوں کے بچے مروانا چاہتے ہیں۔ ان نام نہاد لیڈروں کو گزند بھی نہ پہنچے گی۔" درحقیقت مسٹر بھٹو نے صوبائی اسمبلیوں کے دوبارہ الیکشن کو تسلیم کر لیا تھا اور اس طرح مسٹر بھٹو نے اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ مسٹر بھٹو نے اپوزیشن کو مذاکرات کی دعوت دے کر پر امن طریقے سے بحران کا حل نکالنے کی کوشش کی جس کو اپوزیشن نے مسترد کر دیا اور ملک گیر تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ تحریک چلانے کے لیے پی این اے کی طرف سے جو مطالبے کیے گئے وہ یہ تھے کہ:

1. مسٹر بھٹو مستعفی ہو جائیں۔
2. الیکشن کمیشن توڑ دیا جائے۔
3. دوبارہ غیر جانبدارانہ و منصفانہ الیکشن کروائے جائیں۔

لیکن بعد میں ہنگاموں میں شدت پیدا کرنے کے لیے "تحریکِ نظامِ مصطفیٰ" کا لیبل لگایا گیا۔ مذہب کا ہتھیار استعمال کیا گیا۔ لوگوں کے جذبات سے کھیلا گیا۔ اس تحریک کو کفر و اسلام کا مقابلہ قرار دیا گیا اور ملک میں یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی کہ ہم خلافتِ راشدہ جیسا فلاحی معاشرہ قائم کریں گے۔ حالانکہ اسی اتحاد میں این ڈی پی اور تحریکِ استقلال جیسی بائیں بازو اور سیکولر جماعتیں تھیں۔ اپوزیشن نے مذہب کی بنیاد پر سیاست کرنے کی ٹھان لی۔ مساجد کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح جیسے 1947ء میں قائدِ اعظم اور پاکستان کی مخالفت کے لیے ملاؤں نے مساجد کو استعمال کیا تھا۔ مسٹر بھٹو نے اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات کو

اپنی انا کا مسئلہ نہ بنایا اور پر امن ماحول قائم کرنے کی کوشش کے سلسلے میں مسٹر بھٹو نے قومی اتحاد کے سربراہ مفتی محمود صاحب کو ایک خط لکھا جس میں غیر مشروط طور پر مذاکرات کی دعوت دی۔

28 مارچ 1977ء کو قومی اسمبلی نے مسٹر بھٹو کو دوبارہ ملک کا وزیرِ اعظم منتخب کرلیا۔ اور 30 مارچ کو بائیس ارکان پر مشتمل وفاقی کابینہ کا اعلان کر دیا۔ اس دوران ملک کے بڑے شہروں میں قومی اتحاد کی طرف سے ہنگامے زور پکڑتے گئے۔ ان میں حیدر آباد، کراچی، ملتان اور لاہور قابلِ ذکر ہیں جہاں پر شدید ہنگامے ہوئے۔ 9 اپریل کو لاہور میں جب مظاہرین اور پولیس کے درمیان مقابلہ ہوا تو کئی جانوں کا نقصان ہوا۔ 9 اپریل کے واقعات نے پی این اے کی تحریک کو تقویت پہنچائی، پارٹی میں شامل کچھ لوگوں نے مسٹر بھٹو پر زور ڈالا کہ ہم پی این اے کا مقابلہ سڑکوں پر عوامی مظاہرے کر کے کریں۔ اس طرح ہم پی این اے کے ہنگاموں کو ختم کر سکتے ہیں لیکن مسٹر بھٹو نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ پی این اے کے جلوسوں میں اسلحہ کا کھلا استعمال کیا گیا۔ بنکوں، سینماؤں اور پی پی پی کے حامی لوگوں کی املاک کو جلایا گیا۔ متعدد جگہوں پر ایسا ہوا کہ پی این اے کے جلوسوں نے پی پی پی کے حامی اراکین کے گھروں پر حملہ کیا تو نہ صرف ان کے مکانوں کو جلایا گیا بلکہ گھروں میں موجود خواتین کو برہنہ بھی کیا گیا۔

نظامِ مصطفیٰؐ کے علمبرداروں کی طرف سے ایسے واقعات ان کی ''اسلام دوستی'' کا پول کھولتے ہیں۔ جب پی این اے والے پی پی پی کے حامی لوگوں پر حملہ آور ہوئے تو انہوں نے قرآن پاک ہاتھ میں پکڑ کر واسطے دیے کہ انہیں کچھ نہ کہا جائے لیکن گولی سے مسلمان کا خون بہا۔ قرآن اور انسان زمین پر ایک ساتھ ڈھیر ہو گئے۔ کئی لوگ ان واقعات کے بعد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے جنہوں نے اپنی بیٹیوں اور ماؤں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ''نظامِ مصطفیٰؐ'' کے علم برداروں کے ہاتھوں رسوا ہوتے دیکھا۔

مسٹر بھٹو نے 28 اپریل 1977ء کو سینٹ و قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں اپنی طویل تقریر کے دوران بہت کچھ کہا۔ چند اقتباسات پیشِ نظر ہیں:

> ''12 اپریل کو امریکی سفارت خانہ کے دو افسر ٹیلی فون پر یہ گفتگو کر رہے تھے: پارٹی گئی، پارٹی چلی گئی، وہ آدمی چلا گیا، مال چلا گیا (یعنی مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی کو زوال آ گیا ہے) جناب عالی! پارٹی نہیں گئی اور یہ اس

وقت تک نہیں جائے گی جب تک میرا مشن مکمل نہیں ہو جاتا۔ پاکستان کے عوام میرا مشن مکمل ہوتا دیکھیں گے۔"

"پاکستان میں اس وقت غیر ملکی کرنسی کا سیلاب آیا ہوا ہے اور ماضی میں کرنسی کے ایسے سیلاب کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس حد تک کہ ڈالر کی قیمت سات بلکہ چھ روپے ہوگئی ہے۔ یہ روپیہ کن مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے؟ یہ روپیہ لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے؟ نہ صرف لوگوں میں، یہ روپیہ جلوسوں میں شامل ہونے والوں، اذانیں دینے اور گرفتاریاں پیش کرنے کے لیے بانٹا جا رہا ہے بلکہ گیس میٹر ریڈروں اور ڈاکیوں تک یہ روپیہ تقسیم کیا جا رہا ہے تاکہ گھروں میں جا کر لوگوں کو حکومت سے متنفر کریں۔ ان کے جذبات کو بھڑکائیں اور انہیں جلوسوں میں شامل ہونے کی دعوت دیں۔ اس کے علاوہ اسی روپے سے مزدور انجمنوں کو بھی ترغیب دی جا رہی ہے۔"

"حال ہی میں پہیہ جام کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ وہ اس بین الاقوامی سازش کا حصہ ہے جو ایک ملک پاکستان کے خلاف کر رہا ہے اور جس کے تحت پاکستان کے اندرونی معاملات میں وسیع پیمانے پر مداخلت ہو رہی ہے۔ ماضی میں ایوب خان کو بھی پیش کش کی گئی تھی۔ ان ہی ذرائع نے کہ اگر اس کے خلاف کوئی انقلاب آیا تو وہ ذرائع ایوب خان کو ایسی امداد دیں گے جن سے جوابی انقلاب برپا کیا جا سکے۔"

ایوب خان کو اس سلسلے میں ایک منصوبہ پیش کیا گیا تھا جس کا نام کوڈ لفظوں میں "آپریشن پہیہ جام" رکھا گیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت ایوب خان کو تربیت یافتہ ماہرین کی خدمات مہیا کی جاتیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ریلوے، پی آئی اے اور اس طرح کے دوسرے اداروں سے دو ہزار افراد کو تخریب کاری کی تربیت دی جانی تھی۔ پہیہ جام بیرونی خیالات ہیں، ہمارے ملک میں ایسی باتیں نہیں ہو سکتیں۔"

"پاکستان کے خلاف بین الاقوامی سازش کا مقصد ملکی سالمیت کو تباہ کرنا

www.bhutto.org

ہے۔ یہ ملک اسی مقصد کے لیے پاکستان میں روپے کا سیلاب بھیج رہا ہے۔ میں اس ملک کا نام نہیں لینا چاہتا۔ پاکستان کے عوام کو معلوم ہے کہ ہاتھی ایک کینہ پرور جانور ہے اور دنیا میں ایک ایسا ہاتھی بھی ہے جو جنگِ ویت نام کے دوران پاکستان کی ویت نام کے لیے حمایت کو فراموش نہیں کرسکتا۔ حالانکہ ہمارا مؤقف صاف اور واضح تھا۔ ہم نے کسی ایسے ملک کی حمایت نہیں کی جو غلطی پر ہو۔ ہم نے مظلوم قوموں کی حمایت کا عزم کر رکھا ہے۔"

"پاکستان اس وقت جس صورتِ حال سے دوچار ہے۔ وہ ایک بہت بڑی بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہے جو ایک ملک نے پاکستان کے خلاف کی ہے لیکن میں اس سازش سے خوفزدہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی مجھے بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ میں اس قسم کی سازشوں کو ناکام بنانے کی جدوجہد کرتا رہوں گا۔ میں ماضی میں غیر ملکی سازشوں سے عہدہ برآ ہوتا آیا ہوں اور آئندہ بھی ان کے خلاف جدوجہد کرتا رہوں گا۔ وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے میں نے جنگِ ویت نام کے بارے میں جو کردار ادا کیا تھا۔ چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے میں جو جدوجہد کی تھی، 1973ء میں جنگِ رمضان کے موقع پر میں نے اسرائیلی جارحیت کے خلاف عربوں کو جو اخلاقی، مادی اور فوجی امداد دی تھی اور تیسری دنیا کے سربراہوں کی کانفرنس کی جو تجویز پیش کی ہے، ہاتھی انہیں بھی نہیں بھول سکتا۔ ہاتھی نے پاکستان میں دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس کو بھی ناپسند کیا تھا۔ ترکی، یونان اور کوریا کے مسائل کے حل کے لیے پاکستان سے جو اپیلیں کی گئی تھیں، ہاتھی نے اس پر بھی غصہ کیا تھا۔ پاکستان اور فرانس کے مابین ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے معاہدے کی راہ میں بھی روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔ چونکہ میں نے اس سلسلے میں دباؤ کا مقابلہ کیا ہے اس لیے اسے میرا جرم سمجھا گیا۔"

"شکاری کتے میری جان کے درپے ہیں۔ لیکن میرا پاکستان کے بارے

www.bhutto.org

میں ایک تصور ہے، ایک خواب ہے، ایک مشن ہے جسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ سرمایہ داری، جاگیرداری کی کمر توڑنے، مزدوروں، کسانوں اور خواتین کو آزادی دلانے کے علاوہ ابھی دو تین اہم کام کرنا باقی ہیں۔"

مسٹر بھٹو کی یہ تاریخی تقریر ان کے خلاف بین الاقوامی سازش کی ایک ایسی گواہی ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ مسٹر بھٹو کی حکومت سمیت ان کے خاتمے کا خواہاں تھا تا کہ ان مقاصد کو روکا جا سکے جن کے لیے مسٹر بھٹو کوشاں ہیں۔ امریکہ کے سامراجی عزائم کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ تقریر بہت بڑا حوالہ ہے۔

30 اپریل 1977ء کو قومی اتحاد نے اپنی تحریک کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کے لیے لانگ مارچ کی اپیل کی جس کے تحت ملک بھر سے لوگوں نے اکٹھے ہو کر اسلام آباد جا کر وزیرِ اعظم ہاؤس کو توڑ کر حکومت کا خاتمہ کرنا تھا۔ قومی اتحاد لانگ مارچ اسلام آباد وزیرِ اعظم ہاؤس پہنچنے میں ناکام رہا۔ البتہ وزیرِ اعظم بھٹو اس دن راولپنڈی کی گلیوں میں کھلی جیپ میں سوار ہو کر عوام میں آ گئے اور انہوں نے عوام کو وہ خط دکھایا جو امریکی وزیرِ خارجہ سائرس وانس نے بھیجا تھا جس میں مسٹر بھٹو کو پیش کش کی گئی تھی کہ ہمارے ساتھ سودے بازی کر لو۔ مسٹر بھٹو نے امریکی عزائم کو عوام میں فاش کر کے ثابت کر دکھایا کہ امریکہ تیسری دنیا کی ہر اس قوم کا دشمن ہے جو اپنی خوشحالی و ترقی کے لیے سامراج کو دیس سے نکالنا چاہتی ہے۔ امریکہ یقیناً مسٹر بھٹو کے اس جرأت مندانہ رویے پر پریشان ہوا ہوگا۔ پی این اے کی تحریک کے پیچھے بیرونی قوت کی حقیقت بھی عوام کے سامنے بے نقاب ہو چکی تھی جس کے متعلق خود پی این اے والے یہ کہتے تھے کہ بیرونی مداخلت بھی ہو سکتی ہے۔ نظامِ مصطفےٰؐ کے نام پر چلنے والی یہ تحریک حقیقت میں امریکی سامراج کی تحریک تھی۔ جو پاکستان کے عوام کے جذبات سے کھیل کر ملک میں جمہوریت کا خاتمہ اور اسلامی دنیا کے اتحاد کو غیر مؤثر کرنا چاہتا تھا۔ امریکی سامراج نے اس مقصد کے لیے مُلّا، سرمایہ دار اور جاگیردار سمیت سول و ملٹری بیوروکریسی کو استعمال کیا۔ جلوسوں میں فوج کے تربیت یافتہ کمانڈوز شامل ہوئے جن کو آگ لگانے اور توڑ پھوڑ کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔

مارچ سے جولائی تک قومی اتحاد کی تحریک آہستہ آہستہ دم توڑتی چلی گئی۔ عرب ممالک خصوصاً لیبیا، سعودی عرب اور شام نے مذاکرات کے لیے ماحول تیار کیا۔ کویت کے وزیرِ

خارجہ شیخ صباح الاحمد ابی برالصباح سیاسی بحران کے حل کے لیے پاکستان تشریف بھی لائے۔
تنظیم آزادیٔ فلسطین کے راہنما یاسر عرفات نے وزیر اعظم بھٹو اور اپوزیشن میں تصفیہ کروانے کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔

لہٰذا قومی اتحاد نے 2 مئی کو سیاسی تصفیے کی خاطر حکومت سے مذاکرات کا فیصلہ کیا۔ سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب نے دونوں گروپوں کے مابین ایک ثالث کا کردار ادا کیا۔ 3 جون کو حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات کا پہلا دور اڑھائی گھنٹے جاری رہا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اخبارات پر سنسر شپ کی پابندی ختم کی جائے اور ان تمام گرفتار سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے جو دفعہ 144 کی خلاف ورزی میں گرفتار ہوئے ہیں۔ 6 جون کو مذاکرات کا دوسرا دور شروع ہوا اور 7 جون کو مذاکرات کا تیسرا دور ہوا جس میں سرکاری فارمولے کو متفقہ طور پر قبول کیا گیا اور یہ طے پایا کہ انتخابات اسی سال یعنی اکتوبر 1977ء کو ہوں گے۔ جون کے ماہ میں حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات کے مختلف ادوار ہوئے اور یوں مذاکرات اپنی کامیابی کی منزل پر پہنچ گئے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں 15 جولائی کو توڑنے کا فیصلہ ہوا۔ جب مذاکرات کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ الیکشن دوبارہ اکتوبر میں ہوں گے تو عوام نے اپنے اپنے مکانوں پر قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے جھنڈے لہرا کر اس بات کا اظہار کیا کہ انتخابی مہم کا آغاز ہو چکا ہے۔
تمام اختلافات کے حل کے بعد حکومت اور اپوزیشن ایک فارمولے پر پہنچ چکے تھے۔ 2 جولائی کے بعد صرف معاہدے کے مسودے پر دستخط ہونے ہی باقی تھے۔ البتہ اصغر خان نے مذاکرات کو کامیاب دیکھ کر کچھ اور تبدیلیوں پر زور دیا۔ جو درحقیقت کامیاب ہوتے مذاکرات میں رکاوٹیں ڈالنے کی ایک اہم کوشش تھی تا کہ چھپے ایجنڈے پر عمل درآمد کیا جا سکے۔

5 جولائی کو رات کے اڑھائی بجے جنرل ضیاء نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ٹیلی فون پر آگاہ کیا کہ "آپ کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور اقتدار مسلح افواج نے سنبھال لیا ہے۔ ہم نوے دن کے لیے آئے ہیں دوبارہ الیکشن کروانے کا کام فوج کرے گی اور اگر آپ دوبارہ منتخب ہوئے تو ہم آپ کو سلیوٹ کریں گے۔ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ پارلیمنٹ توڑ دی گئی ہے اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔"

جب کہ اس اثنا میں کور کمانڈر راولپنڈی جنرل فیض علی چشتی جو وزیر اعظم بھٹو پر بار بار

الیکشن کروانے کے لیے زور ڈالتا تھا، کے حکم پر وزیرِ اعظم ہاؤس کے سامنے ٹینک اور فوجی دستے کھڑے تھے تا کہ مقابلہ کی صورت میں لڑا جائے۔ مسٹر بھٹو نے ضیاء سے کہا کہ بچے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گھر آئے ہوئے ہیں، ان سے چند باتیں کرنی ہیں اور کچھ ضروری سامان پیک کرنا ہے، جس کے لیے مجھے کچھ وقت لگے گا۔ مسٹر بھٹو نے کافی بنوا کر پی اور چند لمحوں بعد فوج منتخب عوامی وزیرِ اعظم کے گھر داخل ہو چکی تھی جس نے نوے ہزار شکست خوردہ فوجیوں کو ہندوستان کی قید سے چھڑوایا تھا اور یوں فوج نے تیسری مرتبہ اپنے ملک کو ''فتح'' کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کا لاہور میں ہنری کسنجر کی آمد پر استقبالیے سے خطاب
10 اگست 1976ء

خواتین و حضرات!

ہمارے لیے یہ بات باعثِ مسرت و اعزاز ہے کہ امریکہ کے وزیرِ خارجہ ایک بار پھر ہم سے مذاکرات کے لیے یہاں تشریف لائے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہماری تجویز پر کل صبح لاہور میں ہونے والے مذاکرت حوصلہ افزا ثابت ہوں گے۔

ڈاکٹر کسنجر! میں بڑے دکھ کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شہر لاہور میں سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں اور یہ صرف شہر لاہور ہی پر نہیں منڈلا رہے بلکہ گذشتہ دس بارہ دنوں سے ملک کے بیشتر حصہ پر ان کا سایہ ہے۔ ہم نے بہت سی ہولناک تباہیاں دیکھی ہیں۔ اب ہم ایک انتہائی نازک اور تشویش ناک دور سے گزر رہے ہیں کیونکہ ہمارے دریاؤں میں پانی چڑھا ہوا ہے اور بہت شرارتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہنگامہ خیزی پر اتر آئے ہیں اور ہم ان پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ وادیٔ سندھ کی پانچ ہزار سالہ قدیم تہذیب کسی نہ کسی طور پر انہی دریاؤں کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور ان سے نبرد آزما رہتے گزری ہے۔ ہمیں بعض اوقات ان دریاؤں سے لڑنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ان کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے، بعض اوقات ان کی نازبرداری کے لیے اور دریاؤں سے اس طرح نمٹنے سے ہی ہم نے ڈپلومیسی سیکھی ہے۔ قدرت کے بدلتے تیوروں سے پیش آنے کی طرح ہی ڈپلومیسی میں بدلتے ہوئے حالات سے نمٹنا ہی حکمت ہے۔ اس طرح کے تجربات سے گزرنے والے عوام کے لیے ڈپلومیسی فطری عمل بن جاتی ہے۔ ایسا ان لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا جو دریاؤں کو رام نہیں کرتے، ان سے

www.bhutto.org

جنگ نہیں کرتے۔ان سے وصال نہیں کرتے، اس لیے کل صبح جب آپ ہم سے مذاکرات کریں گے تو ازراہِ مہربانی آپ یاد رکھیں کہ ہماری ڈپلومیسی کل اپنے عروج پر ہوگی کیونکہ اس وقت ہمارے دریا شرارتوں سے بھرپور ہیں اور چونکہ ریڈیارڈ کپلنگ بھی لاہور میں قیام پذیر تھے اور اس وقت ایک مشہور اخبار "دی سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے ایڈیٹر تھے اس کے لیے آپ لاہور کو صرف کپلنگ سے ہی وابستہ نہ کریں، اگرچہ کپلنگ کا برطانوی راج سے بہت واسطہ تھا جس کے بعض نقوش آج بھی ادھر اُدھر آپ کو نظر آئیں گے۔

البتہ ہمارے تمام شہروں میں لاہور ہمارا ایک ثقافتی مرکز ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا محور اور ہماری سرگرمیوں کا منبع بھی رہا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس نے صدیوں قبل اپنا ایک ممتاز مقام بنا لیا تھا۔ اس شہر نے بہت فاتح دیکھے ہیں۔ اس شہر سے ہماری کئی نشاۃ ثانیہ وابستہ ہیں۔ اس شہر کی عظمت ہمارے لیے باعثِ فخر ہے اور حالیہ زمانوں میں جب لاہور پر چڑھائی کی گئی تھی تو اس شہر کے جیالے عوام نے جارحیت کرنے والوں کو بڑی بہادری سے پسپا کر دیا تھا اور اپنی دھرتی کی ایک ایک انچ زمین کے تحفظ کے لیے جواں مردی سے مقابلہ کیا تھا۔ لاہور کئی اعتبار سے ہمارے دل کش اور مسحور احساسات کا گہوارہ ہے۔ یہ باغوں کا شہر ہے۔ یہ قلعوں کا شہر ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ یہ تاریخی مسجدوں کا شہر ہے اور یہاں اسی شہر لاہور میں ایک مغل بادشاہ بھی رہتا تھا جس کا شہزادہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی انارکلی کی محبت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ انارکلی انار کے درخت کے ایک کھلتے ہوئے پھول کی مانند تھی لیکن شہزادے کا باپ اکبر یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا انارکلی سے شادی کرے اور اس نے اسے سزا دینے کی غرض سے زندہ دفنا دیا اور اسی کی قبر کے نزدیک ہمارا اسکرٹریٹ ہے جہاں ہم انتھک محنت کرتے ہیں اور تمام فائلوں کو یہیں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں سے ٹھیک اس کمرے کی دوسری جانب اگلے دروازے کی طرف جہاں ہم مذاکرات کریں گے اس میدان میں دو افراد اپنی غلط مہمات کے باعث دفن ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مغل بادشاہوں نے، بدھ شہنشاہوں نے، جہاں سکھ حکمران رنجیت سنگھ اور بہت سے لوگوں نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ میں ذاتی طور پر بھی اس شہر سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے ہمیشہ اس شہر سے گہری عقیدت رہی ہے اور میں اس شہر کو اس لیے بھی پسند کرتا ہوں کہ میں نے 1970ء میں اس شہر سے انتخاب لڑا تھا۔ میں نے بیک وقت پانچ دوسرے شہروں سے بھی انتخاب لڑا تھا اور میں لاہور میں صرف ایک دن کے لیے آیا تھا اور مجھے فخر ہے کہ میں نے چالیس ہزار ووٹوں سے ایک ایسے شخص کے بیٹے کو شکست دی تھی جس کے والد نے

پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ لہٰذا لاہور کے لوگوں کی مجھ پر بہت نوازشیں اور مہربانیاں رہی ہیں اور میں بھی دل سے ان کا ممنون ہوں۔

اس لیے ہم سوچتے تھے کہ آپ جب پاکستان آتے ہیں تو ہمیشہ اسلام آباد میں آتے ہیں اور صرف ایک بار ہی لاہور آئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ لاہور بھی آئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مسز کسنجر کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ کل صبح اس خوبصورت شہر کے بعض دل کش مقامات کی سیر کر سکیں گی۔ شاید وہ کوشش کریں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہمارے درمیان کوئی تکلف نہیں ہے۔ اگر آپ تھک جائیں تو آپ دوبارہ پھر آ سکتے ہیں۔ پاکستان میں آپ کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جائے گا۔ ڈاکٹر ہنری کسنجر، مسز ہنری کسنجر اور آپ کے خاندان کو ہمارے ملک میں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا خواہ آپ کسی بھی حیثیت سے پاکستان آئیں۔ ہم ہمیشہ ان کا کھلے دل سے خیر مقدم کریں گے کیونکہ ہمارے دل میں ان کے لیے بے حد محبت و عقیدت ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ممتاز شخصیت کے حامل ہیں اور نہ صرف اس لیے کہ ڈاکٹر ہنری کسنجر اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ایک اہم اور نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں جس کے لیے مجھے امید ہے کہ امریکی عوام بھی انہیں بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوں گے بلکہ اس لیے کہ وہ تاریخ پر مکمل گرفت رکھتے ہیں۔ موجودہ واقعات جس اعتبار سے حرکت کر رہے ہیں وہ ان سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ انہیں حکمتِ عملی کا بھی کلی علم ہے۔ وہ اس بارے میں کسی قسم کی غلط پالیسی میں جانا بھی نہیں چاہتے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ واضح سمت کا تعین کرتے ہیں اور عالمی امور اور خارجہ پالیسی میں ان کا ایک منفرد مقام ہے اور جب میں یہ کہتا ہوں تو صرف ڈپلومیسی کی خاطر نہیں کہتا کیونکہ ہمارے دریاؤں نے ہمیں اس قسم کی ڈپلومیسی نہیں سکھائی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میں امریکہ کے بہت سے وزرائے خارجہ سے ملا ہوں۔ میرے دل میں ان سب کے لیے عزت و احترام ہے کیونکہ یہ سب امریکہ کے وزیرِ خارجہ رہے ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک اور عذر نہیں ہے اور میں بلا کسی خوف و خطر یہ کہوں گا کہ ڈاکٹر کسنجر آپ کو میں نے امریکہ کی خارجہ پالیسی میں بہت کہنہ مشق اور منجھا ہوا پایا۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ عالمی امن کی خاطر آپ کی گراں قدر کوششوں کو ہم قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے انمٹ نقش چھوڑے ہیں اور آپ ہمارے دور کی تاریخ کے موجودہ واقعات پر بھی گہرے انمٹ نقش چھوڑیں گے کہ مستقبل کے مؤرخ بھی خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

جناب اس عام رسمی گفتگو سے قطع نظر میں ایک بات کہنا چاہوں گا وہ یہ کہ آپ ایران سے آتے ہیں ایران پاکستان کا ایک قریبی اور برادر ملک ہے۔ آزادی کے وقت ہی سے اس ملک کے ساتھ ہر شعبہ ہائے زندگی میں ہمارے قریبی تعلقات برقرار ہیں۔

آپ کابل سے بھی آرہے ہیں۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ آپ کابل بھی گئے۔ افغانستان بھی پاکستان کا ایک قریبی ہمسایہ ملک ہے اور افغانستان کے ساتھ خوشگوار دوستانہ تعلقات کے قیام کے لیے بھرپور کوششیں کررہے ہیں۔ جب افغانستان کے صدر محمد داؤد ماہ رواں کے دوران پاکستان آئیں گے تو پاکستان خلوصِ دل کے ساتھ دونوں ممالک کے درمیان دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کرے گا۔

آپ نے اپنے دورۂ ایران کے دوران زبردست کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ آپ نے امریکہ اور ایران کے پہلے سے قریبی تعلقات کو مزید خوشگوار خطوط پر استوار کیا ہے اور آپ نے اس خطہ کی سلامتی کے لیے ایران کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ نے اس علاقے میں سلامتی کے لیے ایران کی اہمیت تسلیم کرلی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ بات تسلیم کرلی گئی۔ پاکستان ایران کی سلامتی کو اپنی سلامتی تصور کرتا ہے اور ایران بھی اپنی سلامتی کو پاکستان کی سلامتی سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ چھوٹے موٹے معاملات تو رونما ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اگر کوئی بڑی بات ہوتی تو امریکہ ایران کی سلامتی کو پاکستان کی سلامتی سے علیحدہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ ان کی بہتری ہماری بہتری ہے۔ اگر امریکہ ایران کی سلامتی کو اتنا اہم تصور کرتا ہے تو پاکستان کی سلامتی کے بارے میں اس قسم کے تصور کے بغیر سلامتی کا پورا نظریہ منہدم ہوجائے گا۔ اس حقیقت سے چشم پوشی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ امریکہ کی سلامتی کے انتظامات کے احساس کے پورے نظریہ کی ایک کڑی آزمائش ہوگی۔ پاکستان ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اگر بڑے ممالک کے درمیان مفاہمت ہوسکتی ہے تو چھوٹے ممالک کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا لیکن اس مفاہمت کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی تنازعات طے ہونے چاہئیں۔ بھارت کے ساتھ کشمیر کے بنیادی مسئلے کے علاوہ تمام مسائل طے پاچکے ہیں۔ اس نہایت اہم بنیادی مسئلے کو جموں و کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت کی بنیاد پر حل کیا جانا چاہیے۔ مسئلۂ کشمیر کا کوئی دوسرا حل مناسب اور پائیدار نہیں ہوگا۔ بنیادی تنازعات پر سودے بازی سے زبردست پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بنیادی معاملات پر اس قسم کی سودے بازی کی کوشش کرنے والے فریب کا شکار

www.bhutto.org

ہو جاتے ہیں۔اس کا مطلب کوئی ضد یا تعصب نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس پاکستان صرف تاریخی حقائق و شواہد اور استدلال پیش کر رہا ہے۔ بنیادی معاملات پر سودے بازیوں سے مزید الجھن اور گڑبڑ ہوتی ہے۔ ہم کل صبح جو مذاکرات کرنے جا رہے ہیں۔ یہاں میں نے ان کے بنیادی نکات کی وضاحت کر دی ہے۔

آخر میں مَیں پھر لاہور کا ذکر کروں گا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ سرگرمیوں کا مرکز ہے، یہ پاکستان کا دل ہے۔ یہ وہ شہر ہے جو ہماری سیاست کے اتار چڑھاؤ اور ہماری ثقافتی اور اقتصادی سرگرمیوں کا گہوارہ ہے۔ جناب! یہ وہ شہر ہے جہاں ہم خود کی ری پراسیسنگ کر رہے ہیں۔ یہ ہمارا ری پراسیسنگ سنٹر ہے اور ہم ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے جس سے پاکستان کی ری پراسیسنگ کے مرکز پر کسی بھی قسم کے منفی اثرات مرتب ہوں۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا
پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب
28 اپریل 1977ء

موجودہ بحران بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہے۔ آج پاکستان اہم جغرافیائی حیثیت کا حامل ہے۔ اگر اسے نقصان پہنچا تو بہت سے عرب ملکوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے، جن میں متحدہ عرب امارات، اومان اور سعودی عرب وغیرہ شامل ہیں۔ سازشی عناصر مجھے ہٹانا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ملک موجودہ تحریک کے لیے بھاری رقم خرچ کر رہا ہے۔ "ہاتھی" نے ویت نام اور مشرقِ وسطیٰ پر ہمارے مؤقف کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ ہاتھی مجھ سے ناراض ہے لیکن اس کا واسطہ بندۂ صحرا سے آن پڑا ہے کہ ہم نے عربوں کو ہتھیار فراہم کیے۔ ہمارا سپاہی اسلام کا سپاہی ہے۔ ہم نے ایٹمی پلانٹ پر قومی مفاد کے مطابق مؤقف اختیار کیا ہے۔ ملک میں غیر ملکی کرنسی پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے۔ بعض بیرونی اخبارات نے لکھا ہے کہ اب مزدور بھی جو اس حکومت کے حامی تھے اس کے خلاف ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غریب ملک میں اگر اس طرح رقم پھیلائی جائے جس طرح یہاں پھیلائی گئی ہے کوئی کیوں کر اس سے متاثر نہ ہوگا؟ یہ راز نہیں ہے کہ کس طرح پاکستان میں رقم پانی کی طرح بہائی گئی ہے اور کس طرح غیر ملکی کرنسی سیلاب کی طرح یہاں پھیلی ہے کہ کراچی میں ڈالر چھ سات روپے کا ہو گیا ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کس طرح لوگوں کو اذان دینے کے لیے رقم دی گئی۔ (پی این اے نے بھٹو حکومت کے خلاف احتجاجاً مساجد کو استعمال کر کے اذانیں دینے کا اہتمام کیا تھا)۔ کس طرح لوگوں کو جیل جانے کے لیے رشوتیں دی گئیں حتیٰ کہ دودھ والوں کو اور ڈاکیوں کو رشوت دی۔ یقیناً صنعت کاروں نے قومی اتحاد کی حمایت کی لیکن اتنا پیسہ تو وہ بھی خرچ نہیں کر سکتے۔ مگر جو رقم پاکستان میں پانی کی طرح بہائی

جاری ہے، یہ رقم کسی پراسرار طریقے سے پاکستان آئی ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے۔ عزیز احمد نے اس کا ذکر ڈپلومیٹک انداز میں کیا ہے لیکن مجھے بتانے دیجئے کیونکہ چند افراد کا مستقبل کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور میرا فرض ہے کہ میں لوگوں کو واضح طور پر بتادوں کہ یہ قومی اتحاد کی سازش نہیں بلکہ بین الاقوامی سازش ہے۔ میں کسی ملک کا نام نہیں لینا چاہتا اور کسی ملک سے بگاڑنا نہیں چاہتا لیکن میں عوام کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا قصور کیا ہے، میرا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے یہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ عوام کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہاتھی کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور دنیا میں ہاتھی موجود ہیں۔ دنیا میں کتنے ہاتھی ہیں یہ آپ جانتے ہیں۔ یہ ہاتھی زیادہ نہیں ہیں۔ ان ہاتھیوں کا حافظہ بہت اچھا ہوتا ہے، وہ ماضی کو فراموش نہیں کرتے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جنگِ ویت نام کے موقع پر جب میں وزیرِ خارجہ تھا پاکستان نے کیا موٗقف اختیار کیا تھا۔ پاکستان سے اس وقت کہا گیا تھا کہ وہ غلط فریق کی حمایت کرے اور اگر جو کچھ طلب کررہے ہیں وہ نہ دے تو کم از کم پنگ پانگ کی گیندیں اور ٹیبل ٹینس کے ریکٹ ہی روانہ کردے لیکن ہم نے کہہ دیا کہ ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ یہ بات ایک ملاقات میں کہی گئی جو ایک اعلیٰ شخصیت سے کراچی میں ہوئی اور یہ شخصیت ''ہاتھی'' پر سوار تھی۔ اس نے کہا کہ کیا آپ پنگ پانگ کی گیندیں اور ٹیبل ٹینس کی گیندیں بھی بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایوب خان بھی اس ملاقات میں موجود تھے، وہ میری طرف دیکھنے لگے میں نے کہا کہ ہم کچھ نہیں بھیجیں گے کیونکہ اس کا تعلق اصولوں سے ہے ہم کسی طور پر بھی غلط فریق کی حمایت نہیں کرسکتے۔ چین کے ایک ہاتھی سے بڑے اختلافات تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب چین کا نام لینا بھی جرم تھا اور اس سے بعض افراد کا بلڈ پریشر تیز ہوجاتا تھا۔ چین سے تعلقات کو بہتر بنانے کے عمل کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ پھر ہم نے مشرقِ وسطیٰ میں عربوں کی حمایت کی۔ اس پر میں پاکستان کی ماضی کی ہر حکومت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ قائدِ اعظم سے لے کر اب تک ہر حکومت نے عربوں کی حمایت کی۔ لیکن بعض وجوہ کی بناء پر یہ حمایت صرف زبانی تھی جو اعلامیوں اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں تک محدود تھی اور ہمارے عرب بھائی اس کی قدر کرتے تھے لیکن جب میں برسرِ اقتدار آیا تو میں نے کہا کہ اصل حمایت فوجی حمایت ہوتی ہے۔ میری حمایت صرف زبانی نہیں بلکہ یہ ہے کہ آپ (عربوں) کی جنگ ہماری جنگ ہے اور پاکستان کا سپاہی اسلام کا سپاہی ہے۔ یہ بات ان لوگوں کو پسند نہ آئی جو جارحیت کا ارتکاب کرنے والے اور جارحیت کا شکار ہونے والے میں فرق کرنے کے لیے تیار نہ تھے جبکہ میں نے کھل کر کہا کوئی جارح ہے اور کوئی جارحیت کا شکار ہے۔ یہ کہ عرب جارح ہیں یا صیہونی جارح ہیں اور

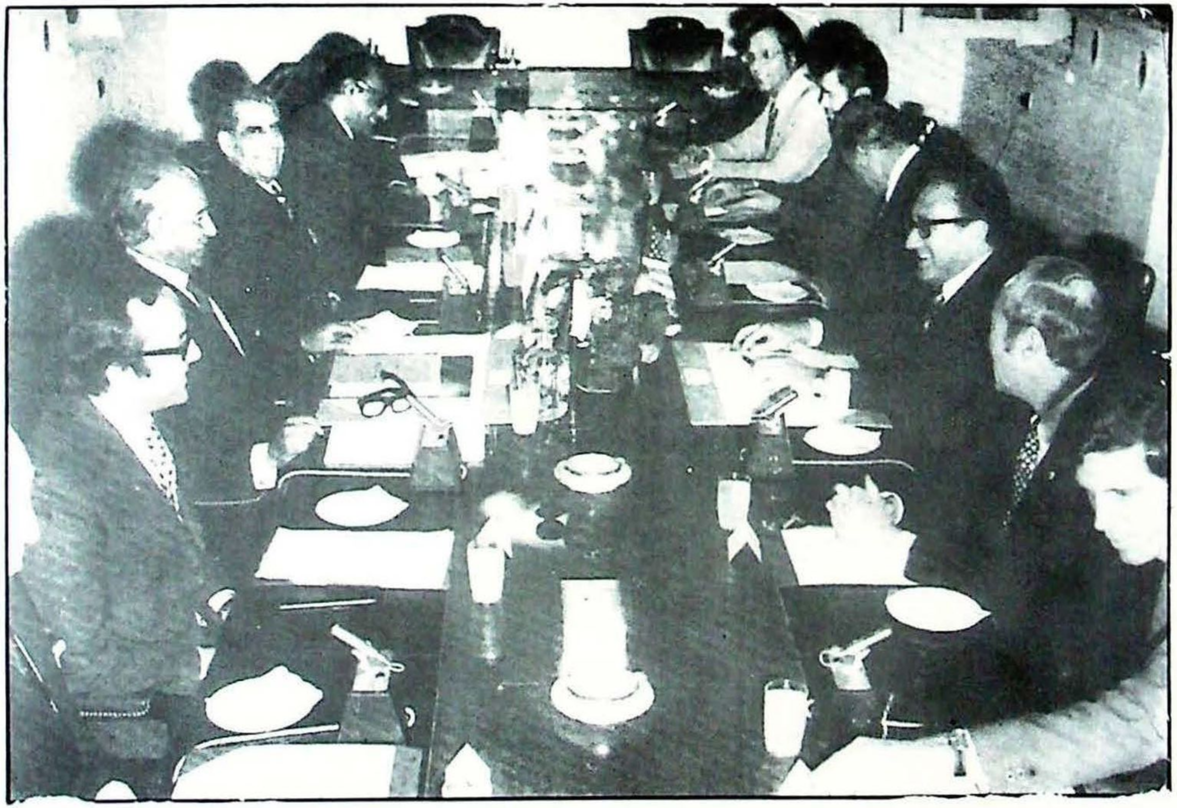

ہنری کسنجر اور ذوالفقار علی بھٹو مذاکرات کی میز پر۔ راولپنڈی 31 اکتوبر 1974ء

www.bhutto.org

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو۔ جیپ کے پیچھے شاہنواز بھٹو اور بے نظیر بھٹو بھی سوار ہیں

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ جنرل ضیاء، کھاریاں میں 1974ء

www.bhutto.org

طوافِ کعبہ کرتے ہوئے

شکار کے دوران۔ شاہنواز بھٹو اور بےنظیر بھٹو کے ہمراہ

www.bhutto.org

پارٹی راہنماؤں کے ہمراہ

قومی اتحاد کے راہنماؤں نوابزادہ نصراللہ خان، مفتی محمود اور
پارٹی راہنماؤں کوثر نیازی اور حفیظ پیرزادہ کے ساتھ

www.bhutto.org

فروری 1974ء لاہور۔ اسلامی سربراہی کانفرنس

ترکی کے صدر فخری کوروترک کے ہمراہ

www.bhutto.org

لاہور ہائی کورٹ، دورانِ مقدمہ

4اپریل 1979ء نوڈیرو۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کا جسدِ خاکی

www.bhutto.org

لاہور ہائی کورٹ دورانِ مقدمہ

www.bhutto.org

اس دور میں سچ اور جھوٹ کی پہچان کرا دی تو نے
زندگی امر ہوئی موت کی شان بڑھا دی تو نے

فرخ سہیل صاحب

آپ کا تعزیت نامہ ملا۔ ہمارے پیارے اور محترم کا بہیمانہ قتل ہماری زندگی کا غمناک ترین سانحہ ہے اس گھڑی میں آپ کے تعزیتی الفاظ نے ہماری غمناک زندگی کے لمحات کو قابلِ عمل بنانے میں مدد دی ہے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔

انڈس کے شفاف پانی کی مانند اُن کی زندگی اعلیٰ ظرفی، عظمت، ہمدردی اور فراخدلی کا بہتا ہوا دریا تھی انھوں نے جابرانہ طاقتوں کے خلاف انتہائی دلیری سے مقابلہ کیا تاکہ ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کر سکیں جو سچائی، انصاف اور مساوات کا عکاس ہو۔ وہ علیؓ کی تلوار کے ذریعے آئے تھے تاکہ عوام کے پیروں میں پڑی ہوئی استحصال کی زنجیریں توڑ دیں۔

انتہائی ایذا رسانی، نفرت انگیز انتقامی کارروائیوں اور موت کی کال کوٹھری میں قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود انھوں نے اپنی ناقابلِ شکست قوتِ ارادی اور ناقابلِ تسخیر جذبے سے دشمن کے ناپاک عزائم کو پامال کر دیا۔ وہ ایک لاثانی اور گرانمایہ شخصیت تھے جنھوں نے عوام سے غداری کرنے کی بجائے جامِ شہادت نوش کرنا پسند کیا۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا اور اسی لئے انھوں نے اپنی جان وقف کر دی۔

ذوالفقار علی بھٹو مہر و محبت کی ایک تاباں شخصیت تھے۔ ان کی ہستی کروڑوں بدنصیب انسانوں کے لئے جو اس سرزمین کی اتھاہ تاریکیوں میں زندگی گذار رہے تھے ایک خداداد نعمت تھی۔ جیسے ایک شہابِ ثاقب آسمان کو روشن کرتا ہے اُسی طرح وہ عوام کی نادار زندگی میں اُمید، حوصلے، روشن مستقبل، خوشحال زندگی اور مسکراہٹوں کا ایک روشن مینار تھے۔ ان کے کارناموں نے انھیں امر بنا دیا ہے۔

نصرت بھٹو

1979

ذوالفقار علی بھٹو شہید کی پھانسی کے بعد بیگم نصرت بھٹو کے خط کا عکس

www.bhutto.org

جنرل ضیاء الحق کی مارشل لاء مسلط کرنے کے بعد زیر حراست ذوالفقار علی بھٹو سے مری میں ملاقات 1977ء

www.bhutto.org

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو رہا ہو کر لاہور آئے۔ صادق حسین قریشی کے گھر۔ اگست 1977ء

www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو 70 کلفٹن کے باہر ذوالفقار علی بھٹو کی دوبارہ گرفتاری (ستمبر 1977ء) کے موقع پر اخبار نویسوں کو تفصیل بتا رہی ہیں۔ بیگم اشرف عباسی اور شاہنواز بھٹو نمایاں نظر آ رہے ہیں

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو شہید کی آخری تصویر نماز جنازہ ۔4 اپریل 1979ء

www.bhutto.org

فرخ سہیل گوئندی، محمود علی بھٹو مرحوم کے ہمراہ، جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ مئی 1979ء

www.bhutto.org

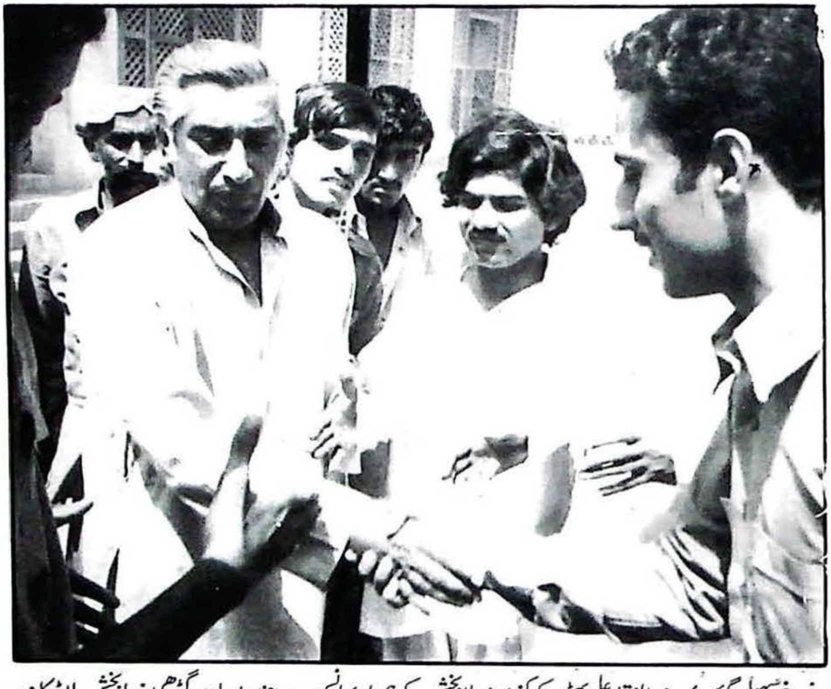

فرخ سہیل گوئندی، ذوالفقار علی بھٹو کے کزن مولا بخش کے ہمراہ پھانسی سے چند دن بعد، گڑھی خدا بخش، لاڑکانہ۔

مئی 1979ء

www.bhutto.org

شیخ محمد رشید مرحوم ریگل چوک مال روڈ لاہور۔ جب وہ جلاوطنی کاٹ کر لاہور آئے۔ فرخ سہیل گوئندی نمایاں نظر آرہے ہیں جولائی 1986ء

جارحیت کا شکار کون ہے عرب یا یہودی اور یہی فرق ہے ذوالفقار علی بھٹو میں اور دوسروں میں۔ قومی اتحاد کا کوئی دماغ تیار کر سکتا ہے؟ قومی اتحاد کے پاس ایسا کوئی ذہن ہے جو لوگوں کو بازار سے کم قیمت پر سبزیاں فراہم کر دے اور بیج تقسیم کر دے؟ کیا قومی اتحاد کے پاس ایسی تنظیم ہے؟ میں صرف ایک مثال دوں گا۔ ہمارے ملک میں ایسی باتیں کون سوچتا ہے کہ پہیہ جام کریں گے۔ یہ بیرونی خیالات ہیں۔ ایوب خان سے بھی کہا گیا تھا کہ اگر تمہارے خلاف انقلاب آیا تو جوابی اقدام کے طور پر ہم پہیہ جام آپریشن شروع کرا دیں گے۔ اس مقصد کے لیے دو ہزار افراد بھرتی کیے گئے۔ غیر ملکی ماہرین نے ان کو ریلوے اور طیارے روکنے اور پہیہ جام کرنے کے اقدامات کی تربیت دی۔

ہم نے پاکستان کی تعمیرِ نو کی ہے۔ اس حد تک کہ 1971ء میں مجھے نیویارک میں ایک بہت ذمہ دار شخص نے کہا تھا کہ اب پاکستان کا شمار نیپال، بھوٹان، بنگلہ دیش، سکم وغیرہ کے ساتھ ہوگا اور ان ہی کے مستقبل سے اس کا تعلق ہوگا کیونکہ پاکستان تو بھارت کے صوبے یوپی کے برابر نہیں ہے۔ لیکن اب چھ سال بعد 1977ء میں یہ صورتِ حال ہوگئی ہے کہ بھارت کے وزیرِ اعظم مرار جی ڈیسائی کہتے ہیں کہ پاکستان اس کا اہم اور بڑا پڑوسی ہے۔ نہ صرف یہ کہ مرار جی ڈیسائی نے یہ بھی کہا کہ بھارت پاکستان سے برابر کے تعلقات چاہتا ہے جبکہ پہلے بھارت علاقے کا بالادست ملک تھا لیکن میں نے اس وقت بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ہم اس سے صرف برابری کی بنیاد پر تعلقات رکھ سکتے ہیں لیکن اب پاکستان اتنا مضبوط اور مستحکم ہوگیا ہے کہ بھارت نے بالادستی والا موقف ترک کر دیا ہے۔ جغرافیائی طور پر پاکستان کی پوزیشن بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمیں جو بھی فوائد یا نقصانات ہو سکتے ہیں ان کا تعلق اسی فوجی اہمیت کی پوزیشن سے ہے۔ پاکستان کے جنوب میں بھارت ہے جو بہت بڑا ملک ہے۔ مشرق میں بعض دوسرے ممالک ہیں جن میں برما، بنگلہ دیش، بھوٹان، ملائشیا اور انڈونیشیا شامل ہیں۔ پھر مغرب میں افغانستان ہے جو اہم ملک ہے۔ پھر ایران ہے، وہ بھی اہم ملک ہے۔ چین کے ساتھ ہماری 350 میل طویل سرحد ملتی ہے جو فوجی اہمیت کی سرحد ہے، جہاں سنکیانگ کا حساس صوبہ ہے جو ہمارے شمالی علاقوں میں ملتا ہے۔ روس اور پاکستان میں صرف 9 میل کا فاصلہ ہے۔ یہ کاریڈ واخان کہلاتا ہے۔ پھر ہمارے مغرب میں متحدہ عرب امارات اور اومان اور دوسری ریاستیں ہیں۔ اسی جانب سعودی عرب ہے۔ پھر شمال مغرب میں بحیرۂ روم، یونان وغیرہ ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان کی پوزیشن بڑی اہم ہے۔ خدانخواستہ اگر پاکستان کو نقصان پہنچا تو مشرقی محاذ، مغربی محاذ اور عرب محاذ کی طرف بڑی خراب صورتِ حال پیدا

www.bhutto.org

ہو جائے گی اور اگر پاکستان مستحکم اور مضبوط ہوا تو صورتِ حال مختلف ہوگی۔ پاکستان کمزور ہوا تو متحدہ عرب امارات، اومان اور سعودی عرب کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جا سکتا ہے۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔

میں بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں بڑے پیانے پر بیرونی مداخلت ہوئی ہے۔ یہ کھیل انتخابی دھاندلی کے نام پر شروع کیا گیا۔ اگر دھاندلی کے خلاف لوگ ریل کی پٹریوں پر لیٹ جاتے ہیں، سینے کھول کر کہتے ہیں کہ گولیاں مارو تو ہم نے اس کے لیے طریقۂ کار مقرر کر دیا ہے جس کے ذریعے دھاندلیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ پھر جہاں تک شریعت کا مسئلہ تھا ہم نے اس کے لیے اقدامات کیے ہیں لیکن اب مولانا مودودی اور بیگم نسیم ولی خان کہتے ہیں کہ یہ اصل مسئلہ ہے ہی نہیں۔ حالانکہ رفیق باجوہ نے جب وہ قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل تھے کہا تھا کہ اگر حکومت نظامِ مصطفیٰ ﷺ لے آئے تو ہم دستبردار ہو جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ دھاندلی یا شریعت کا نہیں اس رقم کا ہے جو ملک میں بڑے پیانے پر بکھیری جا رہی ہے۔ اب وہ میرا استعفیٰ مانگتے ہیں۔ اس وزیرِاعظم کا استعفیٰ جسے دوبارہ عوام نے منتخب کیا ہے۔ یہ اعزاز لیاقت علی خان، غلام محمد، ناظم الدین کسی کو حاصل نہ رہا پھر میری پارٹی میں گھسنے کی بھی کوشش کی، وزیروں، ارکانِ اسمبلی کو ورغلانے کی کوشش کی۔ ہر بیرونی اخبار نویس سوال کرتا ہے کہ آپ کب مستعفی ہوں گے۔ میں نے تو ان سے نہیں پوچھا کہ کیلیہان کب مستعفی ہوں گے جو صرف ایک رکن کی اکثریت سے اور لبرل کی حمایت سے حکومت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے ناردرن آئی لینڈ میں مارشل لا لگا رکھا ہے۔ وہ کیلیہان سے، سمتھ سے مستعفی ہونے کے لیے کیوں نہیں پوچھتے؟ آخر سارا نزلہ ذوالفقار علی بھٹو پر کیوں گر رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھی کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ میں پاکستان کے استحکام کا ستون ہوں، پاکستان کے استحکام کی علامت ہوں اس لیے وہ مجھے ہٹانا چاہتے ہیں۔ یہ مسئلہ فرد کا نہیں بلکہ اس کا ہے کہ وہ فرد یعنی ذوالفقار علی بھٹو چاہتا کیا ہے۔ میں نے جب اسلامی کانفرنس بلائی تو اسے ایک ماہ ملتوی کرنے کے لیے کہا گیا۔ اسے ملتوی کر دیا۔ پھر ایک ماہ کے لیے ملتوی کرنے کو کہا گیا جو میں نے کر دی۔ جب تیسری بار اسے ملتوی کرنے کے لیے کہا گیا تو میں نے شاہ فیصل کو خط لکھا۔ انہوں نے مجھ سے مکمل اتفاق کیا اور لکھا کہ کانفرنس فروری میں پاکستان میں ہوگی اور مزید التوا نہ ہوگا۔ پھر جب اکتوبر میں کسنجر پاکستان آئے اور مجھ سے بات ہوئی انہوں نے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا، یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ وہ کتاب لکھ رہے ہیں شاید اس میں ذکر کریں یا نہ کریں۔ جس کے بعد یاسر عرفات نے اقوامِ متحدہ سے خطاب کیا اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تسلیم کیا گیا۔ پھر ہم نے یونان اور ترکی کا تنازع طے کرانے کی کوشش

کی۔اس طرح کوریا نے بھی باہمی تنازع طے کرانے کے لیے پاکستان سے رجوع کیا۔ ہاتھی نے ان سب باتوں کو پسند نہ کیا کہ پاکستان کو یہ مقام حاصل ہو۔اپوزیشن نے اپنی انتخابی مہم میں ہر بات کا ذکر کیا اور گالیاں تک دیں لیکن ایک نہایت اہم بات چھوڑ دی اس پر کچھ نہ بولے اور وہ اہم مسئلہ پاکستان اور فرانس کے درمیان ایٹمی پلانٹ کی خریداری کے معاہدے کا تھا، جبکہ ان کو معلوم تھا کہ اس مسئلہ پر زبردست عالمی دباؤ ہے۔ ہر سوال پوچھا گیا لیکن یہ نہ پوچھا گیا کہ اس معاہدے پر کیا کیا جانے والا ہے۔انہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا کہ آپ اس معاہدے کو ختم کریں گے یا اسے مکمل کریں گے؟

آخر میں نے ذاتی منفعت کے لیے تو یہ معاہدہ نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ صرف اس لیے کہ میں نے اس مسئلے پر قومی مفاد میں مؤقف اختیار کیا ہے۔

اسی طرح تیسری دنیا کی کانفرنس سے بھی وہ پریشان ہیں کہ اس شخص نے آزادانہ فیصلے کیے ہیں اور یہ ہمارے لیے مصیبت کا سبب بن گیا ہے۔میری حکومت کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ ہم ایٹم بم بنائیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو ایٹمی ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنے سے کیوں روکا جائے اگر ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ پرامن مقاصد کے لیے تمام ضمانتیں دیتے ہوئے ایٹمی ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے روکنے کا کیا جواز ہے؟ صرف اس لیے کہ پاکستان کو اس کی صلاحیت ہی حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ جب کسنجر آئے تو انہوں نے ایٹمی پلانٹ کے بارے میں سخت مؤقف اختیار کیا۔ پھر وہ فرانس گئے اور وہاں اخبارات میں خاصی ہنگامہ آرائی رہی۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ میں اس پر مذاکرات کروں۔ میں نے کہا کہ آپ انتخاب ہو جانے دیں۔اس کے بعد پھر مذاکرات کے لیے کہا گیا تو میں نے کہا اب میرا انتخاب ہو رہا ہے۔ایٹمی پلانٹ پر میرے قومی مفاد کے مطابق مؤقف پر خونخوار بھیڑیئے میرے خون کے پیاسے ہیں۔ عوام کو اصل کہانی سے ضرور واقف ہونا چاہیے۔کل تک میں خاموش رہا، اب عوام کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ یہ بہت بڑی سازش ہے۔ میں نے اب تک بڑے صبر و تحمل سے کام لیا ہے، یہ کوئی دیسی سازش نہیں، یہ بین الاقوامی سازش ہے لیکن میں نے ماضی میں بھی سازشوں کا مقابلہ کیا ہے اور اس کا بھی کروں گا۔

میں اقتدار سے چمٹا نہیں رہنا چاہتا لیکن میں اپنا مشن مکمل کر کے رہوں گا۔اللہ تعالٰی نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے کہ ملک کی خدمت کروں۔ میں نے عورتوں، مزدوروں اور کسانوں کو آزادی دلائی اور اجارہ داری ختم کی۔ اس طرح مشن کا پہلا حصہ تو مکمل ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ افغانستان سے باعزت اور باوقار سمجھوتہ ہو جائے۔ اس معاملے کو کافی حد تک آگے بڑھایا جا چکا ہے۔صدر داؤد سے

www.bhutto.org

گزشتہ جون کے مذاکرات میں بڑی حد تک اجمالی مفاہمت ہو چکی ہے۔ دوسرے یہ کہ میں مسلح افواج کی صلاحیت کو بھی مزید بڑھانا چاہتا ہوں جس کے لیے میں 1963ء سے کوشاں ہوں۔ تیسرے یہ کہ کشمیر کے مسئلے کو ہم باوقار اور باعزت طور پر حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تاہم اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ پہلے دو کام یقیناً مکمل کرلوں گا اور تیسرے کے مکمل کرنے کی بھی پوری توقع کرتا ہوں اور پھر ضروری نہیں کہ آدمی اپنے عظیم مشن ضرور مکمل کرے۔ ماؤزے تنگ بھی اپنے تمام مشن مکمل نہ کر سکے۔

نفاذِ شریعت کا مطالبہ کرنے والے اب اسے اصل مسئلہ تسلیم نہیں کرتے۔ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نام پر اپوزیشن نے ملک میں جنون پھیلا دیا تھا لیکن اب مولانا مودودی جیسی شخصیت یہ کہہ رہی ہے کہ یہ اصل مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے اپوزیشن کے عزائم بے نقاب ہو گئے ہیں۔ کراچی، حیدرآباد اور لاہور میں مارشل لاء آئین کے تحت لگایا گیا ہے جب کہ 1958ء اور 1969ء کے مارشل لاء نے آئین کو توڑ دیا تھا۔

میں ان دلائل کو نہیں دہراؤں گا جو ہنگامی حالت کے نفاذ کے حق میں دیئے گئے ہیں۔ یہ ہنگامی حالت آئین کے مطابق اور آئین کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ اس ہنگامی حالت کی طاقت کا منبع پاکستان کا آئین ہے۔ کراچی، حیدرآباد اور لاہور کے تین شہروں میں جو مارشل لاء لگایا گیا ہے وہ بھی آئین کے مطابق ہے اور آئین سے ہی نکلا ہے اور یہ آئین سے بالا نہیں ہے۔ اس مارشل لاء میں اور سابق مارشل لاء میں بڑا فرق ہے۔ موجودہ مارشل لاء محدود اور آئین کے تحت ہے جبکہ 1958ء اور 1969ء میں جو مارشل لاء لگائے گئے وہ غیر محدود تھے اور ان مارشل لاؤں نے آئین کو توڑ دیا تھا جبکہ موجودہ مارشل لاء آئین کی حدود کے اندر اور اس کی دفعات کے مطابق ہے۔

پاکستان میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات دو مواقع پر ہوئے۔ پہلی بار 1970ء میں اور دوسری بار 1977ء میں۔ 1970ء کے عام انتخابات مارشل لاء کے تحت ہوئے اس مارشل لاء کے تحت جس نے آئین کو توڑا دیا تھا جب کہ 1977ء کے انتخابات موجودہ آئین کے تحت ہوئے۔ جو کسی سول حکومت کے تحت پہلے عام انتخابات ہیں۔ اس سے پہلے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات ہوئے لیکن وہ انتخابات ان صوبوں میں ہوئے جبکہ 1965ء کے انتخابات محدود رائے دہندگی یعنی بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت ہوئے تھے جن میں بنیادی جمہوریت کے ان 80 ہزار ارکان کو حقِ رائے دہی حاصل تھا۔ صوبوں میں 1947ء سے 1958ء کے درمیان جو انتخابات ہوئے وہ کسی بھی طرح سے آزادانہ اور منصفانہ نہیں کہے

www.bhutto.org

جا سکتے تھے بلکہ اس کے برعکس یہ نہایت غیر منصفانہ انتخابات تھے۔ جن میں پولنگ سے قبل ہی فیصلے کر لیے گئے۔ یہ وہ انتخابات ہیں جو بلوچستان کے سوا سب جگہ ہوئے کیونکہ بلوچستان کو اس وقت صوبے کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ میں کوئی معذرت پیش نہیں کر رہا ہوں اور نہ کوئی جواز پیش کر رہا ہوں اور نہ ہی اس کے ذریعہ شخصیتوں کو معرضِ بحث لا رہا ہوں۔ سندھ میں ہونے والے ماضی کے ان انتخابات کی ایک مثال میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں کہ ایک معروف شخصیت کو اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے تھے۔ اس وقت کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کا وقت صبح 10 بجے سے شام 4 بجے تک تھا وہ صاحب گیارہ بجے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے پہنچے اور اپنے کاغذات داخل کیے لیکن اس کے بعد ابھی پانچ گھنٹے اور باقی تھے جن میں دوسرے افراد بھی کاغذاتِ نامزدگی داخل کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان صاحب کے فائدے کے لیے یہ حکم جاری کیا گیا کہ آج دن گیارہ بجے صبح کو چار بجے شام سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد دوپہر ساڑھے بارہ بجے ایک دوسرے صاحب اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے آئے تو ان سے کہا گیا کہ آپ ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے یعنی ساڑھے پانچ بجے شام آئے۔ ان صاحب نے دریافت کیا کہ میں تو ساڑھے بارہ بجے آیا ہوں۔ ساڑھے پانچ بجے شام کیسے ہو گئے؟ تو انہیں بتایا گیا کہ آج کے دن گیارہ بجے شام 4 بجے تصور کیے جائیں گے۔

سرحد کے انتخابات کے سلسلے میں کسی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان میں سے بہت سے لوگ مر گئے ہیں لیکن اصل دھاندلی باز ابھی زندہ رہتے ہیں۔ میں چونکہ اس کا احترام کرتا ہوں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن پشاور کی ایک خاتون جو قومی اسمبلی کی رکن بھی منتخب ہوئی ہیں، خوب جانتی ہوں گی کیونکہ ان کے بھائی بھی ان انتخابات کے متاثرین میں شامل ہیں۔ اسی طرح پنجاب میں انتخابات ہوئے۔ اس ایوان کے زیادہ تر ارکان کا تعلق پنجاب سے ہے۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ پنجاب کے انتخابات انسپکٹر جنرل آف پولیس کے دفتر میں منعقد ہوئے۔ بنگال میں کیا ہوا، یہ مجھے نہیں معلوم کیونکہ بنگال اس وقت بھی اتنا ہی دور تھا جتنا آج دور ہے۔ وہاں جگتو فرنٹ بنایا گیا جو کامیاب ہو گیا لیکن اس کو ناکام بنانے کی تمام تر کوششیں کی گئیں۔ یہ ہے 1947ء سے 1958ء تک انتخابات کی تاریخ۔ اس کے بعد ایوب آیا۔ اس نے مارشل لاء لگایا اور بنیادی جمہوریت کا نظام قائم کیا جس کے تحت رائے دہندگی 80 ہزار تک محدود کر دی گئی لیکن اس محدود رائے دہندگی میں بھی بدعنوانیوں اور دھاندلیوں کی زبردست شکایات ہوئیں۔ یہاں تک کہ فاطمہ جناح جو اس وقت ایوب خان کی مخالف تھیں، انہوں نے

www.bhutto.org

اپوزیشن کے لیڈروں سے جن میں سے بہت سے اب قومی اتحاد میں ہیں، کہا کہ وہ انتخابات کے نتائج کی خلاف ورزی کرنے کے لیے تیار ہیں کیونکہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے لیکن ان تمام اپوزیشن لیڈروں نے جن میں قومی اتحاد کے بہت سے موجودہ لیڈر بھی شامل تھے، مس جناح کو مشورہ دیا کہ وہ انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرلیں اوران انتخابات کو چیلنج نہ کریں۔ بہت زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی جہاں کمپیوٹروں کے ذریعہ انتخابات ہوتے ہیں وہاں بھی انتخابی دھاندلیوں کی شکایات ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نظریاتی طور پر مکمل طور پر منصفانہ انتخابات ایک خیال ہے۔ 1970ء کے انتخابات میں بھی بے قاعدگیاں ہوئیں اور بے قاعدگیاں معمولی نہیں تھیں۔ میں نے پانچ جگہ سے انتخاب لڑا، میں ہر نشست پر 40 سے 45 ہزار ووٹوں سے جیتا۔ ملتان میں مَیں نے قومی اتحاد کی طاقت ور شخصیت سے انتخاب لڑا، جو آج وہاں کی بڑی بااثر شخصیت ہیں۔ میں صرف ایک دن کے لیے ملتان گیا اور انہیں میں نے 25 ہزار ووٹوں سے ہرایا۔ لاڑکانہ میں بھی میرا طاقت ور حریف سے مقابلہ ہوا لیکن ایک موقع ایسا بھی آیا جب اس حریف نے مجھ سے نہ لڑنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اس کو مشورہ دیا گیا کہ وہ انتخاب ضرور لڑے اور حکام نے کہا وہ اس کو جتوانے میں مدد دیں گے۔ اس شخص نے کراچی میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے خلاف لڑنا نہیں چاہتا۔ وہ صوبائی اسمبلی کے لیے لڑے گا یا اپنے بیٹے کو کھڑا کرے گا مگر پھر اس کے پاس فون آنے لگے کہ تم ضرور لڑو ہم تم کو جیتنے میں مدد دیں گے۔ چنانچہ اس نے مجھ کو پیغام دیا کہ میں ہوشیار رہوں کیونکہ اسے انتخاب لڑنے پر مجبور کیا جارہا ہے اور اسے مدد کی یقین دہانی کرانے والا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ جنرل عمر تھا جو اس زمانے میں مارشل لاء کا انتظام چلا رہا تھا۔ اس طرح ڈیرہ اسماعیل خان کی تین تحصیلوں میں سے دو میں مَیں نے مفتی محمود کو ہرایا جبکہ ایک تحصیل میں انہوں نے مجھے ہرایا۔ یقیناً یہاں کسی طور پر دھاندلی کر کے مجھے ہرادیا گیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پانچوں جگہوں سے جیتوں۔ اس کے علاوہ انتخابات میں دھاندلی کے لیے ایک صاحب کو باقاعدہ فنڈز مہیا کیے گئے۔ پھر بہت سے افراد کو میری پارٹی میں شامل ہونے سے روکا گیا، ان میں حامد رضا گیلانی اور یوسف چانڈیو شامل ہیں جو اس وقت بھی ایوان میں موجود ہیں۔

میں نے انتخابات میں دھاندلی کے لیے کوئی ہدایت نہیں دی۔ میں آپ کو پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ میں نے اس کے برخلاف ہدایات دیں۔ میں نے ہر صوبے کے وزیرِ اعلیٰ سے کہا کہ وہ انتخابات میں دھاندلی نہ ہونے دیں۔ انتخابات سے پانچ روز قبل میں نے لاہور میں پانچ

www.bhutto.org

ڈویژنوں کے کمشنروں کو بلایا اور ان کو ہدایات دیں کہ وہ انتخابات میں کسی قسم کی دھاندلی نہ ہونے دیں۔ قبائلی علاقے سے کسی ایک رکن کو بھی منتخب کرانے کے لیے کوشش نہ کی گئی حالانکہ وہاں دھاندلی کرانا آسان تھا۔ اگرچہ سابقہ حکومتیں وہاں انتخاب کرانے کے بجائے اپنی پسند کے آدمیوں کو چن لیتی تھیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں دھاندلی نہیں چاہتا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ لوگ میرے ساتھ ہیں اور مجھے ووٹ دیں گے۔ اقلیتیں مجھے ووٹ دیں گی، عورتیں مجھے ووٹ دیں گی۔ میں نے ان میں کئی تقریریں کیں اور دورے کیے اور رائے عامہ کو ہموار کیا جب کہ دوسری طرف یہ لوگ تھے جن کی لمبی لمبی زبانیں ہیں۔ ان کے لیے دولت کے دروازے کھل گئے تاکہ قومی ملکیت میں لی گئی دوسری صنعتوں کو قومی ملکیت سے واپس لیا جائے۔ یہ عناصر ان کے ساتھ تھے جب کہ خاموش اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے اصلاحات کیں۔ یہ کاشت کار ہیں جو ملک کی آبادی کا 80 فیصد ہیں۔ ان کے لیے ہم نے زرعی اصلاحات کیں۔ جو مزدور ہیں ان سب نے ہمیں ووٹ دیئے۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ انتخاب میں دھاندلی کے الزامات لگائے گئے اور بیرونی پریس نے اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جب کہ اپوزیشن خود جانتی تھی کہ وہ انتخابات نہیں جیتے گی۔ اس نے خود اپنے قریبی آدمیوں سے کہا کہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کو دو تہائی اکثریت نہ ملے۔ پاکستان پسماندہ ملک ہے اور یہاں صرف دو بار انتخاب ہوئے ہیں۔ ممکن ہے دوسری جانب سے کچھ دھاندلیاں ہوئی ہوں۔ لیکن ایسی 15-20 سیٹیں ہو سکتی ہیں۔ پھر یہ کہا جا رہا ہے کہ دھاندلی صرف پیپلز پارٹی نے کرائی حالانکہ اپوزیشن والوں نے صرف دھاندلی ہی نہیں کی بلکہ غنڈہ گردی کی۔ عورتوں کے سر مونڈے اور بیلٹ بکس چرائے۔ انہوں نے کراچی اور حیدر آباد کے تمام پولنگ سٹیشنوں کا گھیراؤ کیا اور صبح ساڑھے گیارہ بجے کے بعد وہاں ہجوم کی حکمرانی تھی۔ بلوچستان میں ان لوگوں نے فوج کی موجودگی کے نام پر انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ جب کہ دوسرے صوبوں میں انہوں نے کہا فوج کو انتخابات کی نگرانی کرنی چاہیے۔ وہ لوگ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا)، کراچی، حیدر آباد میں جیتے اور پنجاب و سندھ میں ہارے۔ 1970ء میں بھی بری طرح ہارے تھے۔ امریکہ میں نکسن نے بھی کینیڈی کے خلاف انتخابی دھاندلی کا شکوہ کیا تھا۔ پاکستان میں اسلام کے قوانین آپ بنائیں، ہم انہیں نافذ کریں گے۔ جہاں تک شراب اور جوئے کا تعلق ہے ہم اس پر پابندی لگا ہی چکے ہیں۔ قومی اتحاد کے جو لوگ خود کو عالم کہتے ہیں انہیں چاہیے کہ شریعت کے نفاذ کے لیے اسلامی نظریہ کونسل میں آجائیں۔ ہم دوسرے ملکوں سے بھی اس میں سکالرز بلانے کے لیے تیار ہیں لیکن اب مولانا

www.bhutto.org

مودودی کہتے ہیں کہ یہ اصل مسئلہ نہیں ہے۔اس مسئلہ پر کوئی تنازع نہیں ہے۔اسلام ہمارا مذہب ہے۔ آئین میں لکھا ہے کہ سات سال میں قرآن وسنت کے مطابق قوانین بنائے جائیں گے اور شریعت نافذ کی جائے گی۔قومی اتحاد کے راہنما جو اس آئین کی تیاری میں شریک تھے، کہنے لگے کہ تین ماہ میں یا چھ ماہ میں شریعت نافذ کردی جائے گی۔

اگر ایسا ہے تو اس کے لیے راضی ہوں۔وہ آئیں اور چھ ماہ میں شریعت نافذ کرنے میں تعاون کریں اور قانون اس کے بعد ہے۔جب انہوں نے عوام کے جذبات بھڑکائے، بہنوں اور بھائیوں کو نظامِ مصطفےٰ ﷺ کے لیے جہاد کے نام پر سڑکوں پر لائے لیکن اب مولانا مودودی کہہ رہے ہیں کہ یہ تو اصل مسئلہ تھا ہی نہیں۔حالانکہ انتخابی مہم کے دوران انہوں نے دو مسائل پر بات کی: ایک نفاذ شریعت اور دوسرے قیمتوں میں کمی۔اس کے علاوہ انہوں نے گالیاں دینے پر اکتفا کیا۔کسی اور مسئلہ پر بات نہیں کی۔اب جہاں تک قیمتوں کا تعلق ہے اس مسئلہ کا دنیا بھر سے تعلق ہے اور اگر قومی اتحاد بھی آجاتا تو اس مسئلہ کو حل نہ کرسکتا۔ تاہم ہم قیمتوں پر کڑی نظر رکھ رہے ہیں اور ہم نے تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا ہے۔

ہمارے اور ان کے درمیان خطِ متارکہ بالکل واضح ہے کہ ہم عوام کے ساتھ ہیں اور یہ مفاد پرست کس کے ساتھ ہیں؟

www.bhutto.org

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا
راجہ بازار راولپنڈی میں خطاب
30 اپریل 1977ء

جس روز پی این اے نے پہیہ جام ہڑتال کی اپیل کی جو کہ پی این اے کی تحریک کا نقطۂ عروج تھا۔ اسی روز وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے راولپنڈی شہر اور چھاؤنی کے علاقوں کا ایک کھلی جیپ میں تفصیلی دورہ کر کے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا اور امریکی وزیر خارجہ کا وہ خط لے کر عوام کے پاس آئے جس میں امریکہ نے مذاکرات یا سودے بازی کی دعوت دی تھی۔ جناب بھٹو کا یہ دورہ تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ عوام اپنے قائد کو اپنے درمیان پا کر دیوانہ وار رقص کرنے لگے اور تالیاں بجانے لگے۔ ان کے جوش اور خوشی کا یہ عالم تھا کہ وہ بے قابو ہوئے جا رہے تھے اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ قائدِ عوام نے راولپنڈی صدر کے قلب میں بینک سکوائر میں ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔ جناب بھٹو کی جیپ جب لوگوں کے قریب سے گزری تو وہ حیران رہ گئے۔ جناب بھٹو پرائم منسٹر ہاؤس سے روانہ ہوئے اور شاہراہِ پہلوی سے ہوتے ہوئے شہید چوک پہنچے۔ راستے میں لوگوں نے پرجوش اور زبردست تالیاں بجا کر اپنے محبوب لیڈر کا خیر مقدم کیا۔ شہید چوک سے جناب بھٹو اقبال روڈ سے ہوتے ہوئے لیاقت چوک پہنچے جہاں انہوں نے پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے جو وہاں موجود تھے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد وزیر اعظم مریڑ حسن چوک کے راستے چھاؤنی پہنچے اور ''امریکن سنٹر'' کے قریب چوک میں ایک میگافون کے ذریعہ بہت بڑے ہجوم سے خطاب کیا۔ ہجوم نے وزیر اعظم کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے۔ وزیر اعظم کی تقریر کے دوران بار بار لوگوں نے پر جوش اور فلک شگاف نعرے لگائے لوگوں نے ''پوری قوم بھٹو کے ساتھ ہے''، ''سامراج کی سازش کو کچل دو'' کے نعرے لگائے۔ بھٹو نے کھلی

www.bhutto.org

جیپ میں کھڑے ہو کر خطاب کرتے ہوئے کہا:

''میں بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا خواہ یہ راز داری کے ساتھ ہو یا غیر راز داری کے ساتھ۔ میں اپنے اصولوں پر سختی سے ڈٹا رہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ پاکستان کے کسی ملک کے ساتھ تعلقات خراب ہوں لیکن اگر انہوں نے ہمارے داخلی معاملات میں دخل اندازی کی تو میری طرح ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ انہیں روکے۔ لہٰذا میں انہیں جواب دوں گا کہ میں (ان کے ساتھ) گفت وشنید راز داری سے کروں گا لیکن اصولوں پر کسی طرح سودے بازی نہیں ہوگی۔ جب بھی کوئی طاقت پاکستان کو مرعوب کرنے کی کوشش کرے گی میں اس کا جواب دینے کے لے تیار ہوں گا۔ یہ مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے میں اسے مزید پیچیدہ نہیں بنانا چاہتا لہٰذا ان خطوط پر جن کی میں نے نشاندہی کی ہے جواب بھیجوں گا۔ امریکی خط میں تجویز کیا گیا ہے کہ معاملات پر راز دارانہ انداز میں تبادلۂ خیال کیا جائے۔ میں عوام کو اس خط کے بارے میں آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ تبادلۂ خیال راز داری کے ساتھ ہو سکتا ہے یا دوسری صورت میں بھی لیکن میں اصولوں کو ہرگز قربان نہیں کروں گا۔ میں اس اصول پر سختی کے ساتھ کار بند رہوں گا۔ میں عوام کو یہی بتانے آیا ہوں کہ میں کسی ملک کے ساتھ تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا لیکن ملک کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر کسی ملک نے پاکستان کے داخلی امور میں دخل اندازی کی کوشش کی تو میں یہ کوشش ناکام بنادوں گا۔ لہٰذا میں امریکہ کو جواب دوں گا کہ میں راز دارانہ طور پر بات چیت کے لیے تیار ہوں لیکن میں کسی صورت اصولوں پر سودے بازی نہیں کروں گا۔ بعض بڑے بیرونی ممالک پاکستان کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں لیکن میں ایسی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوں گا۔ میں ہر معاملہ عوام کے سامنے رکھوں گا۔ یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے لیکن میں اسے مزید الجھانا نہیں چاہتا۔ میرے ساتھیو! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ ان کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہیں؟

اپوزیشن نے دراصل انتخابات سے قبل ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر عوام کا فیصلہ اس کے حق میں نہ ہوا تو وہ اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ اس پالیسی کے تحت اپوزیشن نے کہنا شروع کر دیا کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے۔ اس الزام کے جواب میں میں نے ان سے کہا کہ میں آئینی ذرائع سے ان کی شکایات کے ازالہ کے لیے تیار ہوں لیکن انہوں نے آئینی اور قانونی ذرائع تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ درحقیقت یہ لوگ انتخابات کے عمل اور اس میں عوام کے فیصلہ پر یقین نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انتخابات سے پہلے کہہ دیا تھا کہ وہ انتخابات کے نتائج کا انتظار نہیں کریں گے۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ آئین کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی اور جمہوری اداروں کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ میں نے قوم

www.bhutto.org

کو28اپریل کو پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران صحیح صورتِ حال بتائی اور کہا تھا کہ یہ میری ذات کا سوال نہیں۔ میرا واحد جرم یہ ہے کہ ملک کی ترقی اور خوش حالی چاہتا ہوں اور اس کی سالمیت اور یکجہتی کا خواہشمند ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ملک کا وقار بڑھے۔ مذاکرات کے لیے میری پیشکش اور شریعت کے قوانین پر عملدرآمد کی تجاویز کے بارے میں اپوزیشن کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں نہ تو انتخابات سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی شریعت سے۔ آخرِ کار مجھے 28 اپریل کو پارلیمنٹ میں حقیقت کا انکشاف کرنا پڑا اور قوم کو بتانا پڑا کہ یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے۔ یہ میری ذات کا سوال نہیں اگر ایسی بات ہوتی تو میں وزارتِ عظمٰی کو خیر باد کہہ دیتا۔ چونکہ یہ پاکستان کی سالمیت اور بقاء کا سوال ہے اس لیے میں اپنے مؤقف سے دستبردار نہیں ہوا۔ مجھ سے جو گناہ سرزد ہوا وہ یہ ہے کہ میں پاکستان کو مضبوط بنانا اور اس کا وقار بڑھانا چاہتا ہوں۔ جب اپوزیشن نے مارچ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلیوں کا الزام لگایا تھا، میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ملک کے آئین کے مطابق کسی بھی فیصلہ کے لیے تیار ہوں۔ الیکشن کمیشن اور الیکشن کمیشن ٹربیونل جائز شکایات کا ازالہ کر سکتے ہیں لیکن آپ نے دیکھا کہ انہیں انتخابات یا اس کے نتائج سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتے کہ الیکشن کمیشن معاملہ کا فیصلہ کرے۔ وہ ملک میں بدنظمی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے انتخابات سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ نتائج کا انتظار نہیں کریں گے اور بات چیت کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ میں کسی صورت میں، کسی حالت میں آئین اور قومی ادارے کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ جب اپوزیشن نے نظامِ مصطفٰی ﷺ پر عملدرآمد کا مطالبہ کیا، میں نے ان سے کہا کہ یہ سب کچھ آئین میں موجود ہے۔ اس کے بعد میں نے انہیں دعوت دی کہ مل کر بیٹھیں اور چھ ماہ کے اندر شرعی قوانین بنائیں تاکہ قومی اسمبلی انہیں منظور کر سکے لیکن انہوں نے کہا کہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں انتخابات یا شرعی قوانین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پارلیمنٹ میں میری تقریر سے قوم کو معلوم ہوا کہ لڑائی نہ تو انتخابات کی ہے نہ شریعت کے لیے ہے بلکہ یہ ایک منظم سازش ہے۔ میں عوام سے پوچھتا ہوں کہ کیا مجھے امریکی وزیرِ خارجہ کے خط کا اس انداز میں جواب دینے کی اجازت ہے جس کی نشاندہی کی ہے کیونکہ میں نے ہر کام کے لیے عوام کی منظوری لینے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ میں ہر معاملہ عوام کے سامنے رکھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ انشاءاللہ غریب جیتیں گے، عوام جیتیں گے۔

www.bhutto.org

''آپریشن فیئر پلے'' حقائق کی روشنی میں

دسمبر 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی نوزائیدہ پاکستان پیپلز پارٹی ایک بحران کے دوران اقتدار کے ایوانوں میں اتری تو بچے کھچے پاکستان کو نیا پاکستان بنانے کا ایک نیا جذبہ بھی عوامی سطح پر جنم لے چکا تھا۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی چونکہ ایک ریڈیکل، قوم پرست، سامراج دشمن، مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے سوشلسٹ منشور کے ساتھ برسر اقتدار آئی تھی اس لیے یہ حکومتی تبدیلی اب تک پاکستان میں ہونے والی حکومتی تبدیلیوں کے حوالے سے نظام کی تبدیلی سے تعبیر کی گئی۔ مسٹر بھٹو کی پر جوش کرشماتی قیادت نے عوام کو نیا حوصلہ بھی دیا جس کے سبب ایک نئے پاکستان کی تعمیر کا خواب پھوٹنا یقینی تھا۔ نئی حکومت ایک ریڈیکل منشور اور منصوبوں کے علاوہ درمیانے طبقے کی سامراج دشمن قیادت کو بھی سامنے لے کر آئی۔ جوں جوں بھٹو صاحب کی قیادت میں پی پی پی کی حکومت نے اقتدار پر قدم جمانے شروع کیے توں توں بھٹو صاحب کی ذہین قیادت کا کینوس ملک سے باہر خطے اور خصوصاً اسلامی و تیسری دنیا میں ابھرتا چلا گیا۔ ملکی نظام میں تو وہ تبدیلیاں شاید برپا نہ کی جا سکتیں جن کا وعدہ عوامی حکومت نے کیا تھا مگر پاکستان عالمی سیاست میں تیسری دنیا اور اسلامی ممالک کے حوالے سے اہم سیاسی مقام پا گیا جو سراسر ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کا مرہونِ منت تھا جبکہ ملک میں کی جانے والی چند ریڈیکل تبدیلیاں بھٹو حکومت کے لیے آئے دن اپوزیشن کو قریب تر کرتی چلی گئیں۔ چونکہ اندرونی ریاستی نظام کے نوآبادیاتی کردار کو تبدیل نہ کیا گیا اس لیے یہ عوامی اصلاحات اور تبدیلیاں بھٹو صاحب کی حکومت کے لیے کچھ اثر انگیز ثابت ہونے کے بجائے بھٹو حکومت، جمہوریت اور خود ذوالفقار علی بھٹو کی ذات کے لیے نقصان دہ ثابت ہونے والی تھیں۔ حقیقت خود ذوالفقار علی بھٹو کے بقول ''انہوں نے امیر اور غریب کے درمیان جس نام نہاد مفاہمت کی جو کوشش کی تھی، وہ ایک یوٹوپیئن خواب تھا'' (اگر مجھے قتل کر دیا گیا)۔ سیاسی طور پر درحقیقت

بھٹو مخالف کیمپ روز بروز اپنا دائرہ تنگ کر رہا تھا مگر بھٹو کے عالمی امیج نے اپوزیشن کے ارادوں کو دبا کر رکھ دیا تھا مگر اس عالمی کردار ہی کے سبب بھٹو کو ناپسند کرنے والی غیر ملکی قوتوں کو پاکستان کی اپوزیشن کے ساتھ معاملات طے کر کے ان کو اپنا آلۂ کار بنانے کے مواقع بھی پیدا ہو گئے۔ کچھ اسی قسم کی سیاسی تبدیلی، قیادت کا کرشماتی کردار، اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار لاطینی امریکہ کا ایک ملک چلی ہو چکا تھا۔ سلواڈور ایلاندے کا چلی جن حالات کا شکار 1973ء میں ہوا بھٹو کا پاکستان انہی حالات کا شکار 1977ء میں ہوا۔ 5 جولائی 1977ء تک جو نام نہاد بحران پیدا کیا گیا وہ چند ہی روز میں نہیں پھوٹ پڑا تھا بلکہ اس کے لیے بار بار کوششیں کی گئیں کہ کسی طرح پاکستان کو ترقی کی جدید راہوں اور قوم پرست پالیسیوں سے محروم کر دیا جائے۔

ستمبر 1973ء میں مصر و شام کے ساتھ اسرائیل کی جنگ نے دنیا بھر کو جھٹکا لگایا۔ اس کا خوف آج تک مغرب کے ممالک محسوس کر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں اقتصادی، عسکری اور سیاسی بالادستی کے حامل مغربی ممالک کو جب تیل پیدا کرنے والے مسلمان عرب ممالک نے تیل کی بندش کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تو اجارہ دار ممالک کے لیے یہ ایک زہریلا زخم تھا جس پر نکسن نے اپنی کتاب میں لکھا کہ ''تیل کے ہتھیار نے امریکہ بشمول مغربی ملکوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، جس کے سبب ہمارا مشینی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا اور ہم اس کی ذہانت پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے، جو عربوں کی اس حکمتِ عملی کے پیچھے اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔'' ذوالفقار علی بھٹو کے اس مشورے نے کمزور قوموں کو ایک نیا حوصلہ تو دیا ہی لیکن سامراج نے بھی اب اپنے دائرۂ کار میں اضافہ کا فیصلہ کیا۔ فروری 1974ء میں شاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی مرضی کے خلاف لاہور میں برپا ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس جنگِ ستمبر 1965ء کے بعد پاکستان کی قیادت کی دوسری عالمی کامیابی تھی جس میں پی ایل او کو باقاعدہ حکومتی رتبہ دے کر فلسطین کی آزادی اور اسلامی دنیا کے لیے ایک نئے آرڈر کا اعلان کیا گیا جو عالمی اجارہ داروں سے نجات کا سبب بن سکتا تھا لیکن مئی 1974ء میں جب بھارت نے راجستھان کے ایک علاقے کوٹہ میں ایٹمی دھماکہ کیا تو ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت نے اب اپنے تاریخی کردار کے لیے ایک نیا موڑ طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ بھارتی ایٹمی دھماکے نے خطے کی سیاست کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے اور دونوں ملکوں کے مابین تعلقات کی نوعیت ہی اب بدل گئی ہے۔ وزیرِ اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے اقوامِ متحدہ کی سکیورٹی کونسل کو اس سلسلے میں اپیل بھیجی کہ اس چیز کی نئی گارنٹیاں دی جائیں کہ

www.bhutto.org

ایٹمی قوتیں غیرایٹمی ملکوں کے لیے چیلنج نہیں بنیں گی۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر بھٹو نے تجویز دی کہ اقوام متحدہ جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دے لیکن بھارت کے ایٹمی دھماکے کے فوراً بعد ہی مسٹر بھٹو نے ایک نئی سفارتی مہم کا بھی آغاز کر دیا۔ اس سفارتی مہم میں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کو جدید ایٹمی ٹیکنالوجی میں داخل کرنے کی کوششیں تیز تر کر دیں۔ لیبیا کے معمر قذافی نے پاکستان کو ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے فوری طور پر چالیس ملین امریکی ڈالر کی امداد کا اعلان کیا۔ لیبیا کے علاوہ دیگر عرب ممالک نے ذوالفقار علی بھٹو کے منصوبے کے لیے اپنی اقتصادی، مالی، سیاسی اور اخلاقی حمایت غیر محسوس انداز میں شروع کر دی۔ مئی 1974ء میں ہی بھارتی وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے ایران کا دورہ کیا جس میں اندرا گاندھی نے امریکہ نواز شاہ ایران کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں بھارتی مدد کی پیشکش کی۔ 1974-75ء کے ایک سال کے عرصے میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے سفارتی مہم کے تحت نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے وسائل اور ذرائع میں کامیابی حاصل کی۔

جولائی 1974ء میں ترک افواج نے ترک قبرصی عوام کو یونانی ظلم و بربریت سے نجات دلانے کے لیے قبرص کے جزیرے میں یونان نواز افواج کو شکست دے دی۔ یونان اور ترکی دونوں امریکی عسکری معاہدے ناٹو کے اہم رکن تھے لیکن مغرب اور امریکہ میں یونان کے متعلق جوزم گوشہ تھا ترکی کے اس اقدام نے اسے بہت ٹھیس پہنچائی۔ ترکی کے وزیر اعظم بلند ایجوت نے ترکی کو جس عسکری اور سیاسی فتح سے ہمکنار کیا تھا اس سے خطے میں امریکی بالادستی کو مزید ایک جھٹکا لگا۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ترکی کے اقدام کی مکمل حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی مسلح افواج ترکی افواج کی مدد کے لیے ہر لمحہ تیار ہیں۔ اس کے بعد وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے سفارتی سطح پر یونان اور ترکی کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے کا بھی اعلان کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا روز بروز سیاسی کردار دنیا میں نمایاں ہوتا چلا جا رہا تھا جس کے سبب پاکستان ایک مضبوط دفاع کے ساتھ ساتھ نئے عالمی اقتصادی نظام کا بھی مطالبہ کر رہا تھا جس کے تحت اجارہ دار سرمایہ دار ممالک کے اقتصادی استحصال سے محفوظ رہا جا سکے۔ جون 1974ء میں مسٹر بھٹو نے ایٹمی پروگرام کو براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی ماہ فرانس کے ساتھ ایک ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے حصول کے لیے مذاکرات شروع ہوئے جبکہ متبادل پروگرام کے لیے ایک علیحدہ پلوٹونیم پلانٹ اپنے وسائل و ذرائع اور ٹیکنالوجی سے تعمیر کرنے کا بھی آغاز کر دیا گیا۔ یہاں پر یورینیم کی افزودگی کی جاتی تھی جبکہ بعد میں مارچ 1976ء میں فرانس اور پاکستان کے مابین ری پراسیسنگ پلانٹ

کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ ستمبر 1974ء میں حکومتِ پاکستان نے اپنے ایٹمی پروگرام کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اوپیک کی طرف سے تیل کی نئی اضافی قیمتوں کے بعد کیا گیا۔ اس ایٹمی پالیسی کے تحت ملک میں توانائی کے بحران کے حوالے سے جو منصوبہ بنایا گیا اس کے تحت 1980ء کی دہائی میں پانچ ایٹمی پاور پلانٹ اور پھر 1990ء کی دہائی میں ہر سال ایک پاور پلانٹ اور 2000ء تک ملک میں 24 ایٹمی پاور پلانٹ لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یقیناً یہ اقدام ایک جدید اور ترقی یافتہ پاکستان کا پیش خیمہ ثابت ہونے تھے لیکن مغربی طاقتیں پاکستان کی منتخب جمہوری حکومت کے ان فیصلوں سے سخت نالاں تھیں۔ فرانس کے صدر جسکارڈ پر شدید امریکی دباؤ تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو منسوخ کر دیں، جس کے تحت چشمہ میں ری پراسیسنگ پلانٹ کی تشکیل کا کام شروع ہو چکا تھا۔ کارٹر انتظامیہ اور سی آئی اے پاکستان کے منصوبوں کے خلاف بھرپور انداز میں متحرک ہونا شروع ہو گئیں۔ فرانس کے صدر جسکارڈ نے امریکی دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی دوران امریکی حکام نے پاکستان کو ان منصوبوں کے خاتمے کے بدلے متعدد فوجی ساز و سامان کی پُرکشش پیشکشیں بھی کر دیں۔ اگست 1976ء میں امریکی وزیرِ خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر ایران کے راستے پاکستان آئے جہاں انہوں نے وزیرِاعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ پاک امریکہ تعلقات اور پاک نیوکلیئر پروگرام کے حوالے سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر کسنجر نے مسٹر بھٹو کو ایٹمی پروگرام سے علیحدگی کے بدلے یہ پیشکش کی کہ امریکہ اس صورت میں پاکستان کو 800 ملین ڈالر کی امداد دے گا تاکہ پاکستان فرانس سے ہلکے پانی سے چلنے والے ریکٹر کی خریداری کر سکے۔ پاکستان کی فوجی امداد بحال کر دی جائے گی اور پاکستان جدید ترین 110 امریکی جنگی طیارے اے سیون خرید سکے گا۔ ڈاکٹر ہنری کسنجر نے اس سودے بازی سے انکار پر مسٹر بھٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "اگر آپ نے اپنا نیوکلیئر پروگرام منسوخ نہ کیا تو ہم آپ کو تیسری دنیا کے لیے عبرتناک مثال بنا دیں گے" جبکہ حکومتِ پاکستان کا مؤقف تھا کہ ہم اس وقت تک این پی ٹی پر دستخط نہیں کریں گے جب تک بھارت دستخط نہیں کرے گا اور اگر بڑی قوتیں جدید ایٹمی ٹیکنالوجی کے تحت اپنی ترقی و دفاع کے منصوبے تشکیل دے سکتی ہیں تو چھوٹی قومیں اس سے کیونکر محروم رہیں؟ مگر پاک امریکہ مذاکرات کے ساتھ امریکی پالیسی سازوں نے بھٹو حکومت کو "مزہ" چکھانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ اس مقصد کے لیے امریکیوں نے پاکستان کے اندر سے اپنے حمایتیوں کو اکٹھا کرنے کا آغاز کر دیا جبکہ مسٹر بھٹو نے اپنے اندرونی حمایتیوں کے علاوہ چالیس سے زائد ممالک کی حمایت کو اپنے ساتھ مزید جوڑنے کا عمل جاری رکھا۔ اس مقصد کے لیے مسٹر بھٹو نے

www.bhutto.org

کوشش کی کہ تیسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا کی سربراہ کانفرنس کے انعقاد کے لیے بھی بیرونِ ملک رابطے شروع کر دیئے۔ رومانیہ کے آنجہانی صدر چاؤشسکو اور کمبوڈیا نے مسٹر بھٹو کی تیسری دنیا کی سربراہ کانفرنس کی تجویز کی حمایت کر دی۔ جس کے لیے طے کیا گیا کہ پہلے وزرائے خارجہ کی کانفرنس کا انعقاد کیا جائے۔ علاقائی تنازعات کو حل کرنے کے سلسلے میں بھٹو حکومت نے افغانستان کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کے قدیم تنازع کے حل کے لیے بھی کوششیں تیز کر دیں۔ جس پر امریکہ کو شدید تشویش تھی۔

جون 1976ء میں مسٹر بھٹو نے اپنے کابل کے دورے کے دوران ڈیورنڈ لائن کے مسئلے پر بھرپور مذاکرات کے بعد افغان حکومت کے ساتھ اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ نیپ کے گرفتار راہنماؤں کی رہائی کی صورت میں ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیا جائے گا۔ صرف ایک نقطے پر اختلاف تھا۔ بھٹو چاہتے تھے کہ نیپ کے راہنماؤں کی رہائی اور بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنے کا معاہدہ بیک وقت کیا جائے جبکہ سردار داؤد نیپ کے راہنماؤں کی پہلے رہائی پر بضد تھے لیکن اصولی طور پر دونوں راہنما معاہدے کی نوعیت پر اتفاق کر چکے تھے۔ اسی دوران سی آئی اے حرکت میں آ گئی۔

3 ستمبر 1976ء کو امریکی اور برطانوی ماہرین کا ایک اہم اجلاس لندن میں منعقد ہوا جو سی آئی اے کے سربراہ جارج بش (بعد میں جارج بش امریکہ کے نائب صدر اور صدر منتخب ہوئے) کی زیرِ ہدایت کیا گیا۔ اس اجلاس میں بھٹو حکومت کے خاتمے کی حکمتِ عملی طے کی گئی جس کے پہلے مرحلے میں دیر اور چترال کے قبائل میں ہنگامے برپا کر کے پاک افغان ڈپلومیسی کو سبوتاژ کرنا شامل تھا تا کہ ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ دوبارہ کھٹائی میں چلا جائے۔ اس مقصد کے لیے قبائلی سرداروں اور ملاؤں میں امریکیوں نے ڈالروں کی ریل پیل کر دی۔ اسلام آباد میں پاکستان میں امریکی سازش کی حکمت عملیوں پر عمل کرنے کے لیے یورپ کے ایک چھوٹے ملک کے سفارتخانے کو مرکز بنا لیا جبکہ تہران میں امریکی سفارتخانے سے نکلنے والے جاسوسی کے کاغذات سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ سی آئی اے نے خصوصی طور پر ایک سیل تشکیل دیا تھا جس کا نام ''ڈیپارٹمنٹ آف ہائر انٹیلی جنس پاکستان پراسیسنگ ڈویژن'' رکھا گیا جس کا مقصد پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کو سبوتاژ کرنا تھا جبکہ مارچ 1976ء کو جنرل ضیاء الحق کو بری افواج کا چیف آف دی آرمی سٹاف مقرر کیا گیا جس نے اردن میں فلسطینی بغاوت کو کچلنے میں اپنا ''اہم رول'' ادا کر کے اردن کا اعلیٰ فوجی اعزاز ''کوکب استقلال'' حاصل کیا تھا۔ تقریباً ستمبر 1976ء میں ایک طویل پلان کے

www.bhutto.org

تحت غیر ملکی سازش نے پاکستان میں اپنا کام شروع کر دیا۔ شاہِ ایران کے ذریعے بھٹو حکومت کو وقت سے پہلے الیکشن پر آمادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی اور یوں جنوری 1977ء میں عام انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی پورا ملک ایک بھرپور سیاسی فضا میں داخل ہو گیا۔ منصوبے کے مطابق مذہبی اور سیکولر بھٹو مخالف سیاسی قوتوں کو اکٹھا کرنے کا اہتمام کیا گیا جس میں امریکی ڈالروں نے اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔ غیر ملکی سازش کے تحت عوام کو سڑکوں پر متحرک کرنے کے لیے مذہبی رنگ کا ہونا ضروری تھا لیکن ان کے اتحادی تاجر اور صنعتکار بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مسٹر بھٹو انتخابی مہم میں اپنے اقتصادی پروگرام، اسلامی دنیا اور تیسری دنیا کے نعرے کے ساتھ ساتھ اپنے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے میدان میں اترے جبکہ بھٹو مخالف پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) نے الیکشن سے پہلے مہنگائی اور بعد میں اسلامی نظام کے نعرے کے ساتھ سڑکوں پر اپنی طاقت کو اکٹھا کیا۔ پی این اے کے بانی مقبول ترین راہنما اور سیکرٹری جنرل رفیق باجوہ اس اتحاد اور حکمتِ عملی کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''پاکستان قومی اتحاد کا معرضِ وجود میں آنا خود پاکستان کے خلاف ایک غیر ملکی سازش تھی جس کے لیے ایک بائیں بازو کی جماعت کام کر رہی تھی۔ غیر ملکی حکومت کے اشارے پر اس جماعت نے ان جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جو کسی نہ کسی طرح پاکستان کے بننے کے خلاف تھیں۔ اس اتحاد کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان کی حکومت ان حکومتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دے جو ان کے مفادات کے خلاف کام کر رہی تھیں۔'' (19 مارچ 1982ء روزنامہ جنگ لاہور)

ذوالفقار علی بھٹو نے انتخابی مہم کے دوران ہی اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ ایک غیر ملکی سازش ان کی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور اپوزیشن اس غیر ملکی سازش کا ایک مہرہ ہے۔ انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کے بعد پی این اے نے مذہبی نعروں کے ساتھ عوامی تحریک کا اعلان کر دیا۔ پاکستان میں ڈالر کی قیمت حیرت انگیز حد تک گر گئی۔ جب پی این اے کے مظاہروں کے دوران کراچی میں ہنگامہ کرنے والوں کو گرفتار کیا گیا تو ان میں چھ ایسے عسکری کمانڈوز گرفتار ہوئے جن کو امریکیوں نے ایوب خان کے دور سے کاؤنٹر ریولیوشن قوت کے طور پر منظم کیا ہوا تھا۔ حکومت کے لیے یہ صورتحال یقیناً تشویش کا باعث تھی مگر ''آپریشن فئیر پلے'' بڑی احتیاط کے ساتھ چل رہا تھا۔ مسٹر بھٹو کو اپنے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق پر مکمل بھروسہ تھا کہ وہ حکومت کا ہر طرح سے وفادار رہے گا۔ اس بات کا اظہار دورانِ فسادات مسٹر بھٹو نے اپنی دوست اور شہنشاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کی بہن شہزادی اشرف پہلوی

سے بھی کیا جس نے مئی 1977ء میں مسٹر بھٹو سے پاکستان میں ملاقات کی۔

''آپریشن فیئر پلے'' کے تحت امریکیوں نے کوڈ جملے بھی طے کر لیے تھے جو مسٹر بھٹو کی حکومت کو اندر سے توڑنے سے متعلق تھے۔ اپریل 1977ء تحریک کے عروج کا مہینہ تھا۔ اس دوران جب 9 اپریل 1977ء کو لاہور کی شاہراہِ قائدِ اعظم پر حکومت کے خلاف مظاہرین پر تشدد ہوا تو طے شدہ پلان کے مطابق پنجاب کے ایک اہم صوبائی وزیر کا استعفیٰ دلوایا گیا۔ استعفیٰ دلوانے سے قبل لاہور میں متعین ایک امریکی سفارتکار نے اسلام آباد میں متعین ایک دوسرے امریکی سفارتکار کو فون پر خفیہ الفاظ میں اس ڈویلپمنٹ کی اطلاع یوں دی کہ ''پارٹی چلی گئی۔'' یہ وہی الفاظ ہیں جو بعد میں مسٹر بھٹو نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں پوری قوم کو بتائے۔ 19 اپریل کو امریکہ نے پاکستان کو آنسو گیس کی سپلائی روک دی۔ اپریل کے وسط میں ہی جنرل ضیاء الحق نے امریکی سفیر کو اپنے گھر رات کے کھانے پر دعوت دی، جس پر مسٹر بھٹو نے سختی سے نوٹس لیا کہ آرمی ہاؤس میں وزارتِ خارجہ کی پیشگی اجازت کے بغیر غیر ملکی سفارتکار کی دعوت حکومت کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہوسکتا ہے جبکہ امریکہ نے ایک بار پھر وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو سے گفتگو کے لیے رابطے کیے کیونکہ اپریل کے آخری ہفتے میں پی این اے کی تحریک نے طوالت کی وجہ سے دم توڑنا شروع کر دیا تھا جبکہ اپریل میں لاہور، حیدرآباد اور کراچی میں مارشل لاء کے نفاذ نے بھی بھٹو حکومت کی ساکھ کو متاثر کیا۔ پھر مئی کے شروع میں لاہور چھاؤنی کے ایک بڑے فوجی میس میں مسٹر بھٹو اور فوج کے اعلیٰ افسروں کا اجلاس ہوا جس میں بھٹو پر یہ دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مارشل لاء کو مزید پھیلا دیں۔ سازش کے اندرونی مہروں نے تو جو کردار ادا کیا وہ اپنی جگہ لیکن غیر ملکی مداخلت نے مسٹر بھٹو کو 'عبرتناک مثال' بنانے کے اقدامات تیزی سے اٹھانے شروع کر دیے۔ 28 اپریل کو مسٹر بھٹو نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں باقاعدہ طور پر غیر ملکی سازش پر بھرپور خیالات کا اظہار کیا جبکہ حکومت نے پچاس صفحات پر مشتمل غیر ملکی سازش کے تحت پاکستان میں کی جانے والی مداخلت پر ایک تفصیلی رپورٹ بھی لکھی۔ 28 اپریل کو امریکی وزیرِ خارجہ سائرس وانس نے مسٹر بھٹو کو مذاکرات کے لیے ایک خط بھی لکھا جس کے بعد نئے رابطوں کے لیے تیاری شروع کر دی گئی۔ وزیرِ خارجہ عزیز احمد امریکی وزیرِ خارجہ سائرس وانس سے مذاکرات کے لیے مئی میں پیرس روانہ ہوئے ان کے پاس پچاس صفحات پر مشتمل حکومتِ پاکستان کی وہ اہم رپورٹ بھی موجود تھی جس میں امریکہ کے پاکستانی سیاست میں مداخلت کے ثبوت موجود تھے لیکن مذاکرات سے پہلے عزیز احمد کے کمرے سے یہ رپورٹ چوری کروالی گئی۔ 9 مئی کو پاکستان میں مختلف شعبوں میں کام کرنے والے امریکی

www.bhutto.org

ماہرین نے کام کرنا بند کر دیا۔ 30 اپریل کو پی این اے نے پہیہ جام کی اپیل کی۔ اس پر مسٹر بھٹو نے واضح الفاظ میں کہا کہ ہمیں علم ہے یہ پلان کدھر سے لایا گیا ہے۔ یہ اصطلاح سراسر غیر ملکی اصطلاح ہے۔ بالکل اسی طرح سی آئی اے نے چلی میں (امریکہ مخالف منتخب سوشلسٹ لیڈر الانڈے کے خلاف) پہیہ جام کی ہڑتال کو پلان کر کے کامیاب کروایا تھا جس میں ٹرانسپورٹ کی ہڑتال اہم ترین عنصر تھا۔ انہی دنوں 6 مئی کو امریکی صدر جمی کارٹر نے سات ترقی یافتہ ممالک کی کانفرنس میں فرانس کے صدر جسکارڈ سے ملاقات کے دوران فرانسیسی صدر پر دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان کو دیئے جانے والے ایٹمی پلانٹ کے سودے کو منسوخ کر دیں۔ دونوں سربراہوں کے درمیان طے پایا کہ ایک اور ملاقات 9 مئی کو کی جائے گی اور یوں 9 مئی کو معاہدہ منسوخ کر دیا جائے گا اور فرانس کے نقصانات پورے کر دیئے جائیں گے۔ حکمتِ عملی کے مطابق سرکاری طور پر فرانس معاہدہ منسوخ نہیں کرے گا بلکہ سرکاری طور پر مناسب وقت پر معاہدے کے خاتمے کا اعلان کیا جائے گا۔ 8 مئی کو وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ 18 اپریل کو امریکی سفیر کے ساتھ تیسری اور آخری ملاقات کر کے پاکستان میں ہونے والی امریکی مداخلت پر بات کر چکے ہیں۔ اسی دوران امریکہ نے پاکستان کی اقتصادی اور دیگر امداد روک دی جبکہ پاکستان کو اقتصادی امداد دینے والے کنسورشیم نے بھی امداد دینے کا فیصلہ 26 جولائی کو ملتوی کر دیا۔ مئی کے مہینے میں پاکستان میں امریکہ کے ایک سابق سفیر نے پاکستان کا خفیہ دورہ کر کے اپوزیشن کے متعدد راہنماؤں سے خفیہ ملاقاتیں کیں۔ 23 مئی کو صدر کارٹر نے پاکستان کا مجوزہ دورہ منسوخ کرنے کا اعلان کیا اور بھارتی وزیرِاعظم مرارجی ڈیسائی کو پیغام بھیجا کہ وہ پاکستان کی بجائے جلد ہی بھارت کا دورہ کریں گے۔ 3 جون 1977ء کو امریکی دفترِ خارجہ کے نمائندے نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ پاکستان کو جدید امریکی طیارے اے سیون فروخت نہیں کیے جائیں گے۔ ان اقدامات کا مقصد ''آپریشن فیئر پلے'' کو کامیاب کرنا تھا۔ 20 جون کو ذوالفقار علی بھٹو نے ابوظہبی ٹیلی ویژن پر ایک انٹرویو کے دوران اس بات کا اعادہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تیسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کی جائے۔ 21 جون کو امریکی صدر کی رہائش گاہ وائٹ ہاؤس کے ایک اہم رکن چارلس ردکیف کا ایک خط شائع ہوا جس میں انہوں نے ناجائز منشیات کے امور اور صحت کے ڈائریکٹر پیٹر بورن کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ وزیرِاعظم بھٹو چند دن کے مہمان ہیں اور میری اس رائے کو امریکی نیشنل سکیورٹی کونسل کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا گیا کہ مسٹر بھٹو کے جانے کے بعد پاکستان سے آنے والی منشیات کی

www.bhutto.org

روک تھام کے منصوبوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جون کے وسط میں حکومت اور پی این اے کے درمیان اصولی طور پر معاہدہ ہو چکا تھا لیکن پی این اے میں شامل اصغر خان اور بیگم نسیم ولی خان نے حکومت کے ساتھ مذاکرات کو سبوتاژ کرنا شروع کر دیا۔ نئے مطالبات کے ساتھ تحریک کے دوبارہ آغاز کا اعلان کیا گیا۔ بیگم نسیم ولی خان نے چادر پھیلا کر مارشل لاء کے لیے دعائیں بھی کیں جبکہ اس سے قبل اصغر خان نے تینوں مسلح افواج کو اپنا کردار ادا کرنے کے لیے خط بھی لکھا جبکہ نہایت ہوشیاری سے 28 اپریل کو جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں حکومت سے وفاداری جتانے کے لیے تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا۔ جون کے وسط میں پی این اے سے مذاکرات کو نقصان پہنچنے کے عمل کے دوران مسٹر بھٹو ہنگامی طور پر عرب ممالک کے دورے پر روانہ ہوئے تا کہ امریکی منصوبوں اور سازش سے دوست ممالک کو آگاہ کیا جا سکے۔ چند ایک اطلاعات یہ بھی ہیں کہ اسی دوران وزیر اعظم بھٹو نے جنرل امتیاز کو خفیہ طور پر افغانستان کے راستے کابل روانہ کیا جہاں انہوں نے سابق سوویت یونین کے حکام کے ساتھ ملاقاتیں کیں تا کہ خطے کی بدلتی ہوئی صورتحال میں پاک سوویت تعلقات کو نئے انداز سے پرکھا جائے مگر نام نہاد آپریشن فیئر پلے اب عملی اقدام کا منتظر تھا۔ یہ کوئی نچلی سطح کی فوجی بغاوت نہیں تھی چند جرنیلوں کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں تھا حتیٰ کہ چیف آف جنرل سٹاف میجر جنرل عبداللہ ملک کو بھی آگاہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ خود ضیاء الحق کے بقول آئی ایس آئی کے ڈی جی جنرل جیلانی کو بھی جنرل ضیاء نے فون پر آپریشن کی اطلاع دی تھی۔ ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق جن اعلیٰ فوجی افسروں کو 5 جولائی کے آپریشن کا علم تھا وہ درج ذیل ہیں: جنرل ضیاء الحق، لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی، میجر جنرل کے ایم عارف، میجر جنرل ریاض خان، بریگیڈیئر امتیاز۔ اس کے علاوہ چند ایک دوسرے افسران بھی تھے جن کا تعلق پنڈی کور سے تھا۔ 4 جولائی کو شام کے وقت امریکی سفارتخانے میں امریکہ کے قومی دن کے موقع پر چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق وردی میں تقریب میں شامل ہوئے۔

"آپریشن فیئر پلے" سے قبل مسٹر بھٹو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جو رات کو دیر کے ساتھ نشر ہوئی۔ کانفرنس کے نشر ہونے کے بعد رات اڑھائی بجے وزیر اعظم ہاؤس میں فون کی گھنٹی بجی اور ضیاء الحق نے وزیر اعظم کو اطلاع دی کہ:

"آپ کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور اقتدار مسلح افواج نے سنبھال لیا ہے سر! ہم نوے دن کے لیے آئے ہیں۔ الیکشن کروانے کا کام فوج کرے گی اور اگر آپ دوبارہ منتخب ہو گئے تو ہم آپ کو سلیوٹ کریں

www.bhutto.org

گے۔آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔پارلیمنٹ توڑ دی گئی ہے اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔"

وزیراعظم ہاؤس میں متعین پرائم منسٹر گارڈ نے آئین کو توڑنے والوں کے خلاف وزیراعظم سے اجازت چاہی کہ مزاحمت کی جائے جس پر مسٹر بھٹو متفق نہ ہوئے۔ذرا توجہ دیجئے کہ ملک کا ریاستی ڈھانچہ اس قدر کمزور ہے کہ فقط پچاس پیسے کی ٹیلی فون کال پر عوام کے ووٹوں سے منتخب حکومت کا تختہ الٹا جا سکتا ہے۔مسٹر بھٹو نے تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو مارشل لاء حکام کی تحویل میں دے دیا۔

''آپریشن فیئر پلے'' کی تکمیل کا اعلان 5 جولائی کو ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کے دوران کیا جس میں وہ سخت کنفیوژ نظر آ رہا تھا۔امریکہ نے پاکستان میں مسلط کی جانے والی آمریت کو جلد ہی تسلیم کر لیا۔25 اگست کو امریکہ نے پاکستان کی اقتصادی امداد بحال کرنے کا اعلان کر دیا اور 26 اگست 1977ء کو یہ بھی کہا کہ اگر پاکستان ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا پروگرام منسوخ کر دے تو پاکستان کی فوجی امداد بھی بحال کر دی جائے گی۔23 اگست کو جنرل ضیاء الحق نے ایک پریس کانفرنس میں یہ بتایا کہ اسے فرانس کے صدر کا ایک خط موصول ہوا ہے۔اس خط سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ فرانس اب پاکستان کے ساتھ کیے گئے وعدے کو پورا نہیں کر سکتا۔''آپریشن فیئر پلے'' کے بعد جس تاریک دور کا آغاز ہوا وہ پوری قوم آج تک بھگت رہی ہے جس میں سیاسی تاریکی کے علاوہ اقتصادی، معاشی، عسکری، دفاعی تاریکی بھی شامل ہے۔جولائی 1977ء کے بعد ضیاء الحق سے لے کر آج تک پاکستان کی سیاست میں عوام کا کردار محدود تر کیا جا رہا ہے۔

www.bhutto.org

سفید ہاتھی اور اس کے ساتھی

2 جولائی 1977ء کو بھٹو حکومت نے پی این اے کے آخری دو مطالبات، بلوچستان سے فوج کی واپسی اور حیدر آباد ٹربیونل کے خاتمے کو بھی تسلیم کر لیا تھا۔ اب اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی جبکہ 3 جولائی کو جنرل ضیاء نے بحیثیت چیف آف آرمی سٹاف وزیر اعظم کو یہ یقین دلایا کہ:

"ہم تہہ دل سے آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے بازو ہیں اور آخر دم تک آپ کی مدد کریں گے۔"

لیکن آناً فاناً یہ 5 جولائی 1977 کو "آپریشن فیئر پلے" جو دراصل ایک فاؤل پلے تھا، نمودار ہوا جو یقیناً طویل منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ مارشل لاء کا نفاذ کوئی اتفاقیہ فیصلہ نہ تھا۔ جنرل چشتی کو وزیر اعظم بھٹو بحران کے وقت سے ہی شک کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کی شاہ سے بڑھ کر وفاداری کے نقاب کے پیچھے بغاوت کے عزائم چھپے ہوئے تھے۔ امریکی سفارت خانے کی سرگرمیاں بغاوت کے آثار کی عکاسی کر رہی تھیں۔ مسٹر بھٹو نے اس بات کا نوٹس بھی لیا تھا۔ جب مارشل لاء لگا تو امریکی حکومت نے اسے فوراً تسلیم کر لیا اور پی این اے مارشل لاء حکومت کے ساتھ تعاون کے ہراول دستے کے طور پر تیار کھڑی تھی۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جنرل ضیاء الحق نے شام کو ریڈیو اور ٹی وی پر تقریر کی جس میں مارشل لاء حکومت کے 90 دن کا نصب العین غیر جانب دار اور منصفانہ الیکشن کو قرار دیا۔ جنرل ضیاء نے کہا کہ چونکہ دونوں فریقین (پی این اے اور حکومت) کے درمیان بدگمانیاں بڑھ چکی تھیں اس لیے ہم غیر جانب دار حیثیت سے الیکشن کروائیں گے اور اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کر کے واپس بیرکوں میں چلے جائیں گے۔

"حقائق بہت دیر تک چھپے نہیں رہ سکتے۔ پچھلے چند ماہ کے تجربے سے اچھے بھلے لوگ بھی شک وشبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ آج صبح آپ نے سن لیا کہ فوج نے ملک وقوم کا نظم ونسق سنبھال لیا ہے یہ کوئی

www.bhutto.org

مستحسن اقدام نہیں کیونکہ فوج چاہتی ہے کہ ملک کی باگ ڈور عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو۔ عوام کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا جمہوری حق ہوتا ہے۔ جس کے لیے ہر جمہوری ملک میں انتخابات ہوتے ہیں۔"

''میں نے یہ چیلنج اسلام کے ایک سپاہی کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ میں عام انتخابات کراؤں گا جو انشاء اللہ اسی سال اکتوبر میں ہوں گے۔ انتخابات مکمل ہوتے ہی میں اقتدار عوام کے نمائندوں کے حوالے کردوں گا۔ آئندہ تین ماہ میں میری ساری توجہ صرف انتخابات پر ہوگی اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے میں اپنے اختیارات کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کروں گا۔ ملکی عدلیہ کے لیے میرے دل میں بے حد احترام ہے۔ میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ضروری احکامات جاری کروں گا لیکن عدلیہ کے اختیارات محدود نہیں ہوں گے۔"

(جنرل ضیاء الحق کی 5 جولائی 1977ء کی تقریر سے اقتباس)

جنرل ضیاء الحق نے تقریر کے آغاز میں قرآن پاک کی تلاوت کر کے ایک پاک باز اور وعدہ پرور مومن بننے کی کوشش کی۔ جنرل ضیاء الحق نے ایک ایسا تأثر قائم کرنے کی کوشش کی کہ لوگ مذہبی لحاظ سے جنرل ضیاء الحق کے متعلق اچھے مسلمان کی رائے قائم کریں۔ مُلاؤں نے جنرل ضیاء کا بھرپور ساتھ دیا۔

دنیا میں جہاں بھی آمر نے جمہوریت کا گلا گھونٹ کر اقتدار سنبھالا تو اس نے یہی کہا کہ ملک کے وسیع تر مفادات کی خاطر، مستقل جمہوریت کے قیام کی خاطر آمریت مسلط کی گئی ہے۔ جنرل ضیاء نے 5 جولائی 1977ء کو اپنی حکومت کو صرف نوے دن کی عبوری حکومت کہلوایا جس کا مقصد صرف غیر جانبدارانہ الیکشن منعقد کروانا تھا لیکن یہ سب کچھ جھوٹ ثابت ہوا۔ اسلام کا نام لے کر جنرل ضیاء نے جو وعدے کیے، سو فیصد ان کی مخالف سمت میں سفر کیا۔ عدلیہ کے ساتھ جو زیادتیاں کی گئیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ جنرل ضیاء کا ''مومن پن'' جھوٹ تھا۔ عدلیہ اور جمہوری حقوق سلب کر لیے گئے۔ جنرل ضیاء الحق کی 5 جولائی 1977ء کی تقریر کے دعوے اور قریباً گیارہ سالہ دورِ حکومت ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ''نیوز ویک'' نے جنرل ضیاء سے ایک انٹرویو لیا۔ ''نیوز ویک'' کا سوال تھا کہ ''جنرل ایوب نے بھی یہی کہا تھا کہ میں ایک سپاہی ہوں چنانچہ سپہ گیری کے لیے واپس چلا جاؤں گا لیکن وہ دس سال تک پاکستان کا حکمران رہا۔'' تو جنرل ضیاء نے اس سوال کے جواب میں کہا، ''انتخابات کے بعد آپ پھر مجھ سے ملیے۔ آپ کو اس بات کی تصدیق ہو جائے گی کہ جو کچھ میں نے کہا سچ تھا۔'' جب کہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو ایک انٹرویو کے دوران جنرل ضیاء نے کہا، ''28 اکتوبر کو

www.bhutto.org

اقتدار کی منتقلی ہو جائے گی۔"

جنرل ضیاء الحق نے وعدہ کیا کہ قومی اسمبلی کے الیکشن 18 اکتوبر کو ہوں گے۔ سیاسی جماعتوں نے اس میں حصہ لینے کے لیے انتخابی مہم بھی چلا دی۔ وہ بڑے بڑے جمہوریت پسند جو مسٹر بھٹو کو تنقید کا نشانہ بنایا کرتے تھے مارشل لاء کا دستِ راست بن بیٹھے۔ قومی اتحاد کے راہنما جو اپنی مقبولیت پر بڑے نازاں تھے، جنہوں نے بڑے بڑے انتخابی جلسوں کے بعد اپنی کامیابی کا اعلان کیا تھا اور انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا تھا، وہ انتخابات سے خائف ہو گئے۔ ان راہنماؤں نے الیکشن ملتوی کرنے اور پھر احتساب کا مطالبہ کیا تاکہ پی پی پی کو سیاست سے دور کیا جائے اور مارشل لاء کا حصہ دار بن کر اپنی سیاست چمکائی جائے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی عوامی مقبولیت کا خوف جمہوریت کے علمبرداروں کے سروں پر مسلط تھا۔ سابق نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ شیر باز خان مزاری جو پی این اے کے چوٹی کے راہنما گنے جاتے تھے، کا ایک بیان توجہ طلب ہے جو تمام اخبارات میں یکم اکتوبر 1977ء کو چھپا کچھ یوں تھا کہ:

کوئٹہ 30 ستمبر (اپ پ) نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ سردار شیر باز خان مزاری نے کہا ہے کہ اگر قوم کے وسیع تر مفاد کی خاطر انتخابات ملتوی کر دیئے جائیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر حالات انتخابات کے التوا کا تقاضا کرتے ہیں تو پھر اس کا فیصلہ 10 اکتوبر تک کر دیا جائے گا۔ مسٹر مزاری نے پشین میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اسمبلیوں سے زیادہ قوم کے مفادات عزیز ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم انتخابات کے التوا کی زبردست حمایت کریں گے۔ واضح رہے کہ کل جنرل ضیاء نے اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ لیڈر نجی محفلوں میں تو ان سے انتخابات ملتوی کرانے کی باتیں کرتے ہیں لیکن کھلے عام انہیں یہ باتیں کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے مگر آج سردار شیر باز مزاری نے شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انتخابات ملتوی کرنے کی حمایت کر دی ہے۔ جب سردار شیر باز مزاری سے دریافت کیا گیا کہ ایسے کیا حالات وقوع پذیر ہو گئے ہیں کہ اب انتخابات کا التوا ناگزیر ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یقیناً حکومت کے پاس ایسی معلومات ضرور ہوں گی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئر پرسن بیگم نصرت بھٹو اور ان کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو اپنے جلسوں میں ایسی تقاریر کر رہی ہیں کہ جن سے عوام کے

جذبات بھڑ کتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حال ہی میں مس بے نظیر بھٹو نے یہ دھمکی دی ہے کہ پنجاب کے پانچوں دریا خون سے سرخ ہو جائیں گے۔ ایسے بیانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ بات انہوں نے مشروط طور پر کہی تھی اور کہا گیا تھا کہ اگر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو پھر ایسا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ شیر باز مزاری نے احتساب کے موجودہ عمل پر بے اطمینانی کا اظہار کیا۔''

سردار شیر باز مزاری کے ان خیالات سے مارشل لاء کے ان ساتھیوں اور مددگاروں کی پوزیشن واضح ہوتی ہے کہ جنرل ضیاء الحق تو الیکشن ملتوی کرنا چاہتے تھے مگر ان کے ساتھ ساتھ پی این اے کے راہنما بھی یہی خواہش رکھتے تھے اور جنرل ضیاء کی خواہش یہ تھی کہ پی این اے کے راہنما ہی طور پر تو الیکشن ملتوی کروانے کے مشورے دیتے ہیں لیکن عوامی سطح پر اس کا اظہار نہیں کرتے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل ضیاء چاہتے تھے کہ پی این اے کے راہنما کھلے بندوں بھی الیکشن کے التوا کا مطالبہ کریں تاکہ کھیل صحیح طریقے سے کھیلا جا سکے۔ یہ راہنما جو قوم کے ''وسیع تر مفادات'' کی خاطر جمہوریت کو قربان کرنے چل پڑے تھے، وہ کسی طرح بھی جنرل ضیاء کے عزائم سے مختلف عزائم نہ رکھتے تھے۔ جنرل ضیاء نے بھی قوم کے ''وسیع تر مفاد'' کی خاطر جمہوریت ختم کی اور ملک پر مارشل لاء مسلط کر دیا۔ مارشل لاء کے نفاذ اور جمہوریت کے خاتمے سے ''وسیع تر قومی مفادات'' جو سامنے آئے ہیں وہ علیحدگی اور ملک کی جغرافیائی توڑ پھوڑ کے پروگرام کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جہاں بھی مارشل لاء لگا ہے وہاں وسیع تر قومی مفادات کا بہانہ بنایا گیا ہے لیکن مارشل لاء نے قومی مفادات کو ہمیشہ ہی نقصان پہنچایا ہے۔ پی این اے نے آمریت کو خوش آمدید ہی نہیں کہا بلکہ اس کے ہاتھ بھی مضبوط کیے۔ پہلے 1977ء کے انتخابات کے نتائج کو قبول نہ کیا اور ملک میں سیاسی بحران پیدا کیا گیا پھر مارشل لاء لگوایا اور پھر اس کے بعد انتخابات ملتوی کروائے۔ یہ تمام منصوبہ بندی ''آپریشن فیئر پلے'' کے تحت کی گئی تھی جس کے تحت فوج اور اپوزیشن راہنماؤں کے گٹھ جوڑ، بھٹو حکومت کے خلاف ہنگامے جن میں فوج کے تربیت یافتہ کمانڈوز شامل ہوتے تھے اور اس کے بعد بھٹو حکومت معزول کر کے مارشل لاء کا نفاذ پھر مارشل لاء کے ساتھ تعاون اور احتساب کا مطالبہ، اس کے بعد قانون کی بالادستی کا نعرہ لگا کر معزول وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو تختۂ دار تک لے جانے کے سامان پیدا کرنا، یہ سب کچھ غیر ملکی شہ پر ہو رہا تھا۔ یہ مُلّا، پی این اے کے راہنما، جرنیل، جاگیردار اور سرمایہ دار سفید ہاتھی کے ساتھی ثابت ہوئے اور انہوں نے سفید ہاتھی کی خواہشات کی تکمیل

کے لیے سب کچھ کیا۔ یہ سفید ہاتھی صرف سابق وزیر اعظم کی حکومت کا ہی خاتمہ نہ چاہتا تھا بلکہ وہ بھٹو کو جسمانی اور سیاسی طور پر بھی ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

پی این اے کے راہنماؤں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بھٹو پر بدعنوانی کا مقدمہ چلایا جائے۔ بھٹو کے خلاف جنرل ضیاء کا رویہ ڈپلومیسی پر مبنی تھا۔ پہلے پہل اس نے اس قسم کے بیانات دیئے جس سے یہ شبہ نہ ہونے دیا گیا کہ جنرل ضیاء الحق سابق حکومت کے سربراہ کے خلاف مقدمات چلانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جنرل ضیاء نے کہا کہ یہ سب کام آئندہ منتخب حکومت ہی کرے گی۔ بھٹو کے خلاف پی این اے نے جو تاثر قائم کرنے کی کوشش کی وہ اس وقت ساری بے کار گئی، جب مسٹر بھٹو مری کی نظر بندی کے بعد اگست 1977ء میں لاہور تشریف لائے تو لاکھوں عوام مسٹر بھٹو کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ حکومت نے مسٹر بھٹو کے ٹرین پر سفر کرنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ وہ لاہور ایئر پورٹ سے رات بارہ بجے صادق حسین قریشی کے گھر پہنچے۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور خواتین ہر کوئی اپنے قائد کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ پہلے تو حکومت نے فضا میں ہی طیارے کو اڑتے رہنے دیا پھر جب طیارہ نیچے اترا تو حکومت نے مسٹر بھٹو کو ائیر پورٹ پر دانستہ روکے رکھا۔ یہ ایک شاندار عوامی استقبال تھا۔ حکومت اور پی این اے کے راہنما یہ سب کچھ دیکھ کر بوکھلا گئے۔ اسی استقبال کے بعد حکومت نے مسٹر بھٹو کے ساتھ سخت پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

3 ستمبر 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو جس انداز میں گرفتار کیا گیا اس نے شروع ہی میں حکومت کے "چادر اور چار دیواری" کے تحفظ کے نعرے کا پول کھول دیا۔ مسٹر بھٹو کی گرفتاری نواب محمد احمد خان کے قتل کے سلسلے میں کی گئی تھی۔ ملک کے سابق وزیر اعظم کی گرفتاری جس انداز سے کی گئی اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ مسٹر بھٹو کی 70 کلفٹن کراچی سے گرفتاری کی تفصیل دوسرے دن بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے پریس کو بتائی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مارشل لاء حکومت نے کتنے بے ہودہ حربے استعمال کیے۔

"جناب بھٹو سحری کھا کر سوئے ہی تھے تو ان کی خواب گاہ کی بتی جلی اور انہوں نے دیکھا کہ تین چار اجنبی ان کے سروں پر کھڑے تھے۔ ان مسلح آدمیوں نے جن کے ہاتھوں میں سٹین گنیں اور مشین گنیں تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے نشہ بھی کر رکھا تھا اور بار بار اچھل رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کر دور پھینک دیا اور کریڈل توڑ دیا۔ اس بدمعاش کو دیکھ کر قائد عوام نے پوچھا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ جواب ملا ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ جناب بھٹو نے فرمایا کہ کوئی وارنٹ ہے؟ جواب ملا نہیں۔ اس کے

www.bhutto.org

بعد جناب بھٹو نے پوچھا کہ اسی طرح چلوں یا کپڑے تبدیل کرلوں تو انہوں نے کہاہاں کپڑے تبدیل کر لیں۔اس کے بعد تمام اہلِ خانہ کو سٹین گن دکھاتے ہوئے نیچے لے جایا گیا۔نوکروں کو بھی کھڑا کردیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بے نظیر بھٹو اور صنم بھٹو کے بیڈ روم میں بھی بلا اجازت داخل ہو گئے۔ جہاں پر ہم دونوں سوئی ہوئی تھیں۔ان لوگوں کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔ جنہوں نے تمام گھر کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ یہ "ڈاکو" جورات کی تاریکی میں گرفتار کرنے آئے تھے۔ان میں سے کچھ نے نیچے خاکی پتلون بھی پہن رکھی تھی۔ چار بجے صبح کے قریب یہ لوگ گھر میں گھسے اور پانچ بج کر بیس منٹ پر یہ لوگ ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر کے لے گئے۔ یہ لوگ مرتضیٰ بھٹو کے کمرے سے آرائشی تلواریں بھی اتار کر لے گئے۔"

گرفتار کرنے کا یہ طریقہ بڑا منفرد ہے۔ جنرل ضیاء نے 8 ستمبر کو یہ تسلیم کیا کہ مسٹر بھٹو کی گرفتاری ان کے حکم پر کی گئی ہے۔لہٰذا یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ "اندازِ گرفتاری" بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ایماپر اپنایا گیا جو "چادر اور چاردیواری" کے تحفظ اور اسلام کا بہت بڑا دعویدار اور مومن تھا۔

مسٹر بھٹو کی گرفتاری کو عوام نے شدید ناپسند کیا۔بھٹو کی گرفتاری سے عوام کے جذبات مجروح ہوئے۔عوام کے جذبات کو جاننے کے لیے تین واقعات بڑے اہم ہیں جو گرفتاری کی خبر کے بعد سامنے آئے۔کراچی کا ایک نوجوان ادریس چاند اس خبر کو برداشت نہ کرسکا اور جاں بحق ہو گیا۔حیدرآباد کی ایک عورت بھی اس گرفتاری کے غم میں انتقال کر گئی۔لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کا ایک شخص غنی اس واقعہ سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اسلامی نظام کے دعوے دار آمر حکومت کے رویے کے خلاف احتجاج کے طور پر مسٹر بھٹو کے غم میں اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔ یہ واقعات مسٹر بھٹو کی مقبولیت غریب عوام کی طرف سے ان کے پیار اور جذبات کا اظہار ہیں۔

مسٹر بھٹو کی گرفتاری کے بعد پی پی پی کی قیادت بیگم نصرت بھٹو کے ہاتھ میں آ گئی۔اسی دوران حکومت اور پی این اے نے مل کر بھٹو کی کردارکشی کے لیے دن رات ایک کردیئے کہ کسی طرح مسٹر بھٹو کی شخصیت کو مجروح کیا جائے۔اس سلسلے میں مسٹر بھٹو کے خلاف پچاس کے قریب مقدمات تیار کیے گئے۔ چیف الیکشن کمشنر مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کے خلاف کھل کر تعصب کا مظاہرہ کیا جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس جو مسٹر بھٹو کی صدارت میں ہوا۔انہوں نے حکومت سے مطالبہ بھی کیا کہ اس کو برطرف کیا جائے کیونکہ اس نے ایک پریس کانفرنس کے دوران پی پی پی کے خلاف بیان دیا ہے،جس سے جسٹس مشتاق کی پوزیشن درست نہیں رہی لیکن حکومت تو ہر قسم کے اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو بالائے طاق

رکھ کر مسٹر بھٹو کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی حالانکہ جنرل ضیاء نے 14 جولائی کو ایک پریس کانفرنس کے دوران یہ کہا تھا کہ:

"فوج کسی سیاستدان کے خلاف کارروائی نہیں کرے گی۔ فوجی کونسل کا یہ واضح فیصلہ ہے کہ چاہے کسی فرد کے غلط کرتوتوں کے بارے میں سو فیصد یقین ہو جب بھی اس کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ یہ عوام کے نمائندوں کا کام ہے کہ وہ کسی فرد کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کریں اور عوام کا بھی یہ کام ہے کہ وہ اس کا نوٹس لیں۔ رائے دیتے وقت بہتر فیصلہ کریں۔ جہاں تک فوج کا تعلق ہے وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ لوگ آزادانہ طور پر اپنا حق رائے دہی، پرامن پرسکون و سازگار ماحول میں استعمال کریں۔ مسلح افواج کا بنیادی مقصد صرف اور صرف اکتوبر میں آزادانہ انتخابات کروانا ہے۔"

جس دن جنرل ضیاء اپنے الیکشن کے وعدے سے بھاگ رہا تھا، اسی دن فوجی حکومت کا نمائندہ آغا شاہی اقوامِ متحدہ میں دنیا بھر کے نمائندوں کے سامنے اپنی حکومت کا وعدہ دہرا رہا تھا کہ منصفانہ انتخابات کے ذریعے اقتدار طے شدہ تاریخ تک منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ یکم اکتوبر 1977ء کو جنرل ضیاء نے "وسیع تر قومی مفادات" کی خاطر انتخابات ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی اور اب یہ وعدہ کیا کہ الیکشن کی نئی تاریخوں کا اعلان عدالتوں کے فیصلوں کے بعد کیا جائے گا۔ دراصل جنرل ضیاء الحق وہ مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا کہ جس کے لیے اس نے ملک میں آمریت مسلط کی تھی۔ وہ امریکہ کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اقتدار پر جھپٹا تھا اور اب ان ہی مخصوص مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمات تیار کر لیے تھے۔ جنرل ضیاء بڑا عیار انسان تھا جو اپنے پروگراموں کو ٹھنڈے دل سے عملی جامہ پہناتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں اور تمام بھٹو مخالف سیاستدانوں کی بھرپور حمایت حاصل کر لی تھی جو درحقیقت مسٹر بھٹو کو سولی پر لٹکتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کے ارادوں کو جاننے کے لیے ہمیں مسٹر بھٹو کے عدالتی بیانات کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کئی حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ جنرل ضیاء کے ساتھیوں میں ایسے ساتھی بھی تھے جو مسٹر بھٹو کے قریبی جانے جاتے تھے لیکن حقیقت میں وہ سامراج کے گماشتے تھے۔

7 جولائی 1977ء کو مری میں جب جنرل ضیاء نے جناب بھٹو کے ساتھ نظر بندی کے دوران ملاقات کی تو اس وقت چشتی بھی ضیاء کے ہمراہ تھا۔ دونوں جرنیلوں کا ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ رویہ بڑا نرم تھا اور انہوں نے اس ملاقات کے دوران جناب بھٹو کو یہ مکمل تاثر دینے کی کوشش کی کہ ہمارا رویہ آپ کے

www.bhutto.org

ساتھ کسی طرح جانبدارانہ نہیں۔ اسی طرح جیسے مارشل لاء لگنے سے چند گھنٹے قبل تک ضیاء جناب بھٹو سے بحیثیت چیف آف آرمی سٹاف وفاداری کا یقین دلاتا رہا تاکہ وزیر اعظم کو کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو حالانکہ خود بعد میں جنرل ضیاء نے یہ تسلیم کیا کہ:

''ملک کے نظم ونسق کو اپنی گرفت میں لینے کا منصوبہ ایک ماہ پہلے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا اس سارے منصوبے کا مقصد یہ ہے کہ ملک میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرائے جائیں۔''

(امریکی صحافی کو انٹرویو روزنامہ امروز 10 جولائی 1977ء)

یعنی ایک ماہ قبل منصوبے پر عمل شروع کر دیا گیا تھا جبکہ منصوبہ کافی عرصہ پہلے سے تیار تھا۔ جب تک ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف من گھڑت مواد تیار کیا جاتا رہا اس عرصہ کے دوران جنرل ضیاء اور اس کے ساتھیوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت میں خوب بیانات دیے۔ 5 جولائی 1977ء کے بعد جنرل ضیاء کی جناب بھٹو کے ساتھ مختلف اوقات میں تین ملاقاتیں ہوئیں۔ حکومت کی تمامتر کوشش یہ تھی کہ جناب بھٹو کو مکمل طور پر دھوکہ دیا جائے اور ان کو یہ شائبہ تک نہ ہو کہ حکومت کے ''اصل مقاصد'' کیا ہیں۔ تاہم جناب بھٹو ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ وہ کسی ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ مارشل لاء حکومت ان کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتی ہے۔

جنرل ضیاء، امریکہ اور اس کے گماشتوں کو جاننے کے لیے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ امریکی ایجنٹس جو دوست کے روپ میں بھٹو حکومت میں شامل تھے، ان کی چالبازیاں کتنی بھیانک ہیں اور انہوں نے پاکستان کے خلاف بین الاقوامی سازش میں پی این اے کے ہنگاموں سے ہٹ کر عوامی حکومت کے اندر رہ کر امریکی مفادات اور اس سازش کا کس طرح ساتھ دیا اور اس کام کو کتنی احتیاط کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس حوالے سے مولانا کوثر نیازی کو ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہی مولانا نیازی جناب بھٹو کی اس مذاکراتی ٹیم کے بھی اہم رکن تھے جو پی این اے کے ساتھ مذاکرات کر رہی تھی۔ مثلاً جناب بھٹو کا بیانِ حلفی دیکھیں تو بات کچھ واضح ہوتی ہے۔ یہ درخواست جناب بھٹو نے 6 مارچ 1978ء کو لاہور ہائیکورٹ میں دی۔ بیان کے ایک پیراگراف سے ہمیں حالات سے آگاہی ہوتی ہے:

''میں اس رپورٹ کے حوالے سے بعد میں بات کروں گا لیکن اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہوگا کہ راولپنڈی میں 28 اگست 1977ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے

www.bhutto.org

ملاقات کے دوران جس میں جنرل چشتی بھی موجود تھا، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے مولانا کوثر نیازی کے بارے میں شدید برہمی کا اظہار کیا۔ اپنے مخصوص انداز میں اس نے مولانا پر بے رحمانہ حملے کیے اور اس نے نیازی کے خلاف زبردست نفرت کا اظہار کیا۔ چنانچہ گفتگو کے اختتام پر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے یہ الفاظ تھے اس آدمی کو نہیں چھوڑوں گا۔ 28 اگست 1977ء کو مولانا کوثر نیازی کے خلاف اس قدر تعصب کے اظہار کے بعد یہ کیسے ممکن ہوا کہ 14 ستمبر 1977ء کی انٹیلی جنس رپورٹ میں اس کا ذکر پسندیدگی کے ساتھ کیا گیا۔"

دراصل جنرل ضیاء نے اس ملاقات میں جناب بھٹو کو کوثر نیازی کے خلاف ایسا تاثر اس لیے دیا کہ کوثر نیازی کو مارشل لاء حکومت کی نظر میں بدترین شخص ثابت کیا جائے کہ جس کے دل میں کوثر نیازی کے لیے کوئی مقام نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے جناب بھٹو کی حمایت میں مقدمات قائم کرنے سے پہلے مارشل لاء حکومت نے بیانات دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مارشل لاء حکام اپنے اصولوں جو اس نے 5 جولائی کو مارشل لاء لگاتے وقت وضع کیے تھے، ان پر چلتے ہوئے غیر جانبدار رہے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ حقیقت میں جنرل ضیاء کوثر نیازی کے خلاف سخت زبان استعمال کر کے جناب بھٹو کے دل میں کوثر نیازی کے اعتماد و ساکھ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ (کوثر نیازی) جب تک ممکن ہو سکے، مارشل لاء کے مفادات کی تکمیل کے لیے کام کرتا رہے اور ایسا ہی ہوا۔

کوثر نیازی نے ایک سازش کے تحت پیپلز پارٹی کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کی جو کہ ضیاء حکومت کے ایماء پر کی گئی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ کوثر نیازی نے جناب بھٹو، بیگم نصرت اور بے نظیر بھٹو پر خوب کیچڑ اچھالا اور بھٹو کو پھانسی کے بعد کوثر نیازی حکومت کے ایما پر ہندوستان گیا جہاں اس نے بھٹو کی پھانسی کو درست فیصلہ ثابت کرنے کی کوشش کی، سابق عوامی حکومت میں کیڑے نکالے اور فوجی آمریت کی حمایت کی اور بعد میں کوثر نیازی جنرل ضیاء کی خصوصی دلچسپی کی بنا پر سینیٹر بھی بن گیا۔

جبکہ جناب بھٹو نے 28 اپریل 1977ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کے دوران انکشاف کیا تھا کہ پاکستان کو توڑنے کی ایک بین الاقوامی سازش تیار کی گئی ہے اور پی این اے کے ہنگامے اسی سازش کا ایک حصہ تھے۔ جناب بھٹو اپنی اسی درخواست کے پوائنٹ نمبر 101 میں فرماتے ہیں (یہ درخواست ہائی کورٹ میں دی گئی تھی):

www.bhutto.org

''میں نے یہ الزام عائد کیا تھا کہ مجھے ایک بین الاقوامی سازش کے ذریعے اقتدار سے ہٹایا گیا۔ اگر فروری 1978ء میں بھارتی وزیرِ خارجہ کے دورۂ پاکستان اور دسمبر 1977ء اور جنوری 1978ء کے بعد برِصغیر پاکستان و بھارت میں تیزی سے رونما ہونے والے واقعات اور اگست 1977ء میں جوزف نائے کے خفیہ دورۂ پاکستان کے بعد بھی پاکستان کے خلاف بین الاقوامی سازش کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے تو پھر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اندھا پن بصارت ہے اور بصارت کا نام اندھا پن ہے۔''

ان حقائق کی روشنی میں جناب بھٹو کے خلاف مقدمہ کو دیکھا جائے تو یہ مقدمہ اسی سازش کی ایک کڑی ہے اور پھر مارشل لاء حکومت کا ساتھ دینے والے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ان کا ماضی ان کا سیاسی کردار ہم سب کے سامنے ہے۔ ان کی طرف سے مارشل لاء کا خیر مقدم کرنا اور پھر جمہوری دعوے بلند کرنے والے راتوں رات مارشل لاء کو نجات دہندہ قرار دینے لگے۔ یہ ایسی تیز اور ترش حقیقتیں ہیں جن کو عوام کسی صورت میں بھی بھلا نہیں سکتے۔

مسٹر بھٹو کا چالان جو لاہور کے ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں بھیجا گیا تھا، ایک دم اسے سیشن جج لاہور کی عدالت میں بھیج دیا گیا اور پھر اس کے بعد مولوی مشتاق حسین نے اس کو اپنی عدالت میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا حالانکہ یہ چالان ابھی نامکمل تھا۔ جب مسٹر بھٹو نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انہوں نے برملا کہہ دیا کہ ''میرے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا۔''۔۔۔۔ مسٹر بھٹو تو دورِ وزارتِ عظمیٰ میں ہی بھانپ گئے تھے کہ ان کے خلاف ایک غیر ملکی سازش کارفرما ہے۔ لہٰذا ان حالات نے مسٹر بھٹو پر واضح کر دیا کہ اب پھانسی دینے کے لیے ''قانونی تقاضے'' پورے کیے جائیں گے جبکہ جسٹس کے۔ ایم صمدانی نے بھٹو کو 13 ستمبر کو ضمانت پر رہا کر دیا لیکن بعد میں لاہور ہائی کورٹ نے مسٹر بھٹو کی ضمانت منسوخ کر دی۔

مسٹر بھٹو کے یہ الفاظ کہ ''میرے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا'' مقدمے کے آخری فیصلے تک مسٹر بھٹو کا تجزیہ تھا۔ عدالت کو ہمیشہ ہر آمر نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے وقت کے انقلابیوں کو سزاوار ٹھہرایا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے خلاف مقدمے کے دفاع کے دوران عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا

اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور ناانصافی دونوں کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

''تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیانِ مذاہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت ایسی نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہدِ قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنۂ وسطیٰ کی پراسرار ''انکویزیشن'' وجود نہیں رکھتیں لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے ان سے ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جن کے اندر اسرار بند تھے لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خودغرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں؟''

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کل کے جابر حکمرانوں کے مجرم دراصل انسانیت اور امن و انصاف کے علم بردار تھے جن کو انصاف گاہوں سے قتل گاہوں کی طرف لے جایا گیا۔ ''قانونی قتل'' کا مقصد آمر کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ ''مجرم'' کو سیاسی طور پر بھی ختم کر دیا جائے لیکن تاریخِ انسانی میں جابر حکمران اور سزا سنانے والے مجرم ٹھہرائے گئے اور سولیوں پر جھولنے والے حق گو اور زہر کا پیالہ پینے والے تاریخ کے انمٹ کردار بن گئے۔

مسٹر بھٹو کو لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس مولوی مشتاق حسین کی عدالت میں پیش کیا گیا اور ان کے ساتھ ایسا ''خصوصی رویہ'' اپنایا گیا جس سے زیادہ سے زیادہ مسٹر بھٹو کی تذلیل ہو۔ اس مقصد کے لیے لاہور ہائی کورٹ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کٹہرا بنوایا گیا۔ مسٹر بھٹو کو ''بڑا ملزم'' قرار دیا گیا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے اس ''تذلیل آمیز رویے'' پر اعتراض کیا تو جسٹس مشتاق نے طنزیہ انداز میں کہا کہ ''ہمیں معلوم ہے کہ آپ بڑے آرام طلب اور آسائشوں سے لبریز زندگی گزارنے کے عادی ہیں لہٰذا اسی لیے ہم نے کٹہرے میں کرسی رکھوا دی ہے جس پر آپ بیٹھ سکتے ہیں۔'' کٹہرے کے اردگرد خفیہ پولیس کے آدمی کھڑے کر دیے گئے تاکہ مسٹر بھٹو اپنے وکلاء سے آزادانہ طور پر مشورہ بھی نہ کر سکیں۔ عدالت کے یہ انداز جانبداری اور تعصب کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ دوسری جانب حکومت مسٹر بھٹو کے خلاف کردار کشی کا سیلاب

www.bhutto.org

لے آئی۔ کروڑوں روپیہ خرچ کر کے مسز بھٹو کے خلاف وائٹ پیپر کی تیاری شروع کی گئی۔ ٹی وی پر "ظلم کی داستانیں" کے نام سے خصوصی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے گئے۔ اخبارات نے مسز بھٹو کی کردار کشی میں جو کردار ادا کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ملک بھر کی مساجد سے اور پی این اے کے راہنماؤں نے اپنی تقاریر کے دوران بھٹو کی پھانسی کا مطالبہ کیا۔ پراپیگنڈے میں مسز بھٹو کے عوامی دور کو آمریت کا دور قرار دیا گیا جس میں یہ الزام لگایا کہ پارلیمنٹ کے اراکین کو اسمبلی سے باہر پھینکوایا گیا جبکہ برطانیہ و ہندوستان میں ایسی لاتعداد مثالیں ہیں جہاں پر اراکینِ پارلیمنٹ کو زبردستی اٹھوا کر پھینکا گیا۔ چونکہ سپیکر اسمبلی کے پاس ایسے خصوصی اختیارات ہوتے ہیں کہ جب اسمبلی میں دنگا فساد کی کیفیت ہو جائے تو وہ اسمبلی کے سکیورٹی گارڈز کی مدد سے ان کو اسمبلی سے باہر زبردستی بھجوا سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ مرکزی فورس کو بھی بلا سکتا ہے بلکہ سپیکر اسمبلی کے پاس یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی مدد کے لیے مسلح افواج کے سربراہ کو بھی طلب کر سکتا ہے۔ لہٰذا پارلیمانی جمہوری سیاست میں یہ باتیں انوکھی نہیں۔ دراصل مارشل لاء حکام نے ایسے واقعات کو Exploit کیا اور یہ تأثر دیا کہ عوامی نمائندوں کی زندگیوں کو تحفظ نہ تھا جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

اسی عرصہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی گئی۔ کارکنوں کی پیٹھوں پر کوڑے برسانے کا عمل شروع کر دیا گیا جس پر پی پی پی مخالف جماعتیں خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں۔ یہ تو ہر روز کا دستور بن گیا تھا کہ فوجی عدالتیں پی پی پی کے کارکنوں کو کوڑوں، قید اور جرمانے کی سزا سناتیں صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ "بھٹو کو رہا کرو" اور "بھٹو زندہ باد" کا نعرہ لگاتے تھے۔ پارٹی کے بڑے بڑے جاگیردار اس دور میں پی پی پی سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے مسز بھٹو سے اپنا تعلق توڑ لیا جبکہ غریب اور متوسط طبقے نے اپنے راہبر کی رہائی اور زندگی کے لیے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا۔ فوجی عدالتوں کا فارمولا یہ تھا کہ وہ جس بھی کارکن کو پکڑتی اسے دس کوڑے اور کم از کم پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی جاتی۔ لہٰذا کوڑے کھاتے وقت اور چھوٹے موٹے اجتماعی جلسوں میں یہ نعرہ اس وقت بڑا مقبول ہوا جو اس وقت کے سیاسی ماحول کی عکاسی کرتا ہے جب جبر و تشدد اپنے عروج پر تھا اور ریڈیو ٹی وی سمیت تمام حکومتی ذرائع ابلاغ حکومت کی طرف سے عدل و انصاف کے بلند و بانگ دعوے کر رہے تھے:

دس دس کوڑے پانچ پانچ سال

بھٹو جیئے ہزاروں سال

غریب، مزدور، محنت کش اپنے قائد کی رہائی کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے جبکہ اسلام کا

www.bhutto.org

نعرہ بلند کرنے والوں نے فوجی عدالتوں کے سہارے اپنے سیاسی مخالفین کو خوب تشدد کا نشانہ بنایا۔

آمروں کی ان عدالتوں اور انصاف و امن کے لیے لڑنے والوں کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات بڑے منطقی ہیں۔ مولانا کٹہرے میں کھڑے ہو کر عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مسٹر مجسٹریٹ! یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے تمہارے حصے میں مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد از جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔''

پاکستان پیپلز پارٹی کے غریب کارکن ملٹری کورٹس کے فیصلوں سے ذرا بھر بھی خوفزدہ نہ ہوئے بلکہ کارکن اپنی پشتوں پر کوڑے کھانے کے بعد ایسے جذبات کا اظہار کرتے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس راستے پر چل کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اپنا قرض چکا رہے ہیں۔ وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ ہمارا یہ عمل اس مزاحمتی تحریک کو ایک ایسے مقام پر لے جائے گا جہاں پر انصاف ہوگا، امن ہوگا۔ جو کٹہرے میں کھڑے آمروں کے فیصلے سن رہے ہیں، وہ اس مقام پر ہیرو ٹھہرائے جائیں گے۔ کوڑے کھانے، قید کاٹنے والے کارکنوں کے چہرے پر کبھی بھی ایسے آثار نہیں دیکھنے میں آئے کہ ہم نے غلطی کی تھی بلکہ وہ ان سزاؤں کو اپنا زیور تصور کرتے۔ اس دور میں حکومت کے ساتھ ساتھ جماعتِ اسلامی اور دیگر مذہبی جماعتوں کے لٹھ بردار غنڈوں نے پی پی پی کے کارکنوں کی طرف سے گرفتاری دیتے وقت کارکنوں پر لٹھ برسا کر آمروں کے ساتھی ہونے کا ثبوت دیا۔ ان رجعت پسندوں نے مخبری کے فرائض بھی سرانجام دیے اور گلی محلوں سے بھٹو کے حامی لوگوں کو گرفتار کروایا۔

عدالت نے مسٹر بھٹو کو بار بار یہ یقین دہانی کرائی کہ گواہوں کی شہادتیں ختم ہونے کے بعد مسٹر بھٹو کو ان کی خواہش کے مطابق اپنا مؤقف بیان کرنے کے لیے وقت دیا جائے گا اور وہ جتنا وقت چاہیں بول سکیں گے لیکن جب 25 جنوری 1978ء کو مسٹر بھٹو نے اس وعدے سے استفادہ کرنا چاہا تو عدالت نے یہ

www.bhutto.org

موقع فراہم کرنے سے انکار کر دیا اور عدالت نے صرف مسٹر بھٹو کو ایک تحریری بیان داخل کرنے کی اجازت دی۔ عدالت اپنے وعدے پر قائم نہ رہی۔ اس پر ذوالفقار علی بھٹو نے ناراضی کا اظہار کیا۔ عدالت نے صرف اس پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ کہا کہ آئندہ کارروائی بند کمرے میں ہوگی۔ جرائم کے مقدمات میں یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے جبکہ بند کمرے میں عدالتی کارروائی صرف تین صورتوں میں ہوتی ہے: بچوں کے متعلق خانگی معاملات، قانون سازی اور ایسے مقدمات کے بارے میں جس سے کمرہ عدالت میں ہلڑ بازی کا خطرہ ہو جبکہ ہائی کورٹ کی عمارت کے اردگرد اتنا سخت پہرہ ہوتا تھا کہ کسی پرندے کے بھی عمارت کے اندر داخل ہونے کے مواقع کم تھے اور کمرۂ عدالت میں ہر کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا ہلڑ بازی کا تو خطرہ تھا ہی نہیں۔ جب مسٹر بھٹو نے عدالت کے تعصب اور جانب داری کو اتنا شدید دیکھا تو انہوں نے اپنے وکلاء کو دفاع جاری رکھنے سے منع کر دیا۔ مسٹر بھٹو نے عدالت کی کارروائی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا اور پھر بند کمرے کی کارروائی مسٹر بھٹو اور ان کے وکلاء کی غیر موجودگی ہی میں ہوئی۔

ایک طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قتل کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا تو دوسری طرف مارشل لاء کے ضابطے عوامی جدوجہد کو روکنے کے لیے بنائے جا رہے تھے۔ اپنے مشن کو مکمل کرنے کے لیے حکومت نے پراپیگنڈے کی مہم بھی جاری رکھی اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی حکمتِ عملی بنائی گئی کہ لوگوں کو سیاسی معاملات پر سوچنے سے روکا جائے۔ اس کے لیے حکومت نے نوجوانوں، دانشوروں، طلباء اور شہری طبقے کو مصروف کرنے کے لیے کھیلوں کے انتظامات کیے۔ چونکہ شہری طبقے ہی جدوجہد کو چلا کر اس کو فیصلہ کن منزل تک پہنچا سکتے ہیں، حکومت نے ان کو مصروف رکھنے کے سامان مہیا کیے۔ اس کے لیے کرکٹ کی افیون بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ حکومت ایسا غیر سیاسی ماحول پیدا کرنا چاہتی تھی کہ جس میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی جا سکے۔ حکومت قبرستان سا سکوت چاہتی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں دہشت بھی ہو اور وہ کچھ کرنے سے قاصر بھی ہوں۔ مثلاً پپو کے قاتلوں کو سرِ عام پھانسی دینے کا مقصد صرف نفسیاتی طور پر خوف و ہراس پھیلانا تھا تاکہ لوگ مارشل لاء کے ضابطوں اور حکومت سے خائف ہو جائیں۔ یہ سب کچھ حکومت منصوبہ بندی کے تحت بھٹو کی پھانسی کے لیے عوام کو نفسیاتی طور پر تیار کر رہی تھی۔ اخبارات نے حکومت کے ایما پر کرکٹ کو خوب اچھالا۔ کھلاڑیوں کے سکینڈل اور کرکٹ کے متعلق دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کرکٹ کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مضمون اور خبریں چھاپی گئیں۔ کھلاڑیوں کی بڑی بڑی رنگین تصاویر چھاپنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ نوجوان اور طلبا ان کھلاڑیوں کو ہیرو جانیں۔ سارا سارا دن اور رات ٹی وی اور

www.bhutto.org

ریڈیو کرکٹ کے میچوں پر رننگ کمنٹری پیش کرتے۔ ہندوستان کی کرکٹ ٹیم پر پاکستان آ کر میچ کھیلنے کی پابندی تھی وہ بھی ختم کی گئی۔ زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے گئے کہ کرکٹ کھیلی جائے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا۔ ایک ایسا ماحول بن گیا تھا کہ جس میں طلبا نوجوان، خواتین اور دیگر شہری طبقے کرکٹ کی افیون کے نشے کے عادی ہو گئے۔ کرکٹ ہی حب الوطنی کا معیار ٹھہرا۔ میچ جیتنا ملک کا وقار اور میچ ہارنا ملک و قوم کی شکست ٹھہرا۔ عوام ہزاروں کی تعداد میں سٹیڈیم میں اور لاکھوں کی تعداد میں ٹی وی کی وساطت سے کرکٹ کے نشے میں بدمست کر دیے گئے۔ اگر کسی کھلاڑی کا کندھا اتر جاتا تو گویا یہ تصور کیا جاتا کہ ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی ہے اور اگر کسی میچ میں شکست ہو جاتی تو ریفری کو مورد الزام ٹھہرا کر یہ تاثر قائم کیا جاتا کہ ملک کے خلاف غیر ملکی سازش تھی۔ حکومت نے اس ماحول کو کامیاب بنانے کے لیے یہ کام کیا کہ کسی میچ میں معمولی سی بھی فتح ہوتی تو ملک بھر میں چھٹی کا اعلان کر دیا جاتا۔ اس طرح کرکٹ کو ملک کا وقار اور قومی معاملہ بنا کر پیش کیا گیا۔ یہ بہت بڑی نفسیاتی جنگ کا حصہ تھا۔ حکومت کو یقیناً اس میں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ رومی آمروں نے بھی اس حربے کو استعمال کیا تھا۔ اپنے خلاف بغاوت کو روکنے کے لیے انہوں نے بھی بغاوتوں کو سرد کرنے کے لیے کھیلوں کے بڑے بڑے سٹیڈیم بنوائے جہاں پر انوکھی کھیلیں کھیلی جاتی تھیں۔ اس طرح باغی عوام کھیلوں میں مصروف ہو گئے۔

اس ماحول کو ختم کرنے کے لیے، عوام کو بیدار کرنے کے لیے اور کرکٹ کے نشے کو زائل کرنے کے لیے قائم مقام چیئرپرسن پاکستان پیپلز پارٹی بیگم نصرت بھٹو ایک دن قذافی سٹیڈیم میں گئیں تو وہاں پر موجود لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ سارا میچ درہم برہم ہو گیا۔ لوگ بیگم نصرت بھٹو کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان پر ایک آمر حکومت کر رہا ہے اور ایک بے گناہ کو قتل کے ایک مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے۔ سٹیڈیم میں موجود لوگ بیگم نصرت بھٹو کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ''جئے بھٹو'' کے نعرے بلند کیے۔ انتظامیہ یہ صورتِ حال دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی اور انہوں نے عوام پر لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر بیگم نصرت بھٹو ایک پولیس افسر کو للکاریں کہ ''بے گناہ لوگوں پر ڈنڈے کیوں برساتے ہو؟'' تو پھر پولیس نے بیگم نصرت بھٹو پر ڈنڈوں کی بھرمار کر کے عورت کے تقدس کو پامال کیا حالانکہ ضیاء حکومت چادر کے تحفظ کی بڑی دعوے دار تھی۔ نصرت بھٹو نے عوامی جدوجہد میں غریبوں کے شانہ بشانہ چل کر یہ ثابت کر دکھایا کہ پی پی پی غریبوں کی سیاست کرتی ہے اور عوام کو تشدد کا نشانہ بنتا چھوڑ کر خود محلات میں بیٹھ کر تحریک چلانے کو عوام کے ساتھ دشمنی تصور کرتے ہیں۔ پی پی پی کا سیاسی عمل عوام کے

www.bhutto.org

ساتھ ہے اور عوام کے ساتھ مل کر تشدد کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اسی طرح مسز بھٹو پر ایوبی آمریت کے دور میں بھی ڈنڈے برسائے گئے تھے۔ حکومت نے مسز بھٹو کو ذہنی کرب میں مبتلا کرنے کے لیے جیل میں ان کی کوٹھڑی کے ساتھ پاگلوں کو بند کر دیا۔ حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو، ان کے اہلِ خانہ اور پارٹی کے اراکین کو مختلف انداز میں ریاستی تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جبکہ دوسری طرف حکومت نے ہر لمحہ اسلام، اسلام اور اسلام کی رٹ لگائے رکھی۔ یہ تضادات خود جنرل ضیاء کی اسلامائزیشن کی حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔

حکومت نے بھٹو کی رہائی کو ناممکن بنانے کے لیے پیپلز پارٹی کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں پیپلز پارٹی کے جیالے کارکنوں کو کوڑوں اور قید کی سزائیں دی گئیں۔ جاگیردار سرمایہ دار سیاست کے ایسے مرحلے میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ ایسی سیاست ان مراعات یافتہ طبقوں کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ اسی لیے نون، ٹوانے، ملک، اعوان، لغاری، خان، تمن، سیدزادے، نوابزادے، قریشی، مخدوم، چوہدری، میاں، پیر اور گدی نشین وغیرہ اس عرصے میں پی پی پی کی سکرین پر برائے نام ہی نظر آئے حالانکہ اقتدار کے زمانے میں یہ لوگ ہی نمایاں تھے۔

ایک بات بڑی اہم ہے یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی ملٹی کلاس جماعت ہے لیکن پارٹی میں مشکلات کے دور میں صرف نچلے اور متوسط طبقوں کے لوگوں ہی نے مسز بھٹو کی جان بچانے یا جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے جدوجہد کی۔ ان لوگوں ہی نے کوڑے کھائے اور جیلیں کاٹیں۔ ٹھیک ہے چند ایک جاگیرداروں نے جیلیں کاٹیں مگر کوڑے کسی جاگیردار کی پیٹھ پر نہیں لگے۔ لہٰذا پی پی پی سے تعلق رکھنے والے اوپری طبقات کی قیادت نے مشکل وقت میں کوئی اہم عوامی کردار ادا نہیں کیا حالانکہ ایک وقت ایسا تھا کہ پارٹی پر یہ لوگ چھائے ہوئے تھے۔ ملٹی کلاس پارٹی میں موجود تمام لوگوں کو بحران اور مشکل دور میں برابر کا حصہ لینا چاہیے۔ اگر ان طبقات نے مشکل دور میں پارٹی کا ساتھ چھوڑا تو اس صورت میں ان امیر طبقوں کے لوگوں کا پارٹی میں حق بہت ہی کم رہ جاتا ہے اور اتنی کٹھن جدوجہد کے بعد یقیناً پارٹی کا ڈھانچہ تشکیل دینے کی ضرورت تھی جس سے پارٹی میں نچلے اور متوسط لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو وگرنہ یہ جاگیردار اچھے وقت میں پہلے سے بھی زیادہ قوت اور زر کے ساتھ پارٹی میں شامل ہو کر لوٹ کھسوٹ مچاتے ہیں۔ اس سے پارٹی کی اساس کو نقصان ہوا۔ مثلاً اس جبر کے دور کی صورتِ حال یہ ہے کہ جنوری 1979ء کو لاہور میں پارٹی کی صوبائی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس ہوا۔ پنجاب پیپلز پارٹی کے اس اجلاس میں میرے جیسے

پارٹی کے عام کارکنوں نے شرکت کر کے اجلاس کی کارروائی میں باقاعدہ شرکت کی اور مختلف قراردادیں پاس کیں۔ اس اجلاس میں دو صوبائی عہدیداروں کے علاوہ تمام لوگ میری طرح طلباء سیاست کے کارکن تھے۔ مارشل لاء دور میں پاکستان پیپلز پارٹی کا اندرونی نظام کچھ اس طرح ہی چلا۔ اس مثال سے اس وقت کی پارٹی صورتحال سامنے آتی ہے۔ بحران اور مشکل کے اس وقت میں پارٹی کو کس انداز میں اور کن لوگوں نے اپنی ہمت و جرأت کے ساتھ زندہ رکھا جبکہ حکومت نے ملک میں ایسا ماحول تیار کر لیا تھا کہ جس میں وہ بھٹو کے پھانسی جیسے فیصلے کو صادر کر سکے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قتل کا یہ مقدمہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر گیا۔ مسٹر بھٹو نے نہایت کامیاب حکمتِ عملی سے ثابت کر دکھایا کہ یہ مقدمہ ایک سیاسی مقدمہ ہے اور ان کو محض اس لیے قتل کے مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے کہ انھیں موت کے گھاٹ اتارا جا سکے۔ مسٹر بھٹو نے اپنی ذہانت و فراست اور حقائق کے ساتھ اس مقدمے کو اپنے خلاف بین الاقوامی سازش کا ایک اہم مرحلہ قرار دیا۔ بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل کو ملک کے عوام سمیت دنیا بھر کے سیاسی حلقوں نے مسٹر بھٹو کے خلاف ایک سیاسی مقدمہ جانا اور اس طرح یہ مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں 18 مارچ 1978ء کو اپنے فیصلے کے انجام تک پہنچا۔

www.bhutto.org

تیسرا حصّہ

www.bhutto.org

سزائے موت

"لاہور عجیب وغریب شہر ہے اگر ایک طرف یہ شہر ہماری تہذیب اور علم وادب کا عظیم مرکز رہا ہے تو دوسری طرف ارباب اختیار کی بیشتر ریشہ دوانیوں اور سازشوں نے اسی شہر میں بار پایا۔ اگر ایک طرف یہ مقام دولت انگلستان کے ازلی نمک خواروں کا مسکن رہا ہے تو دوسری طرف ہماری جنگ آزادی کی بے شمار روایتیں بھی اسی مقدس سرزمین سے وابستہ ہیں۔ تاج برطانیہ کے خلاف سازش کا مقدمہ 1915ء میں اسی شہر میں چلا تھا اور سردار کرتار سنگھ کو پھانسی دی گئی اور بابا سوہن سنگھ بھکنہ، بابا رور سنگھ اور پرتھوی سنگھ آزاد نے جو غدر پارٹی کے راہنما تھے عمر قید کی سزا پائی تھی۔ پھر 1927ء میں اسی شہر میں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سانڈرس کی پولیس نے لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں برسائی تھیں چند ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھگت سنگھ نے سانڈرس کو اس کے دفتر کے سامنے گولی ماری اور 23 مارچ 1931ء کو بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھ دیو نے لاہور سنٹرل جیل میں جام شہادت پیا تھا۔ ("بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی" سبط حسن)۔

بھٹو کے عدالتی قتل کی شکل میں دراصل تیسری دنیا، اسلامی اتحاد، ایٹمی ٹیکنالوجی، اسلامی بینک کے قیام کی تجویز اور پسماندہ ممالک کی خوشحالی کی جدوجہد کے خلاف غیر ملکی سازش تیار کی گئی جس کے تحت ضیاء حکومت کے ذریعے عدالت نے بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ دیا۔

یہ لاہور ہائیکورٹ کی تاریخ کا اہم ترین مقدمہ ہے اور ایک طویل ترین مقدمہ بھی ہے۔ چھ ماہ تک چلنے والا یہ اہم ترین مقدمہ 18 مارچ 1978ء کو لاہور ہائیکورٹ میں آخری مرحلے میں پہنچ گیا۔ لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ نے مولوی مشتاق حسین کی سربراہی میں ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت سنائی۔ مسعود محمود جیسے ضمیر فروش سلطانی گواہ اس مقدمے کے روح رواں ہیں۔ ٹیلیفون بھی اس مقدمے کا ایک اہم

www.bhutto.org

گواہ ہے۔ چونکہ جہاں بات نہ بنتی وہاں یہ کہا جاتا کہ فون پر بھٹو نے احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کے لیے یہ ہدایات دی تھیں بلکہ متعدد بار خود مولوی مشتاق نے گواہوں کو اس معاملے میں مدد دی کہ ٹیلیفون پر ہی آپ کو کہا گیا ہوگا۔

18 مارچ 1978ء کو صبح آٹھ بج کر بیس منٹ پر لاہور ہائیکورٹ میں جناب بھٹو کو موت کی سزا سنائی گئی۔ فل بنچ چیف جسٹس مولوی مشتاق، جسٹس ذکی الدین پال، جسٹس ایم ایس ایچ قریشی، جسٹس آفتاب حسین اور جسٹس گلباز خان پر مشتمل تھا اور فیصلہ 405 صفحات پر مشتمل تھا۔ فیصلہ جسٹس آفتاب نے لکھا تھا جبکہ چیف جسٹس مولوی مشتاق نے فیصلے کے آخری پانچ صفحات پڑھ کر سنائے۔ باقی ججوں نے فیصلہ سے اتفاق کیا۔ جناب بھٹو کے علاوہ دیگر جن چار افراد کو پھانسی کی سزا سنائی گئی وہ میاں محمد عباس سابق ڈائریکٹر ایف۔ ایس۔ ایف، غلام مصطفےٰ سابق انسپکٹر، ارشد اقبال سابق سب انسپکٹر اور رانا افتخار احمد سابق سب انسپکٹر تھے۔ اس ڈرامے میں مسعود محمود اور غلام حسین نے سلطانی گواہ کا کردار ادا کیا۔ مسعود محمود مارشل لاء کی حراست ہی میں سلطانی گواہ کے روپ میں ظاہر ہوا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو، میاں محمد عباس اور غلام مصطفےٰ کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 120 بی، 302 مع 301، 109، 111 اور 307 مع 109 اور ارشد اقبال اور رانا افتخار احمد کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 120 بی، 302 مع 301، 34 اور 307 مع 34 کے تحت سزا سنائی گئی۔ عدالت نے حکم دیا کہ:

"تمام ملزمان کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے جب تک وہ مر نہیں جاتے۔"

قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی صفائی میں کوئی گواہ پیش نہ کیا اور 9 جنوری 1978ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے خود کو مقدمے سے لاتعلق کرنے کا اعلان کیا اور اپنے وکلاء کے وکالت نامے منسوخ کر دیئے اور عدالت پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور مقدمہ کی سماعت کا بائیکاٹ کر دیا۔ دس منٹ میں فیصلہ صادر کرنے کے بعد عدالت نے اعلان کیا کہ فیصلہ کی نقول مجرموں کو پیش کر دی جائیں۔ مسٹر بھٹو نے نقل لینے سے انکار کر دیا۔ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے فیصلہ کو بڑے تحمل اور جرأت کے ساتھ سنا کیونکہ وہ اس کے لیے پہلے ہی تیار تھے۔ وہ عدالت میں اس دن بھی نیلے رنگ کے دھاری دار سوٹ میں ملبوس تھے۔ عدالت سے باہر آنے کے بعد گاڑی میں بیٹھتے وقت چیئرمین نے آسمان کی طرف دیکھا اور پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر فوج اور پولیس کی نگرانی میں واپس جیل چلے گئے جبکہ لاہور میں رات بھر پولیس اور فوج کے ٹرک گشت کر رہے تھے۔ فوج، پولیس اور رینجرز نے ہائیکورٹ کی مکمل ناکہ بندی کی۔

ہوئی تھی۔ جگہ جگہ رینجرز کے سپاہی مشین گنوں سے لیس تھے۔ ہائی کورٹ کے اندر کسی شخص کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ صحافیوں کو بھی عدالت میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ عدالت نے دوسرے ملزمان اور استغاثہ کے وکیلوں کا شکریہ ادا کیا اور یہ کہا کہ:

''بڑے ملزم (ذوالفقار علی بھٹو) کا رویہ عدالت کے خلاف اتنا شدید تھا کہ عدالت بے بس ہوگئی تھی کہ اس کے خلاف کیا کیا جائے۔ لہٰذا اس چیز کا شدت کے ساتھ احساس ہوا ہے کہ توہین سے متعلق قانون کے تحت عدالت کو توہین کے مرتکب افراد کو محض قید کی سزا دینے کا اختیار حاصل ہے جو اسے مقدمے میں جس میں توہین کا مرتکب شخص زیرِ سماعت مقدمہ قتل میں قیدی بھی ہو محض قید کی سزا کم اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس قانونی سقم کو دور کرنے کے لیے جزوی قانون بنانا ضروری ہے۔''

عدالت کی جانبداری اور تعصب دیکھیے کہ ایک دن جسٹس مولوی مشتاق نے چند کاغذات مسٹر بھٹو کے منہ پر دے مارے۔ کیا یہ بات عدالت کے وقار کو مجروح نہیں کرتی کہ منصف ملزم کے بارے میں غصے کا اظہار اس طرح کرے؟

فوجی جنتا کے ''انصاف'' کو جاننے کے لیے راؤ رشید کا بیان ہی کافی ہے:

''جب چار اور پانچ جولائی 1977ء کی درمیانی شب پاکستانی فوج نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو مجھے بھی مسٹر بھٹو کے ساتھ گرفتار کر کے مارشل لاء ضابطوں کے تحت قید میں ڈال دیا۔ تقریباً گیارہ ماہ حراست یا نظر بندی میں رکھا گیا۔ اس دوران بھٹو پر نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کا مقدمہ چلایا گیا اور بدنامِ زمانہ مسعود محمود سمیت دو وعدہ معاف گواہوں اور ایف ایس ایف کے چار دوسرے افسروں کے اعترافی بیانات کی روشنی میں لاہور ہائیکورٹ نے انہیں سزائے موت سنادی تھی۔

یہ قتل اس وقت ہوا تھا، جب میں آئی جی پولیس پنجاب تھا۔ قید کے دوران فوجی حکام نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں مقدمے کے سرکاری گواہ کے طور پر پیش ہو جاؤں اور استغاثہ کی تائید کروں۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بجائے میں نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ میں استغاثہ کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ان کے دفاع میں گواہ کے طور پر پیش ہونے کو تیار ہوں۔ تاہم ایسا نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے مقدمے کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔

چونکہ مجھے مسٹر بھٹو کو پھانسنے کے واسطے تیار کیے گئے جال کے لیے خطرہ تصور کیا جاتا تھا، اس لیے مجھے اس وقت تک قید رکھا گیا جب تک عدالت نے انہیں خطاوار قرار دے کر سزائے موت نہیں دے

www.bhutto.org

دی۔ آخر اپریل 1978ء میں مجھے رہا کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی، جس کے ساتھ میرا بیان حلفی منسلک تھا، جس نے استغاثے کے موقف کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

راولپنڈی میں سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی پٹیشن کی سماعت سے پہلے میں لاہور گیا اور ایک دوست کے گھر ٹھہرا۔ وہاں ایک نوجوان مجھے ملنے آیا۔ وہ رانا افتخار کا چھوٹا بھائی تھا۔ رانا افتخار ایف ایس ایف کا ایک سب انسپکٹر تھا۔ وہ اس مقدمہ قتل کا ایک ملزم تھا اور اس نے ہائی کورٹ میں اعترافی بیان دیا تھا جس کی بنیاد پر اسے بھی دو دیگر ملزمان کے ہمراہ سزائے موت سنائی گئی تھی۔ نوجوان نے مجھے بتایا کہ اس کا بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ آیا ہے اور گھر کے باہر کھڑا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس مقصد سے آیا ہے تو اس نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے اور وہ میری مدد لینے آیا ہے۔

اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا بھائی ایف ایس ایف میں سب انسپکٹر تھا۔ مارشل لاء نافذ ہونے کے فوراً بعد اسے محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا، اس کے ساتھ ایف ایس ایف کے دیگر کئی افسروں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا جن میں ڈائریکٹر جنرل اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل بھی شامل تھے۔ ایک دن اس کے بھائی اور دو دوسرے گرفتار سب انسپکٹروں کو مارشل لاء ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا، جہاں انہیں جنرل چشتی کے سامنے پیش کیا گیا، جو اس زمانے میں سی ایم ایل اے کا چیف آف سٹاف تھا۔ اس نے انہیں کہا کہ وہ پاکستان کے دشمن بھٹو کو پھانسی دینا چاہتے ہیں۔ ڈی جی ایف ایس ایف اور اس کا ڈپٹی پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے احکامات کے تحت نواب محمد احمد خان کو قتل کروایا تھا اور انہیں معافی دے دی گئی ہے۔ اگر وہ بھی مسٹر بھٹو کو پھانسی چڑھانے میں فوجی حکام کی مدد کرے گا تو اس کی جان بھی بچ جائے گی۔ اگر اس کا بھائی اور اس کے ساتھ دو دیگر گرفتار شدہ سب انسپکٹر بھی اعتراف کر لیں اور اس کہانی کی تائید کریں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے حکم پر محمد احمد خان پر گولیاں چلائی تھیں تو انہیں معافی دے دی جائے گی یا معمولی سزائیں دی جائیں گی، جنہیں آخر کار معاف کر دیا جائے گا۔ اگر وہ ان کے احکامات پر عمل کریں گے تو انہیں ایف ایس ایف ہی میں رہنے دیا جائے گا، ترقی اور اراضی دی جائے گی۔ اگر انہوں نے عمل نہیں کیا تو انہیں محمد احمد خان کے قتل کا ذمہ دار قرار دے کر پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ مولانا طفیل محمد نے جو کہ اس کے بھائی کے ساتھی ملزم سب انسپکٹر رانا ارشد کا ہمسایہ تھا، ضمانت دی۔

چونکہ یہ وعدہ پاکستانی فوج کا ایک جنرل کر رہا تھا اس لیے انہوں نے اس پر بھروسہ کر لیا، اس کے

علاوہ مولانا طفیل نے بھی ضمانت دی تھی، جو کہ جنرل ضیاء کا ماموں مشہور تھا۔ ان کے خاندان کو امید تھی کہ مقدمے کے اختتام پر اس کے بھائی کو رہا کر دیا جائے گا لیکن جب انہوں نے سنا کہ نہ صرف اسے رہا نہیں کیا گیا بلکہ مسٹر بھٹو کے ساتھ سزائے موت سنا دی گئی ہے تو وہ دم بخود رہ گئے۔ وہ رونے اور گڑگڑانے لگا کہ میں اس کے بھائی کی جان بچانے کے لیے کچھ کروں۔ مجھے اس بے چارے پر بڑا ترس آیا لیکن میں اس آخری مرحلے پر ان کے لیے کچھ بھی کرنے سے خود کو قاصر پا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اگلے دن آئے۔

میں نے اپنے ایک دو وکیل دوستوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر دھوکے کا شکار بننے والے تمام لوگ سپریم کورٹ میں ایک حلفیہ بیان جمع کروا دیں تو انہیں رہائی مل سکتی ہے۔

میں نے نوجوان کو یہی ہدایت کی۔ اس نے پوچھا کیا میں اسے کسی اچھے وکیل سے ملوا سکتا ہوں؟ اس زمانے میں سپیشل برانچ کے افسر جیپ میں ہر وقت ہر جگہ میرا تعاقب کرتے رہتے تھے۔ میں ان سے بچ بچا کر رات کو دیر گئے اسے مشہور وکیل عابد حسن منٹو کے گھر لے گیا۔ وہ مقدمہ لینے پر راضی ہو گیا۔ اس نے اسے ایک سادہ پاور آف اٹارنی دیا اور کہا کہ وہ راولپنڈی جیل میں قید اپنے بھائی سے اس پر دستخط کروا لائے۔ جب وہ نوجوان جیل میں اپنے بھائی سے ملا، اس وقت تک مارشل لاء حکام کو سن گن مل چکی تھی۔ حکام بہت زیادہ چوکس تھے۔ انہوں نے نوجوان اور اس کے باپ کو پکڑ لیا اور انہیں زبانی کلامی ڈرایا بھی اور لالچ بھی دیا تاکہ وہ راہ راست پر آجائیں۔ جنرل چشتی نے پھر وعدہ کیا کہ وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ آجانے کے بعد ہی ایسا ممکن ہے۔ وہ لالچ میں آ گئے۔ اس نوجوان کو ایف ایس ایف میں براہ راست اے ایس آئی لگا دیا گیا اور اس کے باپ کا منہ بند کرنے کے لیے آدھا مربع اراضی دے دی گئی۔

جب اگلے دن میں مسٹر بھٹو کی پٹیشن کی سماعت سننے کے لیے گیا تو میں نے باپ اور بیٹے کو کمرۂ عدالت میں وکلائے استغاثہ اعجاز حسین بٹالوی اور ایم اے رحمٰن کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں خرید لیا گیا ہے۔

وقفے کے دوران کسی نے آ کر مجھے بتایا کہ پولیس میری کار کی نگرانی کر رہی ہے۔ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ سماعت ملتوی ہونے کے بعد میں باہر نکلا تو دیکھا کہ وردی پوش پولیس والوں سے بھری ایک اور جیپ میری کار کے نزدیک موجود ہے۔ جب میں اپنے گھر جا رہا تھا تو اس جیپ نے آگے آ کر میرا راستہ روک لیا۔ ایک افسر جیپ سے اترا اور مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد ایک کاغذ نکالا۔ وہ

تین ماہ کے لیے میری گرفتاری اور اٹک جیل میں قید رکھنے کا حکم نامہ تھا۔ یہ امر واضح تھا کہ وہ مجھے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ میں ان کے منصوبوں کو ناکام نہ بنا سکوں۔

(از "جو میں نے دیکھا" راؤ رشید، صفحہ 9 تا 12)

ملک کے اندر کروڑوں عوام نے اس خبر کو جذباتی انداز کے ساتھ سنا۔ ایسے کئی واقعات ہوئے کہ جن سے عوام کا بھٹو سے دلی وابستگی کا زندہ جاوید ثبوت ملتا ہے۔ لاہور کے نواحی علاقوں کے دو افراد نے اپنے بیٹوں کو بھٹو کی بجائے تختۂ دار پر لٹکانے کی اپیل کی۔ حیدرآباد کا ایک نوجوان عبدالغنی غم کی تاب نہ لاتے ہوئے انتقال کر گیا۔ لوگ دفتروں میں نہ گئے، مزدوروں نے کارخانوں میں کام بند کر دیا، سنیما ہالوں کا رش ماند پڑ گیا، طلبا نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا۔ لاہور، حیدرآباد، میرپور خاص، کراچی، راولپنڈی، پشاور اور گوجرانوالہ سمیت ملک بھر میں عوام نے احتجاجی جلوس نکالے جبکہ فوجی عدالتوں کے فیصلوں پر گرفتار لوگوں کو فوری طور پر کوڑے لگائے گئے۔ پاکستان سے باہر بھارت کے کئی شہروں میں پھانسی کے فیصلے کے خلاف جلوس و احتجاج کیا گیا، مقبوضہ کشمیر میں کاروبار زندگی بند ہو کر رہ گیا۔ مقبوضہ کشمیر کے آزادی پسند عوام نے جس بھرپور طریقے سے قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا، وہ تاریخ کا اہم باب ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے عوام کی اس دلیری اور ذوالفقار علی بھٹو سے دلی وابستگی ان کے ان خیالات کا اظہار کرتی ہے کہ وہ قائدِ عوام کو محکوم انسانوں کا قائد تصور کرتے ہیں۔ کھٹمنڈو میں عوام نے پھانسی کے فیصلے کے خلاف کئی دن تک مسلسل احتجاج کیا۔ نیپال میں ان مظاہروں نے ملکی سیاست پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔ بھٹو کی پھانسی کے خلاف نیپال میں برپا ہونے والے مظاہرے نیپال میں بحالی جمہوریت کی تحریک میں ڈھل گئے۔ اس کے علاوہ لندن میں پاکستانیوں نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف بہت بڑا مظاہرہ کیا۔ ایران، لیبیا، فلسطین، فلسطینی مہاجرین کیمپوں (صابرہ، شتیلہ، لبنان، اردن) لبنان، قبرص، اٹلی، یونان، مصر، ترکی، بنگلہ دیش، امریکہ اور فرانس ہر جگہ احتجاجی جلوس نکلے۔

پھانسی کے فیصلے کے ساتھ ہی متعدد ممالک کے سربراہوں اور راہنماؤں نے رحم کی اپیلیں بھیجنی شروع کر دیں جن کو جنرل ضیاء الحق نے "سیاست دانوں کی ٹریڈ یونین" کا نام دیا اور ان اپیلوں کو نامنظور ہی نہ کیا بلکہ توہین بھی کی اور کہا کہ جب بھی کسی سیاستدان کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی ہے تو یہ بین الاقوامی پلیٹ فارم سے معافی کی درخواستیں بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ الفاظ جنرل ضیاء کی ذہنی پسماندگی کی

نشاندہی کرتے ہیں جبکہ پاکستان کے کسی بھی مقتدر سیاست دان نے بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کے خلاف احتجاج نہ کیا بلکہ وہ اس فیصلے پر بے حد خوش اور مطمئن ہوئے کہ کسی طرح فوری طور پر فیصلے پر عمل کیا جائے۔

لیبیا، ترکی، الجزائر، شام، قطر، ایران، سعودی عرب اور دیگر ممالک نے جنرل ضیاء کو رحم کی اپیلیں روانہ کیں جن کو ضیاء نے نامنظور کیا اور اپیلوں کو اندرونی معاملے میں مداخلت قرار دیا جبکہ دنیا بھر کے راہنماؤں نے فیصلے کو سخت ناپسند کرتے ہوئے سزا کی معافی یا تخفیف کی اپیل کی جبکہ دنیا کی مشہور ترین اسلامی یونیورسٹی دیوبند کے عالم مولانا مفتی سید احمد علی سید نے بھٹو کے مقدمہ قتل کے متعلق فیصلہ دیا کہ۔

"بھٹو کو دی گئی سزائے موت اسلامی احکامات کے خلاف ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ احمد رضا قصوری اور ان کے والد ایک کار میں جا رہے تھے۔ کار پر حملہ ہوا۔ گولیاں چلیں۔ مقصد تھا احمد رضا قصوری کو مار دینا لیکن وہ بچ گئے اور ان کے والد گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ بھٹو نے گولی چلائی بلکہ گولیاں چلانے والا بھٹو کا آلۂ کار تھا۔ چنانچہ "اخبار دعوت" ہی کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خفیہ پولیس کے ذریعے حملہ کیا گیا۔ اسلامی اور مصطفویؐ قانون کے ذریعے یہ قتلِ خطا ہے۔ اس لیے احمد رضا قصوری کے والد کو قتل کرنا مقصود نہیں تھا اور قتلِ خطا میں قتل کرنے والے پر بھی قصاص نہیں، قید و بند کی صعوبتیں نہیں بلکہ کفارہ ہے۔ پھر شرعی حکم کے تحت یہ ہے کہ اگر چند افراد ایک شخص پر ایک ساتھ حملہ کریں اور اس کو قتل کر دیں تو جس نے کاری زخم لگایا جس سے موت واقع ہوئی صرف اس سے قصاص لیا جائے گا۔ دوسروں سے نہیں اور اگر یہ مان لیا جائے کہ بھٹو نے قتل کا حکم دیا تھا اور اس کا شرعی ثبوت بھی فراہم ہو گیا تو پھر بھی اسلامی و شرعی قوانین کی رو سے قصاص نہیں آتا اور اس کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ یہ فیصلہ اسلام اور مصطفویؐ قانون کے خلاف ہے۔"

دنیا کے ایک معتبر عالمِ دین اس فیصلے کو غیر شرعی قرار دیتے ہیں اور دنیا کے مسلم راہنما، اسلامی اتحاد، مسئلۂ بیت المقدس کی حمایت اور جدوجہد کی قیادت کی خاطر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کا مطالبہ اور اپیل کرتے ہیں جبکہ پاکستان کا فوجی حکمران ضیاء ملک میں اسلام کا بول بالا کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور بھٹو کی رہائی کے لیے اپیلوں کو ملکی معاملات میں مداخلت قرار دیتا ہے۔ ضیاء کو اگر اسلام کی خدمت کرنے کا ہی شوق تھا تو عالمِ اسلام کی خواہشات کا ضرور احترام کرتا اور شریعت کے نفاذ کا اتنا بڑا علمبردار تھا تو شرعی نقطۂ نظر سے فیصلہ کو جانچتا اور پھر دیکھتا کہ بھٹو کو رہا کیا جائے کہ نہ رہا کیا جائے؟

ہائیکورٹ کے فیصلے سے قبل اکثر لوگ یہ تصور کرتے تھے کہ بھٹو کو ہائیکورٹ معمولی قسم کی سزا دے گی بلکہ بری کر دے گی لیکن یہ فیصلہ عوام کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ وہ کسی طرح بھی اس فیصلہ کے لیے

www.bhutto.org

ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ عوام کی سوچ یہ تھی کہ ایک شخص جس کی زندگی اسلامی اتحاد، سامراج کے خلاف جدوجہد اور اسلامی دنیا کو جدید ٹیکنالوجی کی فراہمی کے لیے وقف ہو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص ایک جھوٹے قتل کیس میں موت کی سزا کا حق دار ٹھہرا لیا جائے جو دنیا میں امن اور آزادی کے لیے کوشاں ہو۔ یہ عوام کا پختہ یقین ہے کہ احمد رضا قصوری بھٹو کے لیے کوئی سر درد نہ تھا کہ بھٹو اس کو مروانے کے لیے بے تاب ہوتے نہ ہی احمد رضا قصوری کوئی اتنی بڑی شخصیت تھا کہ وہ ملک میں بھٹو کی حکومت کے لیے کوئی بڑا چیلنج تھا۔ وہ پارٹی کا ایک درمیانی سطح کا لیڈر تھا جو باپ کے قتل کے بعد اپنی ہی درخواست پر دوبارہ پارٹی میں شامل ہوا۔ پارٹی کے اندر اختلافات ہر جمہوری جماعت میں ہوتے ہیں۔ قصوری کے علاوہ ایسے کئی با اثر لوگ تھے جو پارٹی کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، جن کی عوام میں کافی اہمیت تھی جن میں معراج محمد خان، محمود علی قصوری، مختار رانا اور حنیف رامے وغیرہ ہیں لیکن بھٹو نے کسی کے بھی خلاف اقدام قتل کا ارادہ نہ کیا اور یہ لوگ بھٹو کی مخالفت میں کافی اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے جب کہ احمد رضا قصوری عوامی سطح پر مقبول لیڈر بھی نہیں تھا۔

ہمارے ملک کے کسی بھی سیاستدان نے دلچسپی کے ساتھ بھٹو کی معافی کے لیے اپیل نہ کی بلکہ تمام لیڈر حضرات بے چین ہو گئے کہ کسی طرح بھٹو کو ایک دم پھانسی پر لٹکا دیا جائے، جن میں پیش پیش پیر پگاڑہ، مولانا نورانی، ولی خان اور ان کی ٹیم، اصغر خان، میاں طفیل محمد اور دیگر اہل منصورہ، چودھری ظہور الٰہی اور کچھ سابق سیاستدان بھی شامل تھے۔ وہ کسی طرح بھی بھٹو کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ انہوں نے اس مقصد کے لیے حکومت کے ساتھ تعاون کیا۔ خود جنرل ضیاء نے بار بار کہا پیپلز پارٹی کے علاوہ تمام جماعتوں نے انتخابات کے ملتوی کرنے کا مطالبہ یا منتیں کی تھیں۔ اس کے بعد فوجی حکومت کے شانہ بشانہ بھٹو کو قتل گاہ کی جانب لے جانے کے لیے حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور پی این اے کے راہنما وزارتوں پر بڑے مزے کے ساتھ براجمان ہو گئے۔ حکومت کے عدل و انصاف کے دعوؤں کے پیچھے امریکی سامراجی عزائم تھے جس نے پہلے مسٹر بھٹو کی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ جب دیکھا کہ مسٹر بھٹو ان سب مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں تو پھر امریکہ نے مسٹر بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے سازش تیار کی جس میں مسٹر بھٹو کی حکومت کا خاتمہ ہی منزل نہ تھی بلکہ اس سازش میں مسٹر بھٹو کا جسمانی اور سیاسی خاتمہ بھی مقصود تھا۔ چونکہ امریکہ کو یہ علم تھا کہ مسٹر بھٹو کو اگر اقتدار سے محروم کیا جائے تو عوامی مقبولیت کی مدد سے دوبارہ برسر اقتدار آ جائیں گے اور اگر دوبارہ عوامی مقبولیت و حمایت کے زور پر اقتدار میں آتے ہیں تو ان کا رویہ اور سیاست پہلے سے کہیں زیادہ Radical

ہوگی اور اس طرح مسٹر بھٹو پاکستان کے اندر بہت بڑی انقلابی تبدیلیاں لا سکتے ہیں جو انہوں نے دورِ اقتدار میں بھی نہ لائیں اور اس طرح امریکی مفادات کو خطے میں شدید نقصان پہنچے گا اور اس کے سدِ باب کے لیے ضروری ہے کہ مسٹر بھٹو کی حکومت کو ختم کیا جائے اور ان کی کردار کشی کر کے ان کو غیر مقبول بنا دیا جائے اور پھر ان کو قتل کروایا جائے۔ اسی لیے پاکستان کے عوام سمیت تیسری دنیا کے عوام اور بین الاقوامی سیاسی وصحافتی حلقوں نے اس مقدمے کو سیاسی مقدمے کے طور پر جانا۔

مثلاً امریکہ نے جہاں اقتصادی اور سفارتی میدانوں میں مسٹر بھٹو کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کیں وہاں اس نے مسٹر بھٹو کے خلاف ملک کے اندر سیاسی بے چینی اور مسٹر بھٹو کے اقدامات کو سبوتاژ کرنے کی متعدد سازشیں کیں جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

امریکہ کی بھٹو دشمنی ہمیں قدم قدم پر نظر آئے گی۔ خود مسٹر بھٹو بھی بار بار اس بات کا اعلان کرتے رہے کہ ایک غیر ملکی سازش ان کے خلاف کام کر رہی ہے۔ درحقیقت مسٹر بھٹو ایوب خان کے دورِ حکومت ہی میں امریکیوں کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دیے گئے تھے۔ مسٹر بھٹو نے سائرس وانس (امریکی وزیرِ خارجہ) کا خط راولپنڈی کے راجہ بازار میں دکھا کر اور قومی اسمبلی کی تقریر (28 اپریل 1977ء) کے دوران ہی غیر ملکی سازش کی طرف بڑا واضح اشارہ کیا تھا اور دشمن کی عوامی سطح پر نشاندہی بھی کر دی تھی۔ مسٹر بھٹو کی حکومت ختم کرنے کے سلسلے میں اور بھی کئی شواہد سامنے آئے ہیں جن سے امریکہ کے عزائم کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اسلام کا ڈھنڈورا پیٹنے والی آمر حکومت اور اس کے سربراہ جنرل ضیاء الحق کی پشت پر امریکی سامراج کا ہاتھ تھا اور اس کے عدل، اسلام، چادر و چار دیواری، منصفانہ الیکشن، نوے دن، جمہوریت اور اسلامائزیشن کے نعرے محض ایک دکھاوا تھے۔ مسٹر بھٹو نے امریکہ ضیاء گٹھ جوڑ کو بھی ثابت کر دکھایا ہے۔ مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ میں بیگم نصرت بھٹو کیس میں چیف آف آرمی سٹاف کے جواب میں ایک تحریری جواب دیا جس میں مسٹر بھٹو جنرل ضیاء کے ''آپریشن فیئر پلے'' کو امریکی آپریشن ثابت کرتے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے جنرل ضیاء اور امریکی سفیر کی ملاقات کی نشاندہی کی جو جنرل ضیاء نے امریکی سفیر کو الوداعی تقریب کے دوران کی اور جس میں ''آپریشن فیئر پلے'' کی جانب بڑھنے کے فیصلے اور مشورے ہوئے۔ مسٹر بھٹو کہتے ہیں کہ:

''سابق سفیر اور مدعا علیہ (ضیاء الحق) کے درمیان یہ خفیہ ملاقات اس بیان سے دس روز پہلے پنڈی میں ہوئی تھی جب میں لاہور میں تھا۔ ان خفیہ انتظامات کا جشن ایک بڑے استقبالیہ کی صورت میں

www.bhutto.org

منایا گیا۔ یہ استقبالیہ سابق سفیر کے اعزاز میں الوداعی پارٹی کے پردے میں دیا گیا۔ اگرچہ مدعا علیہ ایک ''مومن'' ہے لیکن اس شام شراب سرِ عام لنڈھائی گئی۔ میں لاہور میں ہی تھا جب محکمۂ خارجہ نے مجھے مطلع کیا کہ میری ان انتہائی سخت ہدایات کہ کوئی سینئر افسر وزیر غیر ملکی سفارتی نمائندوں کو محکمۂ خارجہ کی پیشگی اجازت کے بغیر استقبالیہ یا ضیافت نہیں دے سکتا، کے باوجود سب کچھ ہوا۔ مدعا علیہ نے اس رخصت ہوتے ہوئے سفیر کو انتہائی پرتکلف استقبالیہ دیا اور ان مستقل ہدایات کو پرِ کاہ کی وقعت نہ دی۔ اس وقت کے سیکرٹری محکمۂ داخلہ نے اس استقبالیہ کی ایک رپورٹ اپنے ایک رفیق کار کو دی۔ میں جب راولپنڈی لوٹا تو مجھے اس استقبالیہ کی تفصیل دی گئی۔ میں نے اس وقت کے سیکرٹری داخلہ کے ساتھ اس مسئلے پر بات کی اور تنبیہ کی کہ وہ اپنے رفقائے کار کو بتائے کہ محکمۂ خارجہ کی پیشگی اجازت کے بغیر یہ استقبالیہ تختہ الٹنے کا سگنل ہے۔ یہ پس منظر تھا جس کے تحت مدعا علیہ نے 28 اپریل 1977ء کے بیان پر نہ صرف خوشی خوشی دستخط کیے بلکہ اسے حکومت کی ضمانت میں اور زور دار کر دیا۔ مدعا علیہ نے میری حکومت کے ساتھ ظاہری، پُرفریب وفاداری 4 جولائی 1977ء کی رات تک اس وقت تک جاری رکھی جب میں نے اس سے ڈیڑھ بجے رات کو فون پر بات کی۔''

امریکی اس صورتِ حال میں کتنے خوش ہو کر بغلیں بجا رہے ہوں گے کہ انہوں نے اپنے ایک بہت بڑے دشمن کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت عدالت کے ذریعے قتل کرنے کی کامیاب منصوبہ بندی کی اور اس کے لیے ایک ایسے شخص (ضیاء الحق) کو مسلط کیا جو اسلام کا سب سے بڑا دعویدار تھا۔ سابق وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو کے کوٹ لکھپت جیل لاہور میں دورانِ مقدمہ یہ کوائف تھے:

قیدی نمبر 1772۔

نام ذوالفقار علی بھٹو ولد سر شاہنواز بھٹو۔

قد پانچ فٹ دس انچ۔

وزن 175 پونڈ۔

ایک شناختی نشان: ماتھے کے بائیں طرف۔

سکنہ نوڈیرو۔

پیشہ سیاسی لیڈر۔ حوالاتی ہمراہ بشرٹ و پتلون ایک عدد۔

حوالاتی زیرِ دفعہ 302، 307 ت پ 120/16، 109 ت پ تھانہ اچھرہ۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو نے جیل کی صعوبتوں اور ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ کر کے یہ ثابت کر دکھلایا کہ حقیقتاً وہ سامراج دشمن، انقلابی راہنما ہیں جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں، جس نے سامراج اور اس کے گماشتوں کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا اور غریب عوام کے حقوق کی خاطر لڑنے اور مرنے کا عہد پورا کر دکھایا۔

گو یہ حقیقت ہے اور خود ذوالفقار علی بھٹو نے تسلیم کیا ہے کہ میں نے امیر اور غریب کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی جو کامیاب ثابت نہ ہو سکی لیکن جب انہوں نے مصائب کو برداشت کیا اور مشکلات کا مقابلہ کیا تو انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ میں غریب کا ہوں اور میری جدوجہد غریبوں، محنت کشوں، کسانوں، مزدوروں اور پسے ہوئے عوام کے لیے ہے۔ اگر وہ اس وقت کوئی سودے بازی کرتے تو اس سے ثابت ہوتا کہ بھٹو جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ ہے۔

مارشل لاء حکومت نے بڑے بڑے بدنام زمانہ سمگلروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، رجعت پسندوں سے بھرپور تعاون کیا اور ان کے مفادات کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ ان کو بہت زیادہ مراعات دیں جس سے مارشل لاء حکومت کو اپنے قدم جمانے میں مدد ملی۔ فوجی حکمرانوں نے کسی وقت بھی ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز کاروبار سمیت اخلاقی مجرموں اور بدمعاشوں کے خلاف کوئی شدید کارروائی نہ کی بلکہ ہمیشہ سیاسی کارکنوں میں خوف و ہراس پھیلانے کی کارروائیاں کیں تاکہ ممکنہ حد تک سیاسی کارکنوں کو جدوجہد کرنے سے خوف زدہ کیا جا سکے۔ لہٰذا مارشل لاء حکومت نے زیادہ سے زیادہ کارکنوں کو کوڑوں اور قید کی سزائیں دیں جبکہ اس کے مقابلے میں اخلاقی مجرموں، ڈاکوؤں، بدمعاشوں، چوروں، ہیروئن فروشوں اور دیگر سماج دشمن عناصر کو مارشل لاء کے ضابطوں کا نشانہ نہیں بنایا گیا لیکن ان حالات میں بھی پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے حوصلہ مندی کے ساتھ اپنی کٹھن جدوجہد کو جاری رکھا۔ درحقیقت یہ پی پی پی کے پرخلوص کارکنوں کی عظیم جدوجہد ہے۔

حکومت نے زیادہ سے زیادہ کوشش کی کہ صرف ان لوگوں کی پشتوں پر کوڑے مارے جائیں جو اپنے ہاتھ سے اپنا رزق کماتے ہیں۔ حکومت کا نشانہ محنت کش طبقہ تھا۔ چونکہ وہ محسوس کرتی تھی کہ اس طبقے کی تمام تر وفاداریاں ذوالفقار علی بھٹو سے وابستہ ہیں اس لیے محنت کش طبقے کو انتہائی خوفزدہ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں صحافیوں کی پشتوں پر بھی کوڑے مارے گئے۔ ایک مرتبہ جنرل ضیاء نے ایک معروف صحافی کو بالمشافہ گفتگو کے دوران واضح دھمکی دی کہ ''تمہیں الٹا لٹکا دیا جائے گا۔'' اس کا قصور یہ تھا کہ وہ بھٹو کی حمایت

www.bhutto.org

اور مارشل لاء کی مخالفت میں لکھتا تھا۔ سینکڑوں صحافیوں کو سزائیں ملیں اور پھر ستم ظریفی یہ کہ سینئر ترین صحافیوں کو بھی مارشل لاء نے نہ بخشا۔ ظہیر کاشمیری جیسے قوم پرست شاعر، ادیب وصحافی کو فوجی عدالتوں نے سزائیں سنائیں۔ فلمی اداکاروں کو کوڑے مارے گئے اور اسی طرح جب پاکستان ٹیلی ویژن میں کارکنوں نے احتجاج کیا تو لاتعداد کارکنوں کو قید کر لیا گیا اور ان کو سخت ترین سزائیں سنائی گئیں اور کئی ایک کو بے دخل کر دیا گیا۔ ٹریڈ یونین کو حکومت نے اس طرح کچلنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی آواز ہی نہ بلند کر سکیں۔ ان اقدامات کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ یہ طبقے بھٹو کی ترقی پسند جدوجہد کے ساتھی تھے۔ مزدور محنت کش بھٹو کی قیادت کو محنت کشوں کی قیادت تصور کرتا ہے۔ اسی طرح حکومت نے تعلیمی اداروں کے تسلسل میں بھی رکاوٹیں ڈالیں۔ صرف اس لیے کہ طلباء ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلنے والے مقدمات کے خلاف سڑکوں پر نہ نکل آئیں۔ مارشل لاء حکومت کے دوران جتنی ناانصافیاں زیادتیاں اور ظلم طلبا کے ساتھ ہوئے، ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ صرف یہ نہیں کہ مہینوں تک تعلیمی ادارے بند کر کے طلبا کا تعلیمی نقصان کیا گیا بلکہ طلبا کو کوڑے مارے اور شاہی قلعہ جیسے بدنامِ زمانہ عقوبت خانوں میں اذیتیں پہنچائیں۔ یہ حقائق مارشل لاء حکومت کے "عدل وانصاف" کے نعرے کا منہ چڑاتے ہیں۔

اس عرصہ میں ملاؤں نے فرقہ واریت کو خوب فروغ دیا اور سرکاری سطح پر پاکستان میں مذہبی بنیاد پرستی کی جڑیں مضبوط کی گئیں۔ سنی کانفرنسیں، شیعہ کانفرنسیں، بریلوی کانفرنسیں، وہابی کانفرنسیں، دیوبندی کانفرنسیں اور نہ جانے کس کس نام پر مذہبی کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ہر مسلک کے ملاؤں نے عوام کے جذبات سے کھیلنے کی کوششیں کیں۔ جن کے مقاصد یہ تھے کہ اپنی دکانداریاں چمکائی جائیں اور عوام میں فرقہ واریت کی بنیاد پر سیاست کی جائے۔ یہ صورتِ حال کسی بھی ملک کے لیے تباہ کن ہوتی ہے، جہاں پر فرقہ کی بنیاد پر سیاست کو فروغ دیا جائے۔ اس کی انتہا سوائے خانہ جنگی کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ دراصل اس کارروائی کے پیچھے ملاؤں کا یہ خیال بھی تھا کہ ہم اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی کی مقبولیت کو توڑ دیں گے۔ حکومتِ وقت کی جانب سے فرقہ واریت کی اس تحریک کو مکمل پشت پناہی رہی کیونکہ وہ ہر اس کام میں ان لوگوں اور گروہوں کی حمایت اور سرپرستی کرتی رہی جو کسی طرح پیپلز پارٹی کی قوت کا شیرازہ بکھیرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ پھر ہم کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ فوجی جنتا نے ملک کو استحکام بخشا اور اس نے ملک کو خانہ جنگی سے بچالیا بلکہ حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ مارشل لاء نے ہر میدان میں ایسی پالیسیاں ترتیب دیں جو ملک میں خانہ جنگی اور تشدد کے لیے کسی وقت بھی راستہ ہموار

www.bhutto.org

کرنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سیاست میں فرقہ واریت یا علاقائیت کا نعرہ نہیں لگایا بلکہ عظیم پاکستان کا تصور پیش کیا۔ ایک خوشحال پاکستان، ترقی یافتہ پاکستان، مضبوط پاکستان اور تیسری دنیا کے ممالک کا رہبر پاکستان۔ ذوالفقار علی بھٹو کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے تعصبات اور تنگ نظری سے مبرا سیاست کو رواج دیا، عوامی سیاست، غریبوں کی سیاست اور ملک کے کونے کونے میں رہنے والے فرد کے مفاد کی بات کی نہ کہ کسی ایک علاقے اور قومیت کی بات کی۔ ملک کی مجموعی خوشحالی کی بات کی اور طبقاتی سیاست کو رواج دیا۔ ملک کی تمام استحصالی طاقتوں کو للکارا اور اسی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو کی مقبولیت کسی ایک مخصوص علاقے تک محدود نہ رہی لیکن جب ذوالفقار علی بھٹو پس دیوار زنداں ہوئے تو حکومت نے علاقائیت اور فرقہ واریت کو تقویت پہنچائی تا کہ کسی نہ کسی طرح بھٹو کے عوامی اثر و رسوخ کو ختم کیا جا سکے۔

بھٹو کو پھانسی کے فیصلے کے خلاف مختلف ممالک نے بھرپور زور ڈالا لیکن سب سے زیادہ بھرپور کوششیں تیسری دنیا کے ممالک اور خصوصاً عرب ممالک نے کیں۔ جن میں لیبیا، سعودی عرب، شام اور تنظیم آزادئ فلسطین بطور خاص ہیں۔ لیبیا کے وزیر اعظم نے مارچ 1978ء میں ہائیکورٹ کے فیصلے کے بعد پاکستان کا خصوصی دورہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کے لیے جنرل ضیاء نے معمر قذافی، شام کے حافظ الاسد اور فلسطین کی آزادی کے راہنما یاسر عرفات کو یہ یقین بھی دلوایا تھا کہ بھٹو کے ساتھ رعایت برتی جائے گی۔ اس سلسلے میں وہ خط بڑی اہمیت کا حامل ہے جو یاسر عرفات نے جناب بھٹو کی پھانسی کے بعد تعزیت کے طور پر بیگم نصرت بھٹو کو لکھا تھا جس کے مطابق یاسر عرفات سے خانہ کعبہ میں جنرل ضیاء نے وعدہ کیا تھا کہ بھٹو کو پھانسی نہیں دی جائے گی۔

18 مارچ 1978ء کو جناب بھٹو کو سزائے موت سنائی گئی اور 20 مارچ کو ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت پانے والے قیدیوں کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سپریم کورٹ میں اپیل داخل نہ کرنے کا اعلان کیا لیکن مسٹر بھٹو کے وکیل جناب یحییٰ بختیار کے کہنے پر 25 مارچ کو سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔ 17 مئی 1978ء کو مسٹر بھٹو کو ہیلی کاپٹر کے ذریعہ کوٹ لکھپت جیل سے راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں پہنچایا گیا۔ 20 مئی کو سپریم کورٹ کے نو ججوں پر مشتمل فل بنچ نے باقاعدہ اپیلوں کی سماعت شروع کی۔ ہائی کورٹ کا ریکارڈ جو سپریم کورٹ کو پہنچایا گیا، 1800 صفحات پر مشتمل تھا اور جو دو بڑے بکسوں میں بند تھا۔

حکومت نے جیل میں مقید سابق وزیر اعظم کے خلاف ''اختیارات کے ناجائز استعمال اور

برائیوں" پر مبنی پراپیگنڈہ کو طاقتور کرنے کے لیے اور بھٹو کو بین الاقوامی سطح پر رسوا کرنے کے لیے ایک وائٹ پیپر شائع کیا۔ یہ سراسر زیادتی تھی کہ ایک شخص جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو اس کے خلاف حکومت کروڑوں روپیہ لگا کر الزامات کا انبار لگا دے اور اس شخص کو قرطاسِ ابیض کے جواب کا حق اور مواقع میسر نہ ہوں۔ اس سلسلے میں بھٹو نے کہا کہ:

"یہ اس شخص کے لیے بہت مشکل ہے کہ جو قتل کے مقدمے میں الجھا ہو۔ جیل کے اندر وسائل و ذرائع نہ ہونے کے سبب کسی قرطاسِ ابیض کا جواب دینا مشکل کام ہے۔"

لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے جیل سے حکومت کے تمام الزامات کا جواب دیا۔ اپریل 1978ء میں جناب بھٹو نے مقدمے کی مصروفیات کے باوجود ایک تحریر لکھی مگر عدالت نے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی لیکن یہ ہی تحریر دیکاس پبلشرز دہلی نے "If I am Assassinated" کے نام سے شائع کی جس نے دنیا بھر میں راتوں رات شہرت پالی۔ اس تحریر نے دنیا کے سامنے یہ سب حقائق بیان کر دیے جو بھٹو کے خلاف سازش میں کارفرما تھے۔ اس تحریر کی شہرت نے حکومت کے "وائٹ پیپر" کا ستیاناس کر دیا اور دنیا محسوس کرنے لگی کہ واقعی بھٹو کے خلاف ایک امریکی سازش کارفرما ہے۔ اقتدار کے دوران ہنگاموں سے لے کر جیل اور پھر پھانسی کی کوٹھڑی تک پہنچنا اس سازش کا حصہ ہے۔ اس تحریر نے جناب بھٹو کی معصومیت اور مظلومیت پر مہر ثبت کر دی۔ جناب بھٹو نے "آپریشن فیئر پلے" کی دھجیاں اڑا دیں اور پی این اے کی نام نہاد "تحریکِ نظامِ مصطفیٰ" کے کرداروں اور ان کے آقاؤں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ اس کتاب کی اشاعت نے بین الاقوامی سطح پر یہ باور کرانے میں کامیابی حاصل کی کہ بھٹو کا مقدمہ فوجداری نہیں سیاسی ہے۔ یہی جیت تھی اور بھٹو اس میں کامیاب ہو گئے۔ جو لوگ یہ کہہ کر بددلی اور کنفیوژن پیدا کرتے ہیں کہ اگر بھٹو اور ان کے وکیل مقدمے کو سیریس لیتے تو شاید بھٹو کو پھانسی نہ ہوتی۔ ممکن ہے وہ امریکہ کے امپریلسٹ ڈھانچے سے آگاہ نہیں کہ وہ کس طرح تیسری دنیا کے عوامی راہنماؤں کے خلاف سازش کرتا ہے۔ یہ کسی راہنما کی بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خلاف سازش کو بے نقاب کر دے۔ یہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی بڑی فتح ہے اور مارشل لاء حکومت اور امریکہ کی شکست۔ بھٹو نے باور کروایا کہ پھانسی ان کی جدوجہد کے نتیجے میں ان کا مقدر بنی ہے اور یہ شعوری طور پر واقع ہوئی ہے۔

فوجی حکومت کے انصاف پر مبنی رویے کو جاننے کے لیے ذرا عدالتی ڈھانچے پر توجہ دیجیے۔ 27 مارچ کو چیف جسٹس شیخ انوار الحق نے ایک بنچ قائم کیا جو ان پانچ ججوں پر مشتمل تھا:

www.bhutto.org

1- چیف جسٹس مسٹر انوار الحق

2- مسٹر جسٹس داراب پٹیل

3- مسٹر جسٹس قیصر خان

4- مسٹر جسٹس محمد حلیم

5- مسٹر جسٹس صفدر شاہ

20 مئی کو مسٹر بھٹو کی درخواست پر جس میں انہوں نے فاضل چیف جسٹس پر عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا جس کے بعد نو ججوں پر ایک فل بنچ تشکیل دیا گیا جس میں ان پانچ جج صاحبان کے علاوہ چار مزید جج صاحبان شامل کیے گئے جو یہ ہیں:

1- مسٹر جسٹس وحید الدین

2- مسٹر جسٹس محمد اکرم

3- مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ

4- مسٹر جسٹس کرم الٰہی چوہان

لیکن بعد میں 23 جولائی کی مقررہ تاریخ کے مطابق مسٹر جسٹس قیصر خان ریٹائرڈ کر دیے گئے جبکہ یحییٰ بختیار صاحب نے استدعا کی کہ فاضل جج کو فیصلے تک بنچ میں شامل رکھا جائے لیکن عدالت نے مسٹر بختیار کی یہ درخواست مسترد کر دی لیکن جب ایڈہاک ججوں مسٹر جسٹس وحید الدین احمد اور مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ کی مدتِ ملازمت ختم ہونے لگی تو چیف جسٹس کے مشورہ سے حکومت نے مسٹر جسٹس وحید الدین کی مدتِ ملازمت اپیل کے فیصلہ تک اور مسٹر جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی مدتِ ملازمت میں جون تک توسیع کر دی اور پھر ایک دم 21 نومبر کو مسٹر جسٹس وحید الدین کو ہائی بلڈ پریشر اور بیماری کی بنیاد پر ریٹائر کر دیا گیا جبکہ یحییٰ بختیار نے اصرار کیا کہ فاضل جج نے چونکہ چھ ماہ تک مقدمہ کی سماعت کی ہے لہٰذا انہیں فیصلہ میں شریک کیا جائے اور مسٹر بختیار نے یہ بھی زور دیا کہ بنچ دوبارہ تشکیل دیا جائے لیکن چیف جسٹس نے فرمایا کہ فاضل جج کا بیماری کی بنا پر کام کرنا ناممکن ہے۔ یہ عدالتی توڑ پھوڑ بڑی توجہ طلب ہے۔ 9 ججوں کا فل بنچ سات ججوں کا بنچ رہ گیا اور پھر فیصلہ سب کے سامنے ہے، جب عدالت 3 اور 4 ججوں کے دو مختلف فیصلوں میں تقسیم ہو گئی۔ سپریم کورٹ سے سزائے موت کی بحالی کے فیصلہ کے بعد بین الاقوامی سطح پر جناب بھٹو کے متعلق تشویش زیادہ بڑھ گئی۔

www.bhutto.org

جنرل ضیاء نے جب بھی غیر ملکی پریس کو مقدمے کے بارے میں اور جناب بھٹو کی قسمت کے بارے میں جواب دیا تو اس نے ہمیشہ یہ کہا کہ وہ عدالتوں کا احترام کرتے ہیں اور عدالتی فیصلے کا احترام کریں گے اور وہ جو بھی فیصلہ دیں گی میں اس میں کسی قسم کی بھی تبدیلی نہیں کروں گا۔ جنرل ضیاء اپنے اس جواب میں ہمیشہ یہ تأثر دینے کی کوشش کرتا کہ ملک میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہے اور مارشل لاء عدالتوں کا احترام کرتا ہے۔ حالانکہ مارشل لاء نے عدلیہ کے اختیارات سلب کر لیے تھے۔ بھٹو کے خلاف مقدمہ قتل کی کارروائی نے پاکستان میں عدالتوں کے کردار کو مزید مشکوک بنا دیا اور عوام یہ یقین کرنے لگے کہ عدالتیں فوجی حکمرانوں کے زیرِ اثر ہیں۔

فوجی جنتا کے تحت چلنے والے عدالتوں کے انصاف اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مقدمہ کی کارروائی اور اس پر امریکی مداخلت کا کھلا ثبوت، سابق چیف آف سٹاف، ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی بریگیڈیئر سید احمد ارشاد ترمذی کے اس بیان کے بعد جو انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی، وہ لکھتے ہیں:

''جن دنوں پاکستان سپریم کورٹ میں نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں لاہور ہائی کورٹ سے دی جانے والی سزائے موت کے خلاف ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر بحث ہو رہی تھی۔ ہمارے ایک ''دوست'' نے جسے یو ایس آئی ایس کے ٹیلکس روم تک رسائی حاصل تھی مجھے Most Urgent کا خصوصی کوڈ پیغام بھجوایا۔ پیغام کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے میں فوری طور پر طے شدہ مقام پر پہنچا۔

راولپنڈی کے راجہ بازار میں پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی ایک ''فٹ پاتھ برانڈ'' مارکیٹ تھی جہاں اس وقت گاہکوں کا ہجوم تھا۔ میں نے دوست سے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کی۔ اس نے ایک کاغذ ریڑھی پر رکھے ہوئے ایک کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے فوری طور پر وہ کوٹ خرید لیا اور وہ پرچہ لے کر ایک قریبی فوٹو کاپی شاپ پر پہنچا اور فوٹو کاپی کروا کر اصل پرچہ اسی انداز میں ایک دوسری ریڑھی پر پڑے ایک کوٹ کی وساطت سے اسے واپس کر دیا۔ میں فوری طور پر دفتر واپس آیا تاکہ اس پیغام کا متن صحیح طور سے پرکھا جا سکے۔ میں نے راستے میں بھی اس پیغام کو پڑھنے کی کوشش کی مگر صرف اتنا جان سکا کہ یہ واشنگٹن سے بھیجا ہوا ایک ٹیلی گرافک پیغام ہے۔ دفتر آ کر جب میں نے اس پیغام کو ڈی کوڈ کیا تو مجھے یہ پڑھ کر شدید حیرت ہوئی کہ واشنگٹن سے پاکستان میں اپنے دفتر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ بھٹو کا پھانسی کے تختے تک پہنچنا یقینی بنایا جائے۔ اس پیغام میں بعض جنرل آفیسرز کی

ریٹائرمنٹ اور تبادلوں کے بارے میں بھی ہدایات موجود تھیں۔

میرے لیے یہ پیغام انتہائی غم و غصے کا باعث تھا۔ یہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں ایک طرح کی کھلی مداخلت کے مترادف تھا۔ ہمارے پاس بھٹو کیس میں امریکی مداخلت اور امریکہ کے ملوث ہونے کے اور بھی کئی ثبوت موجود تھے مگر یہ پیغام بین الاقوامی سفارتی آداب کی خلاف ورزی کی انتہا تھی۔ امریکہ نے اپنے طور پر اس وقت بھٹو کی موت کا پروانہ جاری کر دیا تھا جبکہ ابھی ان کا کیس پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت میں حتمی فیصلے کا منتظر تھا۔ پہلے بھی ہمارے پاس اس بات کے ثبوت تھے کہ بھٹو کے وکلاء لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے ایک کمرے میں بھٹو کے دفاع کے لیے جو پوائنٹس تیار کرتے تھے ان کی کاپی اگلے روز عدالت شروع ہونے سے پہلے سرکاری وکیل کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

بہرحال دفتر پہنچتے ہی میں سیدھا ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس جنرل ریاض کے پاس گیا اور انہیں وہ پیغام دکھایا۔ انہوں نے اس پیغام کو بار بار پڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پیغام خود ساختہ اور مقامی طور پر تیار کیا ہوا ہے تاکہ ہمیں غلط راستے پر لگایا جا سکے۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا جنرل صاحب کے لیے بھی مشکل تھا کہ اس طرح کے پیغام سے کسی مقامی ادارے یا شخص کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بہرحال خاصی گفتگو کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم پیغام اڑانے والے دوست سے اس کی صداقت کی مزید گواہی طلب کریں۔ میں نے رات گئے اسے بلوالیا اور جنرل صاحب صبح کی سفیدی نمودار ہونے تک اس سے سوالات کرتے رہے۔ پیغام بالکل درست تھا اور اسے خود ساختہ قرار دینا ہمارے دوست کی ''دیرینہ دوستی'' کو الزام دینے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود یہ کاغذ کا ٹکڑا ہمارے لیے ابھی تک ایک معمہ تھا۔ جنرل ریاض نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کسی سپیشلسٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم دوسری صبح ہی اسے لے کر جنرل جیلانی کے پاس پہنچے جو اس وقت سیکرٹری جنرل ڈیفنس تھے۔ انہوں نے اسے بغور دیکھا اور کہنے لگے ''آئی ایس آئی والوں کو انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی طاقتیں ہمارے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہیں۔'' جنرل جیلانی کے یہ الفاظ ہمارے ذہنوں کی وہ گرہیں نہ کھول سکے جنہیں لے کر ہم ان کے پاس گئے تھے۔

وہاں سے واپسی پر جنرل ریاض نے کہا کہ ہمیں اس کی قانونی حیثیت پر رائے حاصل کرنی چاہیے۔ مسٹر جسٹس شمیم حسین قادری ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے پرانے مراسم تھے اور مجھے ان کی ذہانت اور پیشہ ورانہ صلاحیت پر پورا بھروسہ تھا۔ میں اگلی فلائیٹ پر لاہور گیا اور انہیں یہ پیغام دکھایا۔ وہ بھی یہ فیصلہ تو نہ کر پائے کہ یہ پیغام درست ہے یا خود ساختہ تاہم

www.bhutto.org

انہوں نے ان الفاظ میں اس معاملے پر اپنی رائے کا اظہار کیا:

"قانونی طور پر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ اولاً اس لیے کہ وہ اس مبینہ قتل میں براہِ راست ملوث نہیں ہیں۔ ثانیاً اگر ہوئی تو بھی موت کی سزا متفقہ نہیں ہوگی۔ ججوں کی آراء میں واضح اختلاف لگتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ عدالتِ عظمیٰ کے جج بھی متفقہ فیصلہ نہیں دیں گے۔"

چیف جسٹس کے یہ الفاظ پیغام کی صحت کے بارے میں مجھے قائل کرنے کے لیے کافی تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بھٹو کو ضرور پھانسی دے دی جائے گی۔ اگر بھٹو قانونی طور پر موت کی سزا کے حقدار ہوتے تو اس پیغام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ پیغام بلاشبہ بھٹو کے عدالتی قتل کا حکم نامہ تھا۔ ہم نے اس پیغام کی کاپی صدر ضیاء کو بھجوا دی۔ ایوانِ صدر میں اس کا کیا ردِعمل ہوا اس بات کا ہمیں علم نہیں۔ بہر حال ظاہری طور سے سب قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور یوں امریکہ کے سر سے یہ "بلا" ٹل گئی۔

(از "حساس ادارے" بریگیڈیئر (ر) سید احمد ارشاد ترمذی، صفحہ 47 تا 49)

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کا عدالتی قتل

ذوالفقار علی بھٹو نے جس ہنگامہ خیز دور میں عوامی سیاست کا آغاز کیا، وہ ملکی اور عالمی سطح پر نظریاتی صف بندی کا دور تھا۔ انہوں نے پہلی بار پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست کو عوامی سطح پر مقبول انداز میں پیش کیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کی مخالفت میں دائیں بازو کے سیاسی گروپس اور دیگر رجعت پسند ریاستی ادارے تو تھے ہی مگر بائیں بازو کے انتہا پسند بھی تھے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے اسی قدر مخالف تھے جس قدر دائیں بازو کے لوگ۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بائیں بازو کے عوامی نظریات کو دانشورانہ بحثوں سے نکال کر گلی، محلے، کھیتوں، کھلیانوں، کارخانوں، سکولوں اور کالجوں میں متحرک کر دیا اور یوں پاکستان کی سیاست بھٹو کے حامیوں اور مخالفوں میں تقسیم ہو گئی۔

بھٹو اپنے مخالف محاذ کے سامنے جس میں دائیں بازو کی تمام سیاسی جماعتیں، بائیں بازو کی انتہا پسند قوتیں اور تمام ریاستی مشینری شامل تھی اپنے عوامی نظریات کی بنیاد پر بڑے دبنگ انداز میں میدانِ سیاست میں نمایاں ہو گئے کیونکہ سماج کے حقیقی محنت کش، درمیانہ طبقہ، نوجوان طلبا اور خواتین نے کھل کر ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دائیں بازو کی سیاسی قوتیں اور ریاستی مشینری میں شامل رجعت پسند ادارے ذوالفقار علی بھٹو کے ترقی پسند نظریات کے مخالف تھے اور ان کو یقین تھا کہ اگر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں ایک حقیقی عوامی جمہوری انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کر لیتے ہیں تو اس طرح نو آبادیات کی بنیاد پر قائم ریاستی ڈھانچہ ختم ہو جائے گا جو ان رجعتی قوتوں کا واحد سہارا ہے اور دوسری طرف بائیں بازو کے انتہا پسند دانشور ذوالفقار علی بھٹو پر بالکل اسی طرح الزام تراشی کر رہے تھے، جیسے مذہبی ملا مغرب پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ''انہوں نے اسلام کے فلاحی اصول چوری کر لیے ہیں جن کی بنیاد پر مغرب ترقی یافتہ ہو پایا۔''

www.bhutto.org

پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ایک طویل منصوبہ بندی کی گئی اور ان قوتوں نے بھٹو کو شیطان قرار دینے کی کوشش کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کا کینوس پاکستان تک ہی محدود نہیں تھا، وہ تیسری دنیا کی سیاست میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے، اسی لیے سرد جنگ کے ان آخری سالوں میں روز بروز زور پکڑتی سامراجی قوت امریکہ ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے علاقائی مفادات کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتا تھا۔ اس کے لیے جو منصوبہ بندی کی گئی، اس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کو صرف اقتدار سے علیحدہ کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ ان کی کردار کشی سرفہرست تھی، جس میں ان کو قاتل، خائن، منتقم، غدار، کافر اور شیطان کے طور پر پیش کرنا تھا۔ اس ساری مہم میں پاکستانی ذرائع ابلاغ نے انتہائی گھناؤنا کردار ادا کیا۔

یہ طے کیا گیا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی کردار کشی کے بعد انہیں جسمانی طور پر ختم کر دیا جائے۔ لاہور ہائی کورٹ میں جب ان کے خلاف مقدمۂ قتل چل رہا تھا تو چیف جسٹس مولوی مشتاق نے ان کے لیے ایک خصوصی کٹہرا بنوایا اور جب ان کو سزائے موت کا سزاوار ٹھہرایا گیا تو عدالت نے ذوالفقار علی بھٹو کو صرف نام کا مسلمان قرار دیا اور دورانِ مقدمہ اور فیصلے میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کو ''بڑا ملزم'' قرار دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی کردار کشی کی اس مہم میں ریاستی مشینری، دائیں بازو کی قوتیں اور ان کا حامی میڈیا ہراول دستے کا کام کر رہا تھا۔ مقصد ایک ہی تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو ''عبرتناک مثال'' بنا کر پیش کیا جائے تا کہ آئندہ کوئی شخص جاگیرداری، سرمایہ داری اور امریکی مفادات کے خلاف چیلنج بن کر سامنے نہ آئے۔ جنوری 1977ء میں بھٹو حکومت نے عام انتخابات کا اعلان کیا تو ان کے خلاف دائیں بازو کی 9 جماعتیں پاکستان قومی اتحاد کے نام پر اکٹھی ہو گئیں۔ پہلے انہوں نے مارچ 1977ء میں انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا اور پھر یکایک نظامِ مصطفیٰؐ کی تحریک کا اعلان کر دیا، اس دوران پاکستان میں بے دریغ امریکی ڈالرز آئے اور ڈالر کی قیمت حیرت انگیز حد تک گر گئی۔ اس ڈرامے کا آخری منظر 5 جولائی 1977ء کو چیف آف سٹاف جنرل ضیاالحق کی طرف سے پاکستان میں مارشل لا مسلط کیا جانا تھا۔ عدالتِ عظمیٰ نے آئین معطل کرنے والوں کو نظریۂ ضرورت جیسی اصطلاح گھڑ کر قانونی حیثیت دے دی اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کردار کشی کی مہم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہیں کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔

3 ستمبر 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر کے لاہور لایا گیا، جہاں ان کو مارشل لاء حکام نے لاہور چھاؤنی کی ایک ملٹری رہائش گاہ میں منتقل کیا گیا۔ 8 ستمبر کو جنرل ضیاءالحق نے تسلیم کیا کہ مسٹر

بھٹو کو احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کے الزام میں لاہور کے ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا ہے پھر یکا یک مقدمہ سیشن کورٹ میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں سے مولوی مشتاق حسین نے یہ مقدمہ اپنی عدالت میں منتقل کر لیا۔ اس دوران جسٹس کے ایم صمدانی نے ذوالفقار علی بھٹو کو 13 ستمبر 1977ء کو ضمانت پر رہا کر دیا لیکن پنجاب ہائی کورٹ نے فوراً ہی مسٹر بھٹو کی ضمانت منسوخ کر دی۔ پنجاب ہائی کورٹ میں 6 ماہ تک مقدمے کی کارروائی کے بعد 18 مارچ 1978ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو موت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ 405 صفحات پر مشتمل فیصلہ جسٹس آفتاب حسین نے لکھا۔ مولوی مشتاق حسین نے فیصلے کے آخری پانچ صفحات پڑھ کر سنائے۔

ایف ایس ایف کے سربراہ مسعود محمود کو مارشل لاء حکومت نے 5 جولائی 1977ء کو ''حفاظتی تحویل'' میں لے لیا تھا۔ وہ اس مقدمے میں سلطانی گواہ کے طور پر پیش ہوا جبکہ سابق ڈائریکٹر ایف ایس ایف میاں محمد عباس، انسپکٹر غلام مصطفیٰ، سب انسپکٹر ارشد اقبال اور سب انسپکٹر افتخار احمد کو بھی ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ سزائے موت کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ اس فیصلے میں متعدد قانونی تضادات تو اپنی جگہ موجود ہیں ہی لیکن بنیادی طور پر اس مقدمے کے فیصلے کی بنیاد مسعود محمود اور غلام حسین کی وعدہ معاف گواہی کے علاوہ ایف ایس ایف کے چاروں اہل کاروں کے اعترافی بیانات ہی بنے۔ جب نواب محمد احمد خان کے قتل میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایف آئی آر کاٹی گئی تو راؤ رشید پنجاب کے آئی جی تھے۔ اس مقدمے کی حقیقت کا کچھ اندازہ راؤ رشید کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

''یہ قتل اس وقت ہوا تھا، جب میں آئی جی پولیس پنجاب تھا۔ قید کے دوران فوجی حکام نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں مقدمے کے سرکاری گواہ کے طور پر پیش ہو جاؤں اور استغاثہ کی تائید کروں۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بجائے میں نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ استغاثہ کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ان کے دفاع میں گواہ کے طور پر پیش ہونے کو تیار ہوں۔

چونکہ مجھے مسٹر بھٹو کو پھانسنے کے لئے تیار کردہ جال کے لئے خطرہ تصور کیا جاتا تھا، اس لئے مجھے اس وقت تک قید رکھا گیا جب تک عدالت نے انہیں خطاوار قرار دے کر سزائے موت نہیں دے دی۔ مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی، اس کے ساتھ میرا بیانِ حلفی بھی منسلک تھا، جس نے استغاثے کے مؤقف کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی اپیل کی سماعت سے پہلے لاہور میں رانا افتخار کا چھوٹا بھائی مجھے ملنے آیا۔ رانا افتخار نے اس مقدمہ قتل میں اعترافی بیان دیا تھا جس کی

www.bhutto.org

بنیاد پر اسے بھی دو دیگر ملزمان کے ہمراہ سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے اور وہ میری مدد لینے آیا ہے۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جنرل چشتی نے مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں اس کے بھائی رانا افتخار کو بلا کر کہا تھا کہ اگر وہ استغاثے کی کہانی کی تائید کریں تو انہیں معافی دے دے جائے گی یا معمولی سزائیں دی جائیں گی، جنہیں آخرِ کار معاف کر دیا جائے گا۔ مولانا طفیل محمد نے بھی جو ملزم سب انسپکٹر ارشد اقبال کے ہمسایہ تھے، ضمانت دی۔ ان کے خاندان کو اُمید تھی کہ مقدمے کے اختتام پر اس کے بھائی کو رہا کر دیا جائے گا لیکن جب اسے مسٹر بھٹو کے ساتھ سزائے موت سنا دی گئی ہے تو وہ دم بخود رہ گئے۔" (از "جو میں نے دیکھا" راؤ رشید)

پنجاب ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں ایک اپیل دائر کی گئی۔ 27 مارچ 1978ء کو چیف جسٹس انوار الحق نے پانچ ججوں پر ایک بنچ قائم کیا۔ جن میں انوار الحق، داراب پٹیل، قیصر خان، محمد سلیم اور جسٹس صفدر شاہ شامل تھے۔ 20 مئی کو مسٹر بھٹو نے چیف جسٹس انوار الحق پر عدم اعتماد کا اظہار کیا، اس کے بعد 9 ججوں پر مشتمل ایک نیا بینچ قائم کیا گیا جن میں جسٹس وحید الدین، جسٹس محمد اکرم، جسٹس نسیم حسن شاہ اور جسٹس کرم الٰہی چوہان شامل تھے۔ بعد میں جسٹس قیصر خان کو ریٹائر کر دیا گیا، جبکہ دو ایڈ ہاک جج وحید الدین اور نسیم حسن شاہ کی مدتِ ملازمت میں توسیع کر دی گئی اور پھر یکا یک 21 نومبر 1978ء کو جسٹس وحید الدین کو ریٹائر کر دیا گیا۔ جس سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فوجی حکومت عدالت کے معاملات میں کس طرح مداخلت کر رہی تھی۔

اگرچہ ابھی تک ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کے لیے تیار کردہ استعماری سازش کے مستند دستاویزی ثبوت سامنے نہیں آئے لیکن اگر ہم مسٹر بھٹو کی سیاست، پاکستان کے اندرونی و بیرونی معاملات کی کڑیاں جوڑنا شروع کریں تو یہ منکشف ہوتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرنے کے لیے ایک عالمی سازش کارفرما تھی جس کے پاکستان کے اندر کئی مہرے تھے۔ غیر ملکی اور داخلی رجعتی قوتوں نے سازش کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کو جسمانی طور پر تو ختم کر دیا مگر ذوالفقار علی بھٹو ناانصافیوں سے ماورا ہو گئے۔ آج تین دہائیوں کے بعد تاریخ کی عوامی عدالت نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے اور وہ شخص جسے ریاستی مشینری، میڈیا اور رجعتی قوتیں شیطانی روپ میں پیش کرنے کے لیے "سر دھڑ کی بازی" لگاتی رہیں، ایک غیر متنازعہ سیاسی بطلِ رشید کے روپ میں ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اب ہر مکتبِ فکر ذوالفقار علی بھٹو شہید کو پاکستان اور

تیسری دنیا کا ایک مخلص لیڈر گردانتا ہے اور جو لوگ عدالتوں میں ''منصف'' کی حیثیت سے بٹھائے گئے، وہ عوام میں اپنے جانبدار ہونے کا اعتراف کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو جس سیاست کی سربلندی کے لیے تختۂ دار پر چڑھائے گئے، اس سیاست کا پرچم بلند کرنے کے دعوے تو کیے گئے لیکن ابھی تک حقیقتاً ایسا نہیں ہوا۔ تاہم تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا، جب 4 اپریل 1979ء کو تختۂ دار پر جھولنے والے ذوالفقار علی بھٹو کی مشعل دوبارہ روشن کی جائے گی۔ یہ مشعل وہی لوگ اٹھائیں گے جو ذوالفقار علی بھٹو کی طرح انقلابی تصورات رکھتے ہیں اور عوام کی طاقت پر یقین رکھتے ہیں۔

www.bhutto.org

پروانے جو جل اُٹھے

7x10 سائز کی کوٹھڑی میں مقید عوامی راہنما ذوالفقار علی بھٹو اپنے خلاف سازش کے ساتھ نبرد آزما رہا اور کسی قسم کے سمجھوتے کو قبول نہ کیا۔ اتنے مشکل حالات میں بھی اس راہنما نے جو سزائے موت کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید تھا، جس نے 3 ماہ تک سورج کی روشنی کو بھی نہ دیکھا، جس کے کمرے میں پاخانے کے لیے ایک کموڈ رکھ دیا گیا اور پردے کا انتظام بھی نہ کیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ تذلیل کی جا سکے اور کمرے میں گندی فضا پیدا کرنے کے لیے ہوا کے اخراج کا انتظام بھی نہ کیا گیا تھا۔ کبھی چھت کے اوپر کمانڈو کودتے اور ساری ساری رات بے سکونی پیدا کرنے کے لیے ٹین کی چھت پر پتھر پھینکے جاتے اور نوبت یہاں تک اذیت ناک تھی کہ 25 دن تک ملک کے پہلے منتخب وزیرِاعظم کی کوٹھڑی میں پانی بھی بند کیا گیا۔ کیا یہ سب کچھ اسلام ہے؟ ذوالفقار علی بھٹو نے ان مصائب اور نفسیاتی حملوں کا جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ہمت نہ ہاری۔ بقول قائدِ عوام کے:

"میں اس صبر آزما مصیبت کا سامنا اپنی ہمت، استقلال اور قوتِ ارادی سے کر سکا اور یوں بھی کہ میں ایک لیڈر ہوں۔ کوئی بھی عام آدمی ان حالات میں عرصہ پہلے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا۔ یقین کیجئے میرے ساتھ انتہا کا ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا۔ انتہائی ذلت آمیز۔ میرے معروضی خدشات کے مطابق بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اس میں میری عزت، میرے خاندان کا وقار، میرا سیاسی کیریئر اور سب سے زیادہ یہ کہ بذاتِ خود ملک کا مستقبل ملوث ہے۔"

(18 دسمبر 1978ء کو سپریم کورٹ میں خطاب)

وہ شخص جس نے ایک امیر جاگیردار گھرانے میں آنکھ کھولی ہو، جس کو زندگی کی تمام

آسائشیں میسر ہوں لیکن وہ شخص جب اپنی جدوجہد اور اپنی عملی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو اپنے ہی طبقے کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، نچلے اور متوسط طبقے کے مفادات و حقوق کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ کئی لوگ اس پر شبہ کرتے ہیں، اس کے قول پر شبہ کا اظہار کرتے ہیں لیکن جب وہ سزائے موت کی کوٹھڑی میں ان مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے تو اس کی سچائی کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یہ ہی اس کے انقلابی اور سوشلسٹ ہونے کی عالمگیر مثال ہے۔ بھٹو کے اس کردار نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ متوسط اور نچلے طبقوں کا نمائندہ ہے۔

بھٹو نے جیل میں بھی اپنی قوم اور ملک کی سلامتی اور ترقی کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ انہوں نے ایک ایک لحہ ملکی حالات و سیاست اور اردگرد کے واقعات اور فوجی حکمرانوں کی شرارتوں اور کرتوتوں پر نظر رکھی۔ بھٹو نے پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنی پرخلوص سیاست کو جاری رکھا۔ اس سلسلے میں وہ خط بڑا اہم اور تاریخ ساز ہے جو جناب بھٹو نے موت کی کوٹھڑی سے فرانس کے صدر جسکارڈ کے نام لکھا:

"ڈیئر مسٹر پریذیڈنٹ

اگر موت کی اس کال کوٹھڑی سے جس پر سخت ترین حفاظتی پہرہ ہے ہاتھ باہر نکالنا اتنا مشکل نہ ہوتا تو میں آپ کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنے کے لیے بہت پہلے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت جبکہ میں زندگی اور موت کے ترازو میں جھول رہا ہوں مسٹر صدر آپ جانتے ہیں میرا فخر اور دل کی سچائی آپ کے مفکرانہ لگاؤ کے نتیجے میں ممنونیت کے اظہار پر پیش از وقت مجبور کر رہی ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو لیکن میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک معصوم آدمی کی عزت بچانے کے لیے آپ نے جس جذبے کا مظاہرہ کیا ہے اس سے آپ اور آپ کے ملک کے عوام نے پاکستانیوں کے دل جیت لیے۔

فرانس 1789ء سے پہلے خاص طور پر اس کے بعد عام طور پر مغربی تہذیب کا عظیم مرکز رہا ہے۔ لگ بھگ 1958ء تک فرانس جنت کی نظیر بنا رہا اس سے پہلے مجھے یورپ کے بارے میں اس انداز سے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یورپ کے وہ سامراجی عزائم ہیں جن کے سامنے میں ہمیشہ سینہ سپر رہا ہوں۔

آپ نے کمیونسٹ چیلنج کا براہِ راست اپنی ٹیکنالوجی اور ٹیکنیک کے ساتھ مقابلہ کیا

ہے۔ خارجی طور پر ایک سرد جنگ لڑی ہے اور اپنے دفاع کو تقویت بخش کر طاقت کا توازن قائم کر لیا ہے۔ کمیونسٹ ریاستوں کے ساتھ آپ کے روابط کی حالت حوصلہ کن ہے۔ روس اور چین کے ساتھ آپ کے تعلقات کا توازن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

داخلی طور پر یورپ کو کمیونزم اور اس قسم کے دوسرے نظامِ حکومت کے اثرات کی وجہ سے فوجی بغاوت کی ایسی ''چیونگم'' سے چھٹکارا حاصل کرنے کا عظیم مسئلہ درپیش ہے جسے ان فوجی ڈکٹیٹروں نے جنم دیا ہے جو قانون کی بحالی کے نام پر حکومتوں کا تختہ الٹتے لیکن لاقانونیت کو رواج دیتے ہیں۔ یہ لوگ آئینی اتھارٹی کو کمیونزم کی دھمکی کے نام پر بے اختیار کرتے ہیں۔ ان کی پشت پناہی کی وجہ سے یورپ نے خود اپنے اندر تباہی کے بیج بوئے ہیں اور یہی لمبی مساوات میں بنیادی اختلاف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ میرے اس خیال سے اتفاق نہ کریں کیونکہ فرانس نے دو غیر معمولی پیشہ ور سپاہی پیدا کیے ہیں جن کی قیادت میں آپ کے ملک نے قابلِ ذکر ترقی کی ہے:

1- نپولین بوناپارٹ

2- چارلس ڈیگال

مذکورہ بالا تیسری دنیا کا اہم ترین مسئلہ ہے لیکن میں فی الحال صرف اپنے ملک کی بات کروں گا۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب بڑی قدیم اور پروقار ہے لیکن اس وقت یہ وادی ایک بیمار پانی سے سیراب ہو رہی ہے کہ یہاں کے باشندوں کو خوف اور دہشت کی بہت لمبی راتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

آزادی سے لے کر اب تک یہ ملک تین بار فوجیوں کی حکومت کے تجربے سے گزرا ہے۔ ہر کامیاب فوجی بغاوت اس ملک کو پہلی فوجی بغاوت کے دور سے بھی کمزور تر کرتی رہی ہے۔ اگر یہی حادثے بھارت کو پیش آتے تو وہ اب تک تین یا چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔ جی ہاں لاقانونیت تو ہندوستان میں بھی ہے لیکن وہاں جمہوریت کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ ان کا بُرے سے بُرا سیاست دان بھی ہمارے ڈکٹیٹروں سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔ میں عظیم فتوحات کا امین ہوں اور میری رگوں میں جنگجو بہادروں کا خون دوڑ رہا ہے۔ میں نے دو بار فوجی آمریت کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے آخرِ کار تیسرے میں موت کے گھاٹ اتارے جانے کا حکم پا چکا ہوں لیکن اگر مجھے قتل کیا جاتا ہے تو میرا لہو برِصغیر کے نوجوانوں، مردوں اور عورتوں کے چہروں پر ایسی سرخی بن کر ابھرے گا جیسی بہار کے موسم میں فرانسیسی گلاب کی پتیوں میں ہوتی ہے۔

www.bhutto.org

میں پندرہ سال کی عمر سے آزادی کے لیے غیر متزلزل جنگ لڑ رہا ہوں۔ میں نے نہرو اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے شانہ بشانہ کام کیا ہے۔ میں نے ڈیگال کو ان کے عروج کے زمانے میں دیکھا ہے۔ مجھے ماؤزے تنگ کی عزت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ میری سیاست رومانس اور شاعری کا امتزاج ہے۔

میں نے آج تک سوائے عوام کے کسی سے محبت نہیں کی اسی لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ''عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں۔'' یہ کوئی سیاسی نعرہ نہیں بلکہ میرا غیر فانی اعتقاد ہے۔

چاہے مغرب کی خودغرض طاقتیں اور مشرق کے اندھے خواہشمند، انسان کو تیسری جنگِ عظیم کے دہانے پر لے جائیں، انسان اس چتا کے جشن کی راکھ سے اور بھی زیادہ طاقتور ہو کر ابھرے گا۔ سب سے زیادہ خوبصورت بات یہ ہے کہ ایک مرے ہوئے شخص کے لیے مرنے میں فتح سمجھی جائے گی اور مرنے والے کی قبر سے فتح و نصرت کے پھول اُگیں گے۔

لہٰذا مسٹر پریذیڈنٹ اگر میں زندہ رہا تو میں ہر حال میں اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کتنی بھی بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے۔ عوام کی بھلائی کے لیے میرے مقاصد کے حصول کی خاطر میرے خاندان کو ناقابلِ برداشت حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن میری جدوجہد کا یہ واحد تکلیف دہ مرحلہ ہے۔

مجھے امید ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے آپ پر جو بوجھ ڈالا ہے اسے آپ نے محسوس نہیں کیا ہوگا کہ ایک بیٹا آخر اپنے باپ کے لیے اتنا کچھ کرنے کا حق تو رکھتا ہے۔ جہاں تک اس علاقے میں ہونے والی حالیہ تبدیلیوں کا تعلق ہے تو میرے خیال میں ان پر بحث کرنے سے پہلے ان خطرات کا ذکر زیادہ ضروری ہے جن کا پاکستان کو اندرونی طور پر سامنا ہے۔ پاکستان کو اندرونی خطرات سے بچانا پہلی ضرورت ہے بہ نسبت خود کو کسی نئے یا پرانے بیرونی خطرے سے آگاہ کرنے کے دوسرے الفاظ میں پہلے کام۔

آپ کے ملک سے میری محبت کو بھی آپ جانتے ہیں اور آپ سے متعلق میں جو جذبات رکھتا ہوں انہیں بھی آپ جانتے ہیں۔ اگر میں زندہ رہا تو ہم بلاشبہ انسانیت کی بھلائی کے اقدامات سے حاصل ہونے والی خوشیاں مشترکہ طور پر محسوس کریں گے۔

لیکن اگر میں مارا جاتا ہوں تو میں آپ کو دوبارہ ملنے تک کے لیے اس دعا کے ساتھ خدا

www.bhutto.org

حافظ کہتا ہوں کہ میرے ملک کے لوگوں کو مفلسی، بے بسی، بے کسی اور بھیک مانگنے سے بچانے کے لیے بہتر لوگ آئیں۔

"قاتل" قرار دیئے گئے شخص کی حیثیت سے میں اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ میں آپ کو دوست کہوں لیکن مہربانی فرما کر میرے عزت اور احترام سے پُر جذبات اپنی وفادار اور قابل بیوی کو پہنچا دیجئے اور اپنے بیٹے ہنری کو میرا شفقت بھرا سلام کہیے۔

سمندر جیسی وسیع عزت اور گہرے لگاؤ کے ساتھ۔

ذوالفقار علی بھٹو"

کہتے ہیں کہ موت کی کوٹھڑی میں پھانسی کا منتظر قیدی سچائی کی انتہا پر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے جناب ذوالفقار علی بھٹو کا یہ خط، ذوالفقار علی بھٹو کی جدوجہد، سچائی و ایمانداری، حوصلہ مندی، عوام سے پیار، استحصال سے نفرت، سامراج سے لڑنے کا عزم اپنی زندگی کا نصب العین اور اپنی قوم کے لیے بھلائی کی امیدوں کے ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ بھٹو نے اپنے مؤقف میں تبدیلی نہ کی اور جدوجہد پر کاربند رہنے کا اظہار کیا۔ یہ سچائی و جرأت کی انتہا ہے کہ بھٹو نے فرانس کے قابلِ احترام صدر مسٹر جسکارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں یورپ کے سامراجی عزائم کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہا ہوں، میں یورپ کے استحصال کا دشمن ہوں۔ یہ جملہ جناب بھٹو کی جرأت کی ایک مثال ہے۔ یہی خوبی مسٹر بھٹو کو دوسرے ہمعصر سیاستدانوں سے منفرد ثابت کرتی ہے۔ بھٹو تاریخی حوالے سے یورپ کے سیاسی کردار کو اپنے اس خط میں زیر بحث لاتے ہیں تو حقائق کو قطعاً نظر انداز نہیں کرتے اور کھل کر بڑے واضح انداز میں تاریخی حقائق کا حوالہ دے کر اپنا مؤقف اور نصب العین بیان کرتے ہیں۔

پھر جیل میں قید ہونے کے باوجود جناب بھٹو کی اپنے عوام کی بھلائی کے لیے نیک خواہشات و جدوجہد قابلِ تحسین ہے اور پھر یہ عہد کہ اگر میں بچ گیا تو بھی اپنی اس جدوجہد کو ترک نہ کروں گا جس کے سبب میں پھانسی کے پھندے تک پہنچ گیا ہوں۔ مسٹر بھٹو کے یہ الفاظ اس بات کا عملی اظہار ہیں کہ انہوں نے اپنے عوام سے عشق کیا ہے۔ بھٹو کا یہ خط ایک انقلابی شاعر کا خط معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسا شاعر جو اپنی دھرتی سے پیار و عشق کرتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ میرا قتل، میرا خون اس دھرتی میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنے گا اور میں اس قربانی کے لیے تیار

www.bhutto.org

ہوں۔ دراصل یہ خط جناب بھٹو کی ولولہ انگیز رومانوی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ خط جناب بھٹو کی شخصیت کا نچوڑ ہے۔ اس ایک خط میں جناب بھٹو کی شخصیت تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گئی ہے۔ جب انقلابی قتل گاہوں میں جدوجہد کرتے ہوئے ڈٹے رہتے ہیں تو ان کے جذبات و احساسات اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

بلغاریہ کے ایک عظیم انقلابی شاعر نکولا واپٹ ساروف، جس کو فاشسٹ حکومت نے آزادی اور انقلاب کے جرم میں سزائے موت سنائی تو جب نکولا واپٹ ساروف کو فائرنگ سکواڈ کی طرف قتل کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو اس وقت 32 سالہ اس انقلابی شاعر کے جذبات و خیالات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ نکولا واپٹ ساروف نے کہا کہ:

"فائرنگ سکواڈ کے بعد کیڑے مکوڑے ہی اس جسم کا مقدر ہوں گے یہی زندگی کا صاف اور سادہ اسلوب ہے لیکن جب طوفان بپا ہوگا ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔

میرے لوگو یاد رکھنا ہم نے تم سے محبت کی ہے۔

جب ذوالفقار علی بھٹو ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں اپنے خلاف سازش کا مقابلہ کر رہے تھے تو پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ایک فیصلہ کن تحریک چلانے کا عزم کیا جس کے تحت پیپلز ایکشن کمیٹیاں بنائی گئیں جس کے پلیٹ فارم سے لوگوں نے نہ صرف گرفتاریاں دیں بلکہ خود کو جلا ڈالا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جیلوں میں بند کر دیئے گئے اور ان کو سخت ترین سزائیں سنائی گئیں۔

گو اس بات سے کئی لوگ اختلاف کرتے ہیں کہ پیپلز ایکشن کمیٹیوں کی طرف سے جو تحریک چلائی گئی وہ درست نہیں تھی۔ اس میں جو اصول اپنایا گیا بے شک وہ کسی تحریک کے آخری مراحل میں ہی اپنایا جاتا ہے یعنی سیاسی کارکنوں کی خودسوزی لیکن دوسری جانب مسٹر بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں تحریک کو ابھارنے کے لیے یہ اقدامات نامناسب نہیں دکھتے کیونکہ حکومت نے تشدد و جبر سے خوفزدہ ماحول بنا لیا تھا جو کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے لیے سازگار تھا جبکہ ملک بھر میں پاکستان پیپلز پارٹی تنہا سیاسی جماعت تھی جو مارشل لاء کے خلاف بھی صف آراء تھی اور اپنے چیئرمین کی رہائی کے لیے بھی کوشاں تھی۔ حکومت کے فیصلے اور حکمتِ عملی بالکل واضح تھی کہ وہ مسٹر بھٹو کو پھانسی کی سزا دے گی۔ ایسے وقت

میں جب کوئی سزائے موت کا منتظر ہو اس کے حامیوں کی طرف سے کسی بھی انتہائی اقدامات ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا عوام کا خوف و ہراس ختم کرنے کے لیے، عوام کے ذہنوں سے آمریت کا ڈر ختم کرنے کے لیے یہ اقدامات درست اور بروقت دکھائی دیتے ہیں۔

درحقیقت پاکستان پیپلز پارٹی نے تو 5 جولائی 1977ء ہی سے مارشل لاء کے خلاف جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ مارشل لاء لگتے ساتھ ہی پی پی کے کارکنوں نے کوڑے کھا کر اور جیلیں بھر کر یہ ثابت کر دکھایا کہ ہم مارشل لاء کو مسترد کرتے ہیں۔ کئی ایسے مواقع بھی آئے کہ بیک وقت ملک بھر کی جیلوں میں بیس ہزار تک سیاسی کارکن آمریت کے خلاف قید تھے۔ یہ پیپلز پارٹی کے انقلابی رجحان کی زندہ مثالیں ہیں جن کو بھلانا ناممکن ہے لہٰذا کارکنوں کی خودسوزی نے یکدم صورتِ حال کو واقعی بدل ڈالا اور عوام نے ان مظاہروں میں پہلے کی نسبت زیادہ تعداد میں شرکت کی۔

یکم اکتوبر 1978ء کو شام چھ بج کر اڑتیس منٹ پر شہید چوک راولپنڈی میں دو شعلے نمودار ہوئے۔ جمہوریت کے پروانے انقلاب کے مجاہد اور ذوالفقار علی بھٹو کی جدوجہد کے ساتھی غریب و محنت کش۔ ایک حساس شاعر راشد ناگی اور دوسرا پروانہ محنت کش عبدالوحید قریشی، دونوں شعلہ بن کر روشن ہونے کے لیے پنجاب کے زرخیز خطے گوجرانوالہ سے آئے تھے۔

شہید چوک میں ہزاروں افراد ان پروانوں کا ساتھ دینے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ پولیس نے عوام کو متعدد بار منتشر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی۔ جیسے ہی پنجاب کے یہ عظیم دلیر سپوت ایک شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئے تو فضا جیوے جیوے بھٹو جیوے، آئین بحال کرو، آمریت مردہ باد، جمہوریت زندہ باد، انقلاب زندہ باد، بھٹو کی تصویر بے نظیر، اور مارشل لاء مردہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ دونوں پروانے شعلہ بدن دیوانہ وار بھنگڑا ڈالتے ہوئے بھٹو کی رہائی کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے جسموں کو لگی ہوئی آگ نے اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن پیدا کر دی تھی۔ لوگوں کے دلوں سے آمریت کے خوف کے خاتمے اور جمہوریت کی بالادستی کے لیے یہ اقدام تاریخ ساز ہے۔ جہاں پر آزادی اور انسانی حقوق سلب کر لیے جائیں وہاں اس قسم کے مظاہرے وہاں کے عوام کے دلوں کی آواز ہوتے ہیں۔ جہاں پر انصاف کے نام پر قتل و غارت ہو اور ''چادر اور چاردیواری'' کے نعرے کے باوجود خواتین کے سروں پر ڈنڈے برسائے جائیں وہاں پر اس قسم کے واقعات کا ہونا قدرتی امر ہے۔ راشد ناگی

www.bhutto.org

اور عبدالوحید قریشی نے وہاں پر موجود لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا اور بے حس، خود غرض نام نہاد، جمہوریت کے علمبرداروں کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس واقعہ نے ملک بھر میں ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ اپنے جسموں کو آگ کی نذر کرنے سے قبل ان پروانوں نے جو تحریری بیان دیا وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ اور خصوصاً اس آمریت کے دور میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

''ہم اپنے شہر سے 130 میل دور آ کر یہ انتہائی اقدام اس لیے کر رہے ہیں تا کہ کروڑوں عوام کے محبوب راہنما چیئر مین بھٹو اور عوام کے درمیان دوری ختم ہو جائے اور اس ملک کے عوام پر جو اندھیرے مسلط کیے گئے ہیں انہیں ختم کیا جائے۔ سامراج اور اس کے گماشتے اور ایجنٹ عوام پر کوڑے برسا کر اور آرڈیننسوں کی تلواروں سے زبانیں کاٹ کر جبری خاموشی کی فضا پیدا کیے ہوئے ایک حقیر سی اقلیت کو ایک واضح اکثریت پر جبر و تشدد کے ذریعے مسلط کر دیا ہے۔ عظیم لوگ وہی ہوتے ہیں جو تاریخ کے ماتھے پر اپنی عظمت کے جھومر سجاتے ہیں۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت ہزار درجہ بہتر ہے۔''

ظالمو جیا کرو بھٹو کو رہا کرو، کا یہ نعرہ ان کی زبان پر رواں تھا۔ جسم آگ سے جھلس چکا تھا اور پولیس ان پر لاٹھیاں برسا رہی تھی جب نڈھال ہو گئے تو سٹریچر پر ان کو ڈالا گیا لیکن پروانوں کی زبان پر اپنے محبوب قائد کی زندگی و رہائی کا نعرہ تھا۔ ہسپتال میں عبدالوحید قریشی کو خصوصی وارڈ میں داخل کروایا گیا۔ جو لوگ عظیم قائد کے ان پروانوں سے ملاقات کرنا چاہتے تھے ان کو روکا گیا اور پولیس نے ان دونوں سپوتوں کے گرد پہرہ لگا دیا۔

راشد ناگی ایک انقلابی شاعر ہے۔ 37 سال (1978ء کے وقت کی عمر) کا یہ جوان والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ والد انتقال کر چکے تھے اور وہ ماں کی آنکھوں کا تارا ہے۔ سہرا باندھنے کی حسرتیں ماں کے دل میں موجزن تھیں لیکن راشد ناگی نے ملکی حالات کے پیش نظر آگ کو اپنا سہرا بنایا۔

عبدالوحید قریشی کے بقول اس کے ماں باپ نے 1947ء میں اپنے وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور اب وہ اپنے قائد اور ملک کو بچانے کے لیے نذرانہ پیش کر رہا تھا۔ پھل فروخت کر کے اپنے ہاتھوں سے حلال رزق کمانے والا یہ محنت کش چار بچوں کا باپ تھا، تینوں بچوں کو اپنی بڑی شادی شدہ بیٹی کے پاس چھوڑ آیا۔ کیونکہ وحید قریشی کی بیوی انتقال

www.bhutto.org

کر چکی تھی۔ انہیں وصیت کی کہ ''وہ اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلیں، بھٹو اور پاکستان کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے سے گریز نہ کریں۔''

عبدالوحید قریشی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔ عبدالوحید قریشی شہید عوام کی جدوجہد کا ایک ایسا شہید ہے جس نے کرب و مایوسی کو ٹھکرا کر اس تشدد بھرے ماحول میں زندہ رہنے کے بجائے موت کو ترجیح دی اور اس نے کرب زدہ ماحول میں جینے اور مرنے کا ڈھنگ سکھایا یہ ہے غریبوں کی بھٹو سے محبت کی انتہا۔

خون ویکھ کے میریاں سدھراں دا ٹھنڈ پئی نہ فیر وی ظالماں نوں
مرن پچھوں وی میرے رقیب ویکھو، پھڑ کے لاش نوں سولی چاڑھ دے رہے
(راشد ناگی)

محبت کے اظہار کا یہ انداز اور جدوجہد کا یہ طریقہ چلتا رہا اور پھر دو اور پروانے 2 اکتوبر 1978ء کو بھاٹی گیٹ لاہور کے باہر جل اٹھے۔ عوام کی سیاست سڑکوں پر، عوام کی محبت سڑکوں پر، عوام کا بھنگڑا سڑکوں پر، عوام کا فیصلہ سڑکوں پر، شعلوں میں اسیران پروانوں نے کہا:

''ہمارا کوئی نام نہیں۔ کوئی نام ہے تو وہ ذوالفقار علی بھٹو ہے۔''

بھٹو کے یہ دو پروانے یعقوب پرویز مسیح اور عبدالرشید عاجز اردو بازار سے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو آگ لگا کر نمودار ہوئے۔ وہی نعرے وہی عشق، وہی انداز، وہی جوش اور وہی حوصلے جو ایک دن پیشتر راولپنڈی کے شہید چوک میں دیکھنے کو آئے تھے۔ عبدالرشید عاجز لائل پور کا محنت کش پروانہ یا علیؑ مدد، بھٹو کو رہا کرو، جل جانا منظور ہے بھٹو کو بچانا ضرور ہے، کے پر جوش نعرے لگاتا رہا دس منٹ تک عشق کا یہ اظہار جاری رہا اور پھر نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔

اسی طرح یعقوب پرویز مسیح بھی ایلی ایلی لما سبقتنی، کا نعرہ لگاتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ وہی نعرہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر چڑھتے وقت لگایا تھا:

ایلی ایلی لما سبقتنی (اے خدا، اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا!)

شعلوں میں جھلسے ان دونوں مجاہدوں کو کارکن ہتھ ریڑھی پر لاد کر قریبی ہسپتال لے گئے لیکن میو ہسپتال کا گیٹ 30 منٹ تک نہ کھلا جبکہ قائد کے یہ عظیم پروانے اس نازک حالت میں بھی

بھٹو زندہ باد کے نعرے بلند کرتے رہے۔ ان کی چمڑی جل کر ختم ہو چکی تھی اور سارا جسم آبلہ بن چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے جب ان عظیم سیاسی مجاہدوں کو ٹیکہ لگانا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ:

''ہماری جان نہیں ملک کے غریب عوام کے راہنما ذوالفقار علی بھٹو کی جان بچانا زیادہ اہم ہے۔ ہم ایک ہزار مرتبہ بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہیں۔''

دونوں پروانوں کا آگ میں جھلنے سے قبل کا مشترکہ بیان:

''ظلمتوں کے اندھیروں میں ہمارے جلتے جسم چراغ راہ ہیں۔ انہی راستوں پر چل کر عوام کو اپنی منزل تلاش کرنی ہوگی۔ ہمارا کوئی نام نہیں۔ آج اگر ہمارا کوئی نام ہے تو وہ ذوالفقار علی بھٹو ہے۔ جناب بھٹو نے سید علی ہجویریؒ کے مزار پر سونے کا دروازہ نصب کرتے ہوئے عہد کیا تھا کہ اگر دکھی انسانیت کے لیے جان بھی قربان کرنی پڑی تو وہ اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ جناب بھٹو آج پھانسی کی کوٹھڑی میں ہیں اس لیے آج ہم ان کی جگہ داتاؒ کے مزار کے پاس جان کی قربانی دے رہے ہیں۔''

اس طرح یہ دونوں پروانے بھی اپنے قائد پر نثار ہو گئے۔ ایک نئے باب کا اضافہ ہوا محبت کے اظہار کا ایک منفرد طریقہ عوام کی جہدِ مسلسل کا ایک روشن اور عظیم باب۔

پولیس نے ان کے رشتہ داروں کو بھی ہسپتال میں ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جمہوریت اور انسانی حقوق کے یہ مجاہد جنہوں نے بے ضمیر حکمرانوں کو جھنجوڑا، ہمارے ملک کے ہیرو ہیں۔ یعقوب پرویز مسیح کے پاس جب ہسپتال میں مختلف صحافی ملنے آئے تو یعقوب نے کہا کہ ''اگر یہاں پر ''نوائے وقت'' کا کوئی نمائندہ آیا ہے تو وہ سن لے کہ ہم نے جناب بھٹو کے لیے اپنے جسموں کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگائی ہے۔ ہم جمہوریت کے پروانے ہیں۔ ہمارا سکھ چین بھٹو ہے اور ہم بھٹو کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔''

اور یوں مرتے دم تک دونوں پروانے جناب بھٹو کی حمایت میں نعرے لگاتے رہے۔

انقلاب کے ان مجاہدوں کے قافلے کے کچھ اور کارکن بھی جل کر اپنے ملک اور محبوب قائد کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کر گئے جن میں آزاد کشمیر کا عزیز ملک جس نے راولپنڈی میں خود کو جلا ڈالا۔ 11 اکتوبر کو چھ روز موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ بھی لافانی ہو گیا۔ اوکاڑہ کا منور حسین شہید اور سکھر کا عبدالعزیز شہید ان دونوں پروانوں نے بھی عشق کی اسی منزل کو پالیا

www.bhutto.org

جس کو عبدالوحید قریشی شہید، یعقوب پرویز مسیح اور عزیز ملک شہید نے پایا۔

جمہوریت اور انقلاب کے یہ پروانے عوام کے لیے جدوجہد کی راہیں کھول گئے اور جناب بھٹو نے دھرتی کے ان سپوتوں کی شہادت پر کہا:

"جب کبھی تم میری یادگار بناؤ تو اس وقت شہدائے اکتوبر کو مت بھولنا جنہوں نے خود کو جلا ڈالا۔"

خودسوزی کے ان واقعات نے عوام کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی اس نئی کوشش میں بھی ہزاروں کارکن جیلوں میں گئے اور کوڑے کھائے لیکن مارشل لاء حکومت جو "منصف اور اسلام پسند" ہونے کی دعویدار تھی اس نے احتجاج کے اس دلیرانہ اور انتہائی اقدام کو یوں نظر انداز کیا کہ گویا ملک میں ہوا ہی کچھ نہیں۔

منتخب حکومت پر عوامی مظاہرے اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ضیاء حکومت تو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں تھی، بلکہ مارشل لاء حکومت دیگر سیاسی جماعتوں کے تعاون کے ساتھ ان مظاہروں کو بھرپور طریقے سے دبانے کی کوشش کرتی رہی۔ بھٹو کی حمایت میں نکلنے والے مظاہروں، احتجاجات کے خلاف حکومت کی سرپرستی میں جماعتِ اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیتِ طلبا کے کارکنوں کی "لٹھ فورس" بنائی گئی اور ڈنڈوں پر سبز اسلامی رنگ کر کے پاکستان کے مسلمانوں پر تشدد کا منصوبہ بنایا گیا۔ وہ الزامات جو مارشل لاء حکومت نے سابقہ حکومت پر عائد کیے خود حکومت نے سرِ عام ان پر عمل کیا یعنی "سیاسی گروہوں کا باہم تصادم" جماعتِ اسلامی کے یہ کارکن گرفتاری دینے والے سیاسی کارکنوں پر یوں جھپٹ پڑتے جس طرح لشکرِ کفار پر دھاوا بولا جاتا ہے۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

بھٹو سے بھٹو تک

"اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ آیا میرا نام برِصغیر کے مجرموں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے یا بہادر راہنماؤں میں۔ پاکستان کے عوام میرے نام اور میرے وقار کے بہترین محافظ ہیں اور میرا نام تاریخ کے دل میں دھڑکتا رہے گا۔"

(ذوالفقار علی بھٹو "اگر مجھے قتل کر دیا گیا")

"18 مارچ 1978ء کے بعد سے میں نے روزانہ 24 گھنٹوں میں سے 22 اور 23 گھنٹوں کا وقت ایک کوٹھڑی میں گزارا ہے۔ جہاں دم گھٹتا ہے۔ میں نے پورے موسم گرما میں شدید گرمی اور بارش کی اذیت برداشت کی ہے۔ روشنی بہت کم ہے، میری بینائی بہت کمزور ہو چکی ہے، میری صحت خراب ہو چکی ہے۔ ایک برس سے میں قیدِ تنہائی بھگت رہا ہوں لیکن میرا حوصلہ بلند ہے کیونکہ میں لکڑی کا بنا ہوا نہیں ہوں کہ جس کو جلایا جا سکے۔ انتہائی بدترین حالات میں مَیں نے اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر ہی یہ تحریر لکھی ہے اور بہت سے قرطاسِ ابیض کیوں نہ شائع کیے جائیں مجھے رائے عامہ کی عدالت میں خود کا "دفاع" نہیں کرنا ہے۔ جنگی قیدیوں کی واپسی کے تنازعے کے حل کے لیے میری جدوجہد، کشمیر، اسلامی چوٹی کانفرنس اور عوامی خدمات کے سبب میرا نام زندہ رہے گا۔ عام حالات میں مجھے ان دستاویزات کا جواب نہیں دینا چاہیے تھا لیکن حالات معمولی نہیں ہیں، معاملہ اصولوں کا ہے۔ جواب دینے کے حق کے اصول کا' سچائی کے ساتھ جھوٹ کے مقابلے کے حق کا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر برائی ایک اچھائی کو جنم دیتی ہے۔ شاید ان دستاویزات سے جو بدترین برائی ہے یہ اچھائی نکلے کہ اس فحش پبلسٹی اور کھلی عدالت میں مقدمہ

www.bhutto.org

چلانے کے بارے میں پراگندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، جب میں نے اپنے مقدمہ قتل کو کھلی عدالت سے بند کمرے میں منتقل کیے جانے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ میں کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہا تھا تو غالباً میں انصاف اور پبلسٹی کے درمیان فرق کو واضح نہیں کر سکا تھا کیونکہ انصاف کا کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے جانے سے گہرا تعلق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو یہی درس دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سرمن میں بھی یہی بیان ہے اور خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی انصاف کھلی مسجد میں بیٹھ کر کیا تھا، گوشہ میں بیٹھ کر نہیں۔ رومن غلام سپارٹیکس نے انصاف کے لیے اپنی جان دے دی تھی۔ سقراط، ارسطو اور افلاطون نے کھلے انصاف ہی کا فلسفہ پیش کیا ہے۔

یورپ اور برطانیہ کی تاریخ کھلی عدالت میں انصاف کی روایت سے مالا مال ہے۔ انصاف کے لیے کھلی عدالت میں عام قانون کے تحت انصاف کو ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ بڑی بہادرانہ جدوجہد کے بعد امریکہ کے آزاد عوام نے کھلی عدالت میں مقدمے کو یقینی بنانے کے لیے امریکی آئین میں چھٹی ترمیم کرائی تھی تاکہ اس کی خلاف ورزی نہ کی جاسکے، زیادہ سے زیادہ انصاف کیا جائے اور دیکھا جائے کہ انصاف کیا گیا ہے۔ مقدمہ قتل کی سماعت کے دوران ایک جج نے میرے اس مطالبے پر عجیب وغریب فقرہ کہا کہ ہم تم پر مقدمہ چلا رہے ہیں، عوام پر نہیں۔ اس پر چیف جسٹس نے ریمارک دیا لیکن یہ پبلسٹی چاہتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے لاہور ہائی کورٹ میں کہا کیا مضحکہ خیز بات ہے۔"

(ذوالفقار علی بھٹو، "اگر مجھے قتل کر دیا گیا")

"فوجی حکومت مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکانے کے چاؤ میں کس آگ سے کھیل رہی ہے شاید اسے اس کا مطلق احساس اور اندازہ نہیں ہے۔"

(ذوالفقار علی بھٹو، "اگر مجھے قتل کر دیا گیا")

"میں نے طبقاتی منافرت نہیں پھیلائی ہاں البتہ مظلوم عوام کا علم یقیناً بلند رکھا اور ان کو حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کی ہے اور میں اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھوں گا جب تک یہ مقدس مقصد حاصل نہیں کر لیتا۔ اگر میری زندگی میں ایسا نہ ہو سکا تو مرتے وقت آخری الفاظ میں، میں اپنے بچوں سے وعدہ لوں گا کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کریں۔"

www.bhutto.org

(ذوالفقار علی بھٹو لاہور ہائی کورٹ میں غیر قانونی حراست کے خلاف آئینی عذرداری)

''پاکستان کے عوام مجھے اپنی امنگوں کے ساتھ یاد رکھیں گے۔ میں نے انہیں جواں سال قیادت دی۔ پاکستان کی خواتین مجھے ہمیشہ مہربانی سے یاد رکھیں گی کہ میں نے انہیں آزادی دینے کی کوشش کی۔ کسان مجھے جوش و جذبہ سے یاد رکھیں گے کہ میں نے جاگیرداری کی زنجیریں توڑ دیں۔ محنت کش طبقے مجھے محبت سے یاد رکھیں گے کہ میں نے انہیں قومیائی گئی صنعتوں کا مالک بنادیا۔ دانشور میری قدر کریں گے کہ میں نے خود کو ٹیکنالوجی اور جدیدیت سے مخلصانہ طور پر وابستہ رکھا۔ اقلیتیں ہمیشہ مجھے یاد رکھیں گی کہ میں نے ان کے ساتھ سچا سلوک کیا۔ بے نام مجھے یاد رکھیں گے کہ میں نے انہیں پانچ مرلہ سکیم کے ذریعے نامور کیا۔ بے چہرہ مجھے اس لیے یاد رکھیں گے کہ کچی آبادیوں میں انہیں مالکانہ حقوق دے کر چہرے دیئے۔''

(ذوالفقار علی بھٹو، لاہور ہائی کورٹ میں غیر قانونی حراست کے خلاف آئینی عذرداری)

''جب تک میرے اس ناتواں جسم میں آخری سانس باقی رہے گی میں ایک شاعر اور انقلابی ہی رہوں گا۔'' (ذوالفقار علی بھٹو، پھانسی کی کوٹھڑی سے)

ذوالفقار علی بھٹو نے 1957ء میں یو این میں اپنی تقریر کے دوران جارحیت کے مختلف طریقوں پر سیر حاصل بحث کر کے تمام دنیا کو اپنی طرف متوجہ کروایا۔ یہ تقریر مسٹر بھٹو کو بین الاقوامی پلیٹ فارم کی وساطت سے سیاسی حلقوں میں متعارف کروانے میں بڑی اہم ثابت ہوئی۔ اس تقریر میں مسٹر بھٹو سامراج دشمن سیاستدان کے حوالے سے سامنے آئے۔ چونکہ اس میں مسٹر بھٹو نے جارحیت اور استحصال کے موضوع پر بات کی تھی، اس تقریر سے مسٹر بھٹو کی سیاسی جدوجہد کا اہم مرحلہ شروع ہوا جس کا آغاز ہی سامراج دشمنی پر مبنی تھا اور پھر مسٹر بھٹو مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ دن بدن مسٹر بھٹو سامراج کے خلاف محکوم اقوام اور استحصال زدہ طبقوں کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور پھر ایک ایسا وقت آیا جب بھٹو عالمی سامراج کے بالمقابل مظلوم اقوام کے راہبر کی حیثیت میں کھڑے ہو گئے۔ عملی صورت میں مسٹر بھٹو نے اسلامی ممالک کا اتحاد کروا کر اور تیسری دنیا کے ممالک کے اتحاد کی کوشش کر کے سامراج کو ایک بہت بڑا چیلنج کیا جو یقیناً سامراج کے عزائم کو شکست دینے کے لیے جرأت مندانہ اور تاریخ کا اہم باب ہے۔ چونکہ مسٹر بھٹو نے ظالم اور مظلوم کی کشمکش کو شدت دے کر مظلوموں کو

ظالموں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرلیا اسی لیے امریکہ کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر نے مسٹر بھٹو کو تیسری دنیا کے لیے عبرتناک مثال بنانے کی دھمکی دی تھی۔ چونکہ مسٹر بھٹو تیسری دنیا کے کرشمہ ساز راہنما اور جدوجہد کے مجاہد کے روپ میں میدانِ عمل میں کود پڑے تھے اور امریکہ مسٹر بھٹو کو اپنے سامراجی عزائم میں بہت بڑی رکاوٹ تصور کرتا تھا، اسی لیے امریکہ مسٹر بھٹو کو ایک بین الاقوامی عبرت بنا کر مظلوم اقوام میں خوف و ہراس پیدا کرنا چاہتا تھا کہ تیسری دنیا میں کوئی راہنما بھٹو بننے کی جرأت نہ کرے۔

تاریخِ انسانی اس بات کی گواہ ہے کہ حق و سچائی کے لیے لڑنے والے جابر حکمرانوں کی عدالتوں میں مجرم کی حیثیت سے پیش کیے گئے لیکن تاریخ اور وقت نے ان کو اپنے وقت کا ہی نہیں بلکہ ہر دور کا ہیرو ٹھہرایا۔ حضرت عیسیٰؑ جیسی عظیم ہستی سے لے کر آج تک امن، انصاف اور سچائی کے لاتعداد راہنما عدالت کے کٹہرے میں کھڑے کیے گئے لیکن درحقیقت ظالم حکمرانوں کی عدالتوں کے یہ مجرم تاریخ کے عظیم انسان ہیں۔

تاریخِ انسانی کا عظیم فلسفی سقراط جس پر الزام تھا کہ وہ نوجوانوں کو بگاڑ رہا تھا، اس نے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر عدالت سے مخاطب ہو کر کہا:

"اراکینِ عدالت! میں اس بات کو خوب جانتا ہوں کہ میرے خلاف گواہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ شہادتیں پیش کی ہیں۔ حقیقت میں مَیں خود بھی ایک لمحہ کے لیے گھوم گیا تھا کہ انہوں نے ایسے جھوٹے الزامات کس خوبصورتی سے میرے خلاف گھڑے ہیں لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے انہوں نے ایک لفظ بھی حق کا نہیں کہا۔ انہوں نے میرے خلاف الزام لگایا ہے کہ معزز عدالت میرے (سُقراط کے) دھوکے میں نہ آئے کیونکہ سقراط جھوٹا مکار ہے اور چالاک ہے۔ جنابِ اراکین ان کی یہ بات صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ اگر حق گوئی کی بات کرنا چالاکی ہے تو میں ضرور چالاک ہوں۔ میری بات حق اور انصاف پر مبنی ہوتی ہے اگر آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں تو سزا دیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں ذرا بھی حق کی تڑپ ہے وہ موت سے ڈر جائے گا تو تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ مجھے موت کی پروا نہیں ہے۔ مجھے پروا اگر ہے تو اس بات کی کہ میں حق پر ہوں یا باطل پر۔ حق پرست آدمی ذلت کی زندگی سے عزت کی موت مرنا پسند کرے گا۔ لہٰذا اگر آپ مجھ سے کہیں کہ سقراط اس بار ہم تم کو معاف کرتے ہیں اور آئندہ تم اپنا وقت تلاشِ حق اور

www.bhutto.org

196

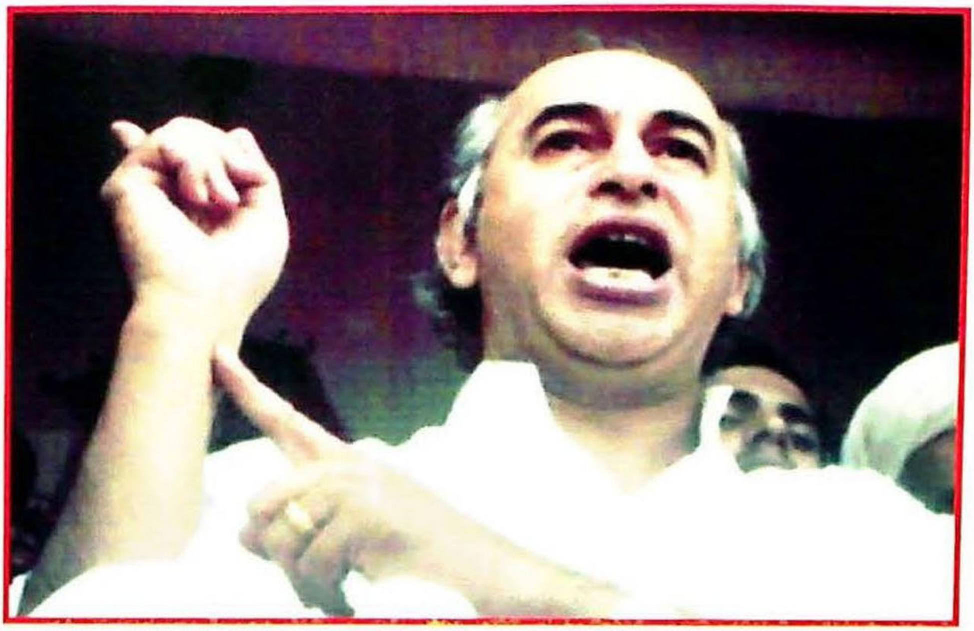

ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو

www.bhutto.org

شاہ فیصل اور ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

صدر نکسن اور ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

28 جنوری 1975ء، جہلم۔ عوامی اجتماع سے خطاب

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو، معروف اطالوی صحافی اوریانہ فلاسی

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت کی پاداش میں سرِ عام کوڑے مارنے کا ایک منظر

4 اپریل 1980ء۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کی پہلی برسی پر فرخ سہیل گوئندی ساتھیوں کے ہمراہ

www.bhutto.org

اگست 1985ء المرتضیٰ لاڑکانہ۔ بے نظیر بھٹو جب اپنے بھائی شاہنواز کا جسدِ خاکی لے کر آئیں۔ مصنف تقریر ریکارڈ کرتے ہوئے۔

www.bhutto.org

10 اپریل 1986ء محترمہ بے نظیر بھٹو کی پاکستان آمد

1986ء لاہور۔ فرخ سہیل گوئندی، سولی پر چڑھنے والے ایک کارکن عثمان شہید کی وصیت کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو وہ تاج پہنا رہے ہیں جو اس نے موت کی کال کوٹھڑی میں سگریٹ کی پنی سے بنایا۔

اپریل 1986ء سرگودھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ فرخ سہیل گوئندی

www.bhutto.org

جنوری 1983ء دہلی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بچپن کے دوست پیلو مودی کے ساتھ فرخ سہیل گوئندی

ستمبر 2000ء نیویارک۔ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل رمزے کلارک کے ساتھ فرخ سہیل گوئندی

www.bhutto.org

لاہور میں ایک تقریب۔ یحییٰ بختیار، شیخ محمد رشید، ڈاکٹر مبشر حسن، فہمیدہ ریاض اور فرخ سہیل گوئندی

1997ء عمان۔ اردن کے شاہ حسین کے ساتھ فرخ سہیل گوئندی

www.bhutto.org

نومبر 1990ء لاہور۔ فرخ سہیل گوئندی خطاب کررہے ہیں۔ سٹیج پر محترمہ بے نظیر بھٹو، فخر زمان اور نثار عثمانی تشریف فرما ہیں۔

www.bhutto.org

جنوری 1993ء۔ بلاول ہاؤس کراچی بلند ایجوت، محترمہ بے نظیر بھٹو اور فرخ سہیل گوئندی

جنوری 1993ء لاہور۔ فرخ سہیل گوئندی خطاب کر رہے ہیں، سٹیج پر بیگم نصرت بھٹو، بلند ایجوت اور راشان ایجوت

www.bhutto.org

زندگی کا ساز

www.bhutto.org

بھٹو خاندان

www.bhutto.org

ذوقِ علم پر صرف نہ کرو گے اور اگر تم نے ایسا کیا تو موت کی سزا دی جائے گی تو معزز زینِ عدالت میں خدا کی اطاعت کو آپ کی اطاعت پر ترجیح دیتا ہوں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے اس وقت تک حق کی تلاش کرتا رہوں گا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے قتل کر کے آپ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو یہ محض آپ کی غلط فہمی ہے بلکہ میرے قتل سے الٹا آپ کو نقصان ہوگا اور آسانی سے مجھ جیسا نہ مل سکے گا۔ ایتھنز دانائی کا منبع ہے مگر شرم کرو تمہارے شب و روز دولت کو حاصل کرنے میں گزرتے ہیں۔ عزت و وقار کی تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ روح کی پاکیزگی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں یہ بات کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے نہیں روک سکتی حتیٰ کہ موت کا خوف بھی۔"

(جمہوریت بمقابلہ آمریت از محمد یوسف خان)

سپریم کورٹ نے 18، 19، 20 اور 21 دسمبر 1978ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو سپریم کورٹ میں اپنی صفائی کے سلسلے میں بیان دینے کا موقع فراہم کیا۔

انہوں نے سپریم کورٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

"مائی لارڈز، میں جانتا ہوں کہ پروٹوکول اور کورٹ کے آداب کے تحت میں اس معزز عدالت کا اس امر پر شکریہ ادا نہیں کر سکتا کہ عزت مآب عدالت نے مجھے آج کی صبح اپنے روبرو پیش ہونے کی اجازت دی تاہم ملک کے سماجی طور طریقوں کے مطابق میں یہ موقع فراہم کرنے پر آپ کا ممنون ہوں۔

4 دسمبر کو یور لارڈشپس کے نام اپنی درخواست میں، میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے اس عزت مآب عدالت کے روبرو پیش ہونے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ ایک فرد کی حیثیت سے نہ صرف میری زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے بلکہ میرے معروضی خدشات کے مطابق اس سے زیادہ بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اس میں میری عزت، میرے خاندان کا وقار، میرا سیاسی کیریئر اور سب سے زیادہ یہ کہ بذاتِ خود ملک کا مستقبل ملوث ہے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلط خیال ہو لیکن یہ ایک

ایماندارانہ اور خلوص پر مبنی خیال ہے، میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے یا سنسنی خیز بنانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔"

"میں اس عزت مآب عدالت میں ان لوگوں کے سامنے کچھ نہیں کہنا چاہوں گا جو پاکستانی نہیں ہیں حالانکہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس کے باوجود میں غیر ممالک سے آئے ہوئے اپنے دوستوں کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ میں اپنے جسم کے نشانات یا ایسی ہی کوئی اور چیز نہیں دکھانا چاہتا لیکن میں ضرور کہوں گا کہ مجھے کچھ کہنا ہے اور اگر اس دوران میں ان نکات کا تذکرہ کر بیٹھوں جن کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے تو یہ بد نیتی سے نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ کا وقت ضائع کرنے کا ارادہ ہے۔ میں موت کی چھوٹی سی کال کوٹھری سے بھی یہ دیکھ سکتا ہوں کہ اس مقدمے کو جلد از جلد ختم کرنے کے لیے کیا دباؤ ہے۔"

"جناب والا! میں اپنے بارے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتا' نہ صرف میں مصیبت میں ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ عوام مصیبت میں ہوں گے۔ انہیں افسوس ہوگا۔ یقین کیجئے میرے ساتھ انتہائی ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا۔ انتہائی ذلت آمیز! معاف کیجئے گا جناب والا! میں ایسا شخص نہیں جس کی جڑیں نہ ہوں۔ سادات ابھی تک اسرائیل کے ہاتھوں کھوئے ہوئے صحرا کی تلاش میں ہے۔ بیگن اسے اسرائیل کی سرزمین کہتا ہے۔ ہندو اس سرزمین کو بھارت ماتا کہتے ہیں۔ میں نے نوے ہزار جنگی قیدیوں کو بھارت کے چنگل سے نجات دلائی، پھر بھی میرے ساتھ مجرموں کا سا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ میں مجرم نہیں ہوں لیکن میرے ساتھ دوسرے ملزمان سے زیادہ خراب سلوک روا رکھا گیا ہے۔ میں موسیقی کی آواز سنتا ہوں۔ میں کال کوٹھری میں ان کے قہقہے سنتا ہوں۔ اس کال کوٹھری سے میں باہر تک نہیں نکل سکتا۔ جناب والا! نوے دن سے میں نے سورج کی روشنی نہیں دیکھی۔ 15 اکتوبر کو جب دو قیدی جیل سے فرار

www.bhutto.org

ہو گئے تو مجھے سیل میں بند کر دیا گیا۔ میرا ان کے فرار سے کیا تعلق تھا؟ تعلق کہاں تھا؟ میں اپنے ملک سے فرار نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے ملک سے فرار نہیں ہوں گا۔ جناب والا! مری میں مصطفیٰ کھر نے مجھ سے کہا کہ میں ملک چھوڑ دوں ۔انہوں نے کہا کہ یہ لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں۔ اگر تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں اپنی جڑیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ 13 ستمبر کو نواب صادق حسین قریشی کی کوٹھی پر پریس کانفرنس کے بعد ایک غیر ملکی صحافی مجھے ایک طرف لے گیا اور اس نے کہا، ''بھٹو صاحب! میں نہیں بتا سکتا کہ آپ کے خلاف کیا کچھ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ملک چھوڑ دیں۔ میں آپ کا مداح ہوں۔'' میں نے اس صحافی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اُس سے زیادہ سننا نہیں چاہتا۔ بس اتنا ہی کہوں گا کہ میں اسے بھول نہیں سکتا۔ تب اس نے کہا، ''مہربانی کر کے لاڑکانہ نہ جائیں کہیں اور چلے جائیں۔ آپ نہیں جانتے کہ کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا کہ میں لاڑکانہ ضرور جاؤں گا۔ اس دھرتی پر جہاں میں نے جنم لیا۔ اس دھرتی پر جس سے میرا تعلق ہے اور جہاں مجھے واپس جانا ہے۔ میں باہر نہیں جاؤں گا۔ جناب والا! میں کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے میں رحم نہیں چاہتا، میں انصاف چاہتا ہوں۔ میں محض زندہ رہنے کے لیے زندگی کی درخواست نہیں کر رہا ہوں۔''

''اگرچہ میرے وکلاء مجھ سے ملاقات کرتے ہیں مگر یہ ملاقات ایک چھوٹی سی تنگ اور گھٹن والی کوٹھری میں ہوتی ہے جس کی پیمائش 7x10 فٹ ہے اور وہاں کوئی بمشکل ہی گفتگو کر سکتا ہے۔ مجھے ان پر افسوس ہوتا ہے اور میں انہیں مقررہ وقت سے پہلے ہی جانے دیتا ہوں کیونکہ وہ بڑی بے آرامی محسوس کرتے ہیں۔''

''جنابِ والا! مجھے سونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ کوٹ لکھپت میں

www.bhutto.org

بچاس پاگل تین ماہ تک میرے سیل کے قریب رکھے گئے۔ وہ ہمہ وقت چیختے چنگھاڑتے رہتے تھے اور میں بمشکل سو سکتا تھا۔ جب میں راولپنڈی لایا گیا تو پہلے یہ کھیل کھیلا گیا کہ میرے سیل کی چھت پر پتھر پھینکے گئے۔ پہلے میرا یہ خیال تھا کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن جب رمضان کے دوران میں رات کو نہیں سوتا تھا۔ میں سحری کا انتظار کرتا تھا مجھے ہر پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ٹین کی چھت پر سے آواز سنائی دیتی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ چھت پر پتھر مارے جا رہے ہیں۔ جب یہ کھیل بند ہوا تو ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ میرے سیل کے بالکل قریب ایک پشتہ بنا ہوا ہے اور وہاں فوجی پہریدار ہیں۔ یہ پہریدار وقفہ وقفہ سے اس پشتہ پر کودتا تھا اور اس طرح پتھروں کی آواز کی جگہ فوجی جوتوں کی آواز نے لے لی۔ یہ آواز دو مرتبہ آتی تھی کیونکہ بظاہر وہاں صرف ایک پہریدار نہیں بلکہ کئی تھے۔ گذشتہ شب میرا خیال تھا کہ کیونکہ کل مجھے عدالت جانا ہے لہٰذا آج یہ آوازیں نہیں آئیں گی لیکن یہ آوازیں اس کے باوجود سنائی دیں۔ جناب والا! میں اس صبر آزما مصیبت کا سامنا اپنی ہمت، استقلال اور قوتِ ارادی سے کر سکا اور یوں بھی کہ میں ایک لیڈر ہوں، اسی باعث میں یہاں آنے کے قابل ہوا۔ کوئی عام آدمی نہیں آ سکتا تھا۔ کوئی بھی عام آدمی ان حالات میں عرصہ پہلے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کتنا پریشان ہوں۔ میں ختم ہو چکا ہوں پچیس دن سے میری موت کی کوٹھری میں پانی نہیں تھا، پانی کل ہی بحال کیا گیا ہے مگر آپ چاہیں تو میں صبح نو بجے تو کیا آٹھ بجے بھی آنے کو تیار ہوں۔"

"مسعود محمود نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو میں اپنے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کو بھی قتل کر دوں گا جو میرا بیٹا اور وارث ہے، جس پر مجھے فخر ہے کہ وہ آکسفورڈ میں ایک ذہین اور بہادر نوجوان ہے۔ میں نے اس کی تربیت کی ہے اور میں اس شخص سے

کہتا ہوں کہ میں اپنے بیٹے کو بھی قتل کر دوں گا۔ جناب والا! اس بات کی ایک حد ہے کہ مجھے ایک ایسا وحشی قاتل کہا جا رہا ہے جو اپنے بیٹے کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے پالا ہے اور اس بیان کو رد نہیں کیا گیا بلکہ ایک لفافہ میں رکھ دیا گیا اور یہ لڑکا ہی میرے لیے اپنی جان قربان کرے گا۔"

"عزت مآب مسٹر یحیٰی بختیار کو اشعار اور شاعروں کے حوالے پیش کرنے کے کافی مواقع فراہم کیے گئے مگر اپنی بات ختم کرنے کے لیے میں غالب کا ایک شعر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جسے میں بے حد پسند کرتا تھا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

مجھے یہ شعر بے حد پسند تھا مگر عزت مآب غالب غلطی پر ہیں۔ غالب غلطی پر ہیں۔ یہ غلط ہے کہ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں، مشکلیں آسان نہیں ہو سکتیں آپ ان کو برداشت کر سکتے ہیں۔

اب عزت مآب آپ نے اردو بہتر بنانے کی ہدایت کی ہے۔ میں اردو میں زیادہ بلاغت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ عزت مآب جب ایک آدمی موت کی کوٹھری میں ہوتا ہے تو اس پر ایسی وارداتیں گزرتی ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں گزری تھیں۔ برصغیر میں شاید سرائیکی زبان ایک بہترین اور انتہائی شیریں زبان ہے اور میں ایک سرائیکی کافی کے ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں:

درداں دی ماری جندڑی علیل اے

سپریم کورٹ نے مسٹر بھٹو کے تاریخ ساز بیان کے بعد 23 دسمبر 1978ء کو اپنا فیصلہ محفوظ رکھا جبکہ اس دوران ساری دنیا سے مسٹر بھٹو کی سزائے موت ختم کرنے کے لیے رحم کی اپیلیں آ رہی تھیں کیونکہ بین الاقوامی سیاسی حلقے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ بھٹو کا مقدمہ

www.bhutto.org

قتل کا مقدمہ نہیں بلکہ سیاسی مقدمہ ہے۔ عدالت کے فیصلے کے باوجود جنرل ضیا کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ مسٹر بھٹو کی سزا معاف کر سکتا تھا۔ اگر جنرل ضیاء نے ناسازگار حالات کا بہانہ بنا کر غیر آئینی مارشل لاء مسلط کیا تھا تو پھر قانونی حدود کے اندر رہ کر سابق وزیرِ اعظم کی سزائے موت منسوخ کرنا جنرل ضیا کے لیے کوئی بڑا مشکل کام نہ تھا۔ چونکہ سیاسی حلقے آنے والے طوفانوں کی پیش گوئیاں کر رہے تھے لہٰذا ملکی مفاد و سلامتی کے پیشِ نظر کسی شہری کو قانونی رعایت دینا کوئی بڑا کام نہیں اور جنرل ضیاء کو غیر ملکی اپیلوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے تھا کیونکہ ان میں وہ تمام ممالک شامل تھے جو ہمیں اقتصادی امداد دیتے تھے بلکہ ہمارے ساتھ ان کے سیاسی روابط بھی قابلِ ذکر ہیں لیکن جنرل ضیاء نے دنیا بھر سے آنے والی اپیلوں کو حقارت و نفرت کے ساتھ رد کرنے کا مظاہرہ کیا۔ ماہِ فروری 1979ء کے شروع ہی میں حکومت نے ملک بھر کے تعلیمی ادارے غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیئے جبکہ سندھ کے تعلیمی ادارے ایک طالبہ شیریں سومرو کے ساتھ زیادتی کے واقعہ کے خلاف ہنگاموں کے بعد پہلے ہی پچھلے چار ماہ سے بند تھے۔ تعلیمی اداروں کے ہاسٹلز بھی خالی کروا لیے گئے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو کو 5 فروری کو نظر بند کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ملک بھر سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ہزاروں کارکنوں سمیت راہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ تمام اقدامات فیصلے کی نوعیت کو بے نقاب کرتے تھے۔ چھ ماہ اور تین دن تک سپریم کورٹ میں عدالتی کارروائی کے بعد 6 فروری 1979ء کو سپریم کورٹ نے مسٹر بھٹو کی اپیل پر اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔

6 فروری 1979ء کو سپریم کورٹ راولپنڈی کی عمارت کے اردگرد سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ کئی کئی میل تک کسی ایک شخص کو بھی ڈھونڈ نا مشکل تھا۔ راولپنڈی کی سڑکوں اور گلیوں میں پولیس اور رینجرز کے دستے متعین کر دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی مارشل لاء کی گشتی عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ فیصلہ سننے کے لیے سپریم کورٹ کی عمارت کے باہر بین الاقوامی پریس کے نمائندوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عدالت میں لوگوں کی اتنی زیادہ تعداد تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ عدالت میں مسٹر بھٹو کے وکلا مسٹر یحییٰ بختیار، غلام علی میمن، عبدالحفیظ لاکھو اور مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ سمیت راولپنڈی کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر شاہ رفیع عالم بھی موجود تھے۔ کئی سفارتی نمائندے بھی موجود تھے جن میں ایران کا سفیر بھی شامل تھا۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ ججوں کا اختلافی فیصلہ تھا۔ 4 ججوں نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی

سزائے موت برقرار رکھی اور لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو بحال رکھا جبکہ تین ججوں نے جناب ذوالفقار علی بھٹو اور غلام عباس کو فی الفور رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح یہ فیصلہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ چونکہ ایک ہی عدالت کے چار جج ایک شخص کی اپیل کو مسترد کرتے ہیں اور صفائی کے وکلاء عدالت کے چار ججوں کو مطمئن نہ کر سکے جبکہ اسی عدالت کے تین جج مسٹر بھٹو کے وکلاء کے دلائل سے مطمئن ہوتے ہیں اور مسٹر بھٹو کو بے گناہ قرار دیتے ہیں اور ہائی کورٹ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ مقدمہ سیاسی تھا یا نہیں ہمیں صرف اس بات سے اندازہ لگا لینا چاہیے کہ چار اور تین کے فیصلے نے ملک کی سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے اور ستم ظریفی یہ کہ بھٹو کو سزائے موت سنانے والے چاروں جج صاحبان کا تعلق صوبہ پنجاب سے تھا۔

چار جج جنہوں نے سزائے موت کا فیصلہ بحال رکھا ان کے نام یہ ہیں: چیف جسٹس مسٹر ایس انوار الحق، مسٹر جسٹس محمد اکرم، مسٹر جسٹس کرم الٰہی چوہان اور مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ۔ البتہ ساتوں جج صاحبان نے متفقہ طور پر ایف ایس ایف کے تینوں اہلکاروں صوفی غلام مصطفٰے، ارشد اقبال اور رانا افتخار کی اپیلوں کو مسترد کر دیا۔ مسٹر جسٹس داراب پٹیل، مسٹر جسٹس ایم حلیم اور مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے جناب ذوالفقار علی بھٹو اور غلام عباس کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ سپریم کورٹ کے اکثریتی فیصلے کو چیف جسٹس ایس انوار الحق نے لکھا باقی تین ججوں نے ان کے فیصلے کی تائید کی۔

چیف جسٹس ایس انوار الحق نے جہاں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے مسٹر بھٹو کی سزائے موت بحال رکھی وہاں چیف جسٹس ایس انوار الحق نے فیصلے کے پیرا گراف 610 سے لے کر 616 کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''اس پیرا گراف میں مسٹر بھٹو کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ وہ اچھے مسلمان نہیں ہیں۔ وہ ایک مسلمان ملک کے سربراہ بننے کے قابل نہیں ہیں۔ چیف جسٹس نے فیصلے میں لکھا کہ اس جملے میں جو باتیں درج کی گئی ہیں ان کا کیس کے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کا تعلق ایک مسلمان حکمران کے کردار سے ہے اور مسٹر بھٹو کے آئینی اختیارات کے تجاوز سے ہے لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جن کا فیصلہ کرنا لاہور ہائی کورٹ کو مقصود نہیں تھا اور نہ ہی لاہور ہائی کورٹ یہ معلوم کر رہی تھی کہ مسٹر بھٹو اچھے مسلمان تھے یا نام کے مسلمان تھے اور اس حصے کا زیر سماعت مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' فاضل چیف جسٹس نے یہ ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ ''ان حالات میں مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پیرا گراف نمبر 610 سے 616 تک کا حصہ فیصلے سے خارج کر

دیا جائے۔'' اس طرح لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ کہ بھٹو نام کا مسلمان ہے، جھوٹا اور ملک کا سربراہ بننے کے قابل نہیں مسترد ہو گیا۔ یاد رہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جب سپریم کورٹ میں بیان دیا تھا تو انہوں نے لاہور ہائی کورٹ کے ان ریمارکس پر بڑے جذباتی ہو کر دلائل کے ساتھ تفصیل سے بحث کی تھی اور اس کو تعجب خیز اور متعصبانہ فیصلہ قرار دیا تھا کہ ان کو نام کا مسلمان قرار دیا گیا ہے۔

مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے سب سے طویل فیصلہ لکھا جو 441 صفحات پر مشتمل ہے۔ جسٹس صفدر شاہ نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو تمام الزامات سے بری کیا۔ جسٹس حلیم نے جسٹس صفدر شاہ کے فیصلے کی تائید کی اور پانچ صفحات پر الگ نوٹ بھی لکھا جس میں انہوں نے مسٹر بھٹو اور غلام عباس کو تمام الزامات سے بری قرار دیا۔ مسٹر جسٹس داراب پٹیل نے ایک سو دس صفحات پر مشتمل فیصلہ لکھا۔ انہوں نے بھی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور غلام عباس کو تمام الزامات سے بری قرار دیا۔

مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے اپنے طویل فیصلے میں استغاثہ کی طرف سے پیش کردہ شہادتوں کا تفصیلی تجزیہ کیا۔ مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے فیصلہ میں لکھا '' مجھے اس بات پر معمولی سا بھی شک نہیں کہ استغاثہ مسٹر بھٹو اور غلام عباس کے خلاف الزامات ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔''

انہوں نے اپنے فیصلے میں استغاثہ کے بیشتر گواہوں کی شہادت رد کر دی۔ ایک جگہ فیصلے میں مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے لکھا:

'' لاہور ہائی کورٹ نے مسٹر بھٹو کے لیے بڑے ملزم کی اصطلاح بہت دفعہ استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال غلط ہے کیونکہ مسٹر بھٹو بڑے ملزم نہیں ہیں اور انہوں نے استغاثہ کے الزامات کی روشنی میں فائرنگ میں عملی حصہ نہیں لیا بلکہ الزام کی روشنی میں وہ صرف ترغیب قتل کے ملزم ہیں۔ بڑے ملزم کی اصطلاح صرف رانا افتخار اور راشد اقبال کے متعلق استعمال ہو سکتی ہے۔''

دراصل حکومت نے مختلف ذرائع ابلاغ سے اس اصطلاح کو استعمال کر کے مسٹر بھٹو کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے مسعود محمود جو کہ سلطانی گواہ تھا کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اور نواب احمد خان قصور کے رہنے والے تھے اور آپس میں اچھے دوست تھے اس لیے وہ ایف ایس ایف کو استعمال کر کے ان کے خلاف قتل کا منصوبہ نہیں بنا سکتا تھا بلکہ اس نے ایسا صرف مسٹر بھٹو کی دھمکی کے تحت کیا تھا فاضل جج نے فیصلے میں لکھا:

'' یہ دھمکی صرف اتنی تھی کہ کیا تم چاہتے ہو کہ وقار تمہارا پیچھا کرتا رہے۔ اس سے صرف

www.bhutto.org

اتنا مطلب نکلتا ہے کہ وہ مسعود محمود کو اس کی نوکری سے محروم کر سکتا تھا۔'' مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے لکھا کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنی نوکری بچانے کی خاطر اپنے کزن کو قتل کرنے کی سازش میں شریک ہو گیا۔ پتا یہ چلتا ہے کہ مسعود محمود کے احمد رضا خان قصوری سے اتنے اچھے تعلقات نہیں تھے کیونکہ احمد رضا قصوری ایک بڑا زمین دار اور رئیس آدمی تھا جبکہ مسعود محمود کی مالی حیثیت اتنی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ ایک بڑا سرکاری ملازم تھا۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ دونوں کے درمیان رقابت اور دشمنی ہو اور مسعود محمود علاقہ کی سیاست میں برتر مقام حاصل کرنے کی خاطر اس کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو۔ مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے ایک جگہ لکھا: ''اس تمام تفصیل سے یہ بات اخذ نہیں کی جا سکتی کہ مسعود محمود نے غلام عباس سے مل کر احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہو اور جس میں بدقسمتی سے اس کا باپ قتل ہو گیا ہو۔''

مسٹر جسٹس ایم حلیم نے جہاں مسٹر جسٹس صفدر شاہ کے فیصلہ میں دیئے گئے دلائل اور نتائج سے مکمل طور پر اتفاق کیا وہاں انہوں نے اپنے علیحدہ نوٹ میں لکھا:

''چونکہ استغاثہ کے پورے مؤقف کا انحصار مکمل طور پر وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی شہادت پر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس پر اعتماد کریں یا نہ کریں؟ اس کی شہادت کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ شہادت اس معیار کی نہیں ہے کہ اس پر انحصار کیا جا سکے۔ نہ صرف یہ کہ اس میں کمزوری ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ ایک باشعور شخص تھا اور اس کا رویہ اس کی شہادت میں دیئے گئے حقائق کے پیش منظر میں مکمل طور پر غیر فطری ہے۔ وعدہ معاف گواہ کی پوزیشن میں یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ اسے اسلام آباد کے واقعے کا علم نہیں تھا اس پر جرح کے دوران جب اس سے سوال کیا گیا تو اس نے کہا تھا کہ مجھے اس کا کچھ تھوڑا سا علم تھا۔ یہ جواب بمشکل اس کے وعدہ معاف گواہ کے کردار کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس کی شہادت غیر فطری ہے اور اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔'' مسٹر جسٹس حلیم نے ذوالفقار علی بھٹو اور غلام عباس کی اپیلیں منظور کرتے ہوئے انہیں بری کرنے اور باقی تین کی اپیلیں مسترد کرنے کا فیصلہ دیا۔

مسٹر جسٹس داراب پٹیل نے بھی اپنے نوٹ میں وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کی شہادت کو قبول نہیں کیا۔ مسٹر جسٹس داراب پٹیل نے اپنے نوٹ میں ماہر اسلحہ کی رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وقوعہ میں استعمال ہونے والا اسلحہ وہ نہیں جو کہ ایف

ایس ایف کی بٹالین نمبر 3 کے زیرِ استعمال تھا۔ اس لیے اسلحہ مہیا کرنے والے دو گواہوں امیر بادشاہ اور محمد امیر کی شہادتیں جھوٹی ہیں۔" مسٹر جسٹس داراب پٹیل نے بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو اور میاں غلام عباس کو بری کرنے کا فیصلہ دیا۔

اس اختلافی فیصلے نے ساری دنیا کو چونکا دیا۔ اب ان اپیلوں کو بڑی تقویت ملی جو مختلف ممالک کے سربراہوں، راہنماؤں اور سیاسی شخصیتوں سمیت بین الاقوامی تنظیموں اور حکومتوں نے مسٹر بھٹو کی سزائے موت منسوخ کرنے کے لیے جنرل ضیا سے کی تھیں۔ اب یقیناً قانونی طور پر مسٹر بھٹو کی سزائے موت منسوخ کرنے کا ایک جواز پیدا ہو چکا تھا کیونکہ فیصلہ اختلافی تھا۔ ایک اور بات بڑی قابلِ غور ہے کہ پہلا فل بنچ نو ججوں پر مشتمل تھا پھر آٹھ اور بعد میں سات ججوں پر رہ گیا۔ عدالتی انصاف اور غیر جانبداری کے حوالے سے ایک اور نکتہ بڑا اہم ہے کہ چیف جسٹس ایس انوار الحق جو بنچ کے سربراہ تھے اور جنہوں نے مسٹر بھٹو کی اپیل مسترد کی وہ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک کانفرنس میں شرکت کرنے جکارتہ گئے جہاں انہوں نے مقدمے کے متعلق باتیں کرتے ہوئے یہ کہا تھا، "یہ مقدمہ سیاسی نہیں ہے۔" اس طرح فیصلہ سنانے سے پہلے جج کی رائے کو بین الاقوامی قانونی و سیاسی حلقوں نے شک کی نگاہ سے دیکھا جبکہ مقدمہ ہی کے دوران ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق سعودی عرب کے دورے پر گیا تو اس کی غیر موجودگی میں چیف جسٹس ایس انوار الحق قائم مقام صدر بھی رہے اور اس دوران انہوں نے مسٹر بھٹو پر اعتراض بھی کیا جس سے اُن کی منصف کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔

6 فروری کو مسٹر یحییٰ بختیار اور غلام علی میمن نے جناب بھٹو سے ایک گھنٹے تک جیل میں ملاقات کی اور مسٹر بھٹو کو سپریم کورٹ کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ کو بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ سنا۔ مسٹر بھٹو نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ عدالت کے تین ججوں نے انہیں بے گناہ تصور کیا ہے۔

بیگم نصرت بھٹو اپنے گھر پر نظر بند تھیں، جب ان کو سپریم کورٹ کے فیصلے کا علم ہوا تو وہ تمام پہرے توڑ کر خود کار ڈرائیو کر کے جیل پہنچ گئیں۔ پولیس ان کا پیچھا کرنے میں ناکام رہی اور بیگم نصرت بھٹو جیل میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ بیگم بھٹو نے جیل میں آدھ گھنٹے تک مسٹر بھٹو سے ملاقات کی۔ اس عرصہ کے دوران جب جیل حکام کو یہ

www.bhutto.org

اطلاع پہنچی کہ بیگم نصرت بھٹو نظر بندی توڑ کر وہاں پہنچی ہیں تو ان کو پولیس وین میں بٹھا کر واپس ان کے گھر نظر بند کر دیا گیا۔ حکومت نے بیگم نصرت بھٹو کے خلاف پولیس حراست توڑنے کے الزام میں مقدمہ درج کیا۔

لندن، جہاں پر مسٹر بھٹو کے دونوں صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو مقیم تھے، ان کو اپنے والد کی سزائے موت کی خبر پہنچی تو ان کا ردِ عمل بھی بڑا شدید تھا۔ مسٹر بھٹو کے چھوٹے صاحبزادے شاہنواز بھٹو نے اپنے والد کی سزائے موت کے فیصلے پر کہا:

''میرے والد باعزت انسان ہیں وہ اپنی زندگی میں کسی سے بھیک نہیں مانگیں گے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہی سب کچھ ہونے والا ہے۔ میرے والد نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی سے رحم کی اپیل نہیں کریں گے اور میرا گھرانہ ان کی اس خواہش کا پابند ہے۔ میں جنرل ضیاء کو بتانا چاہتا ہوں کہ جناب بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اس واقعے کے خلاف احتجاج ہوگا۔ یہ بات شاید جنرل ضیاء پر واضح ہو چکی ہے کہ پوری دنیا ان سے اس سے پہلے بھی اس سلسلے میں اپیل کر چکی ہے۔ میرے والد کسی سے انتقام نہیں لیں گے۔ اگر جنرل ضیاء پھانسی دیتے ہیں تو اسے پچھتانا پڑے گا کیونکہ پھر ہمیں جوابی کارروائی کرنی پڑے گی۔ یہ پاکستان کے لیے انتہائی المناک ہوگی۔ یہ ایک خون ریز خانہ جنگی ہوگی۔''

سزائے موت کے فیصلے کے بعد ساری دنیا نے جنرل ضیاء پر مزید دباؤ ڈالنا شروع کر دیا جن میں سویڈن کے وزیرِ اعظم، برطانیہ کے وزیرِ اعظم جیمز کالہیان، آسٹریلیا، ایمنسٹی انٹرنیشنل، اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر کرٹ والڈہائیم، انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹس، برطانوی پارلیمنٹ سابق وزیرِ اعظم برطانیہ ہیرالڈ ولسن، برطانوی وزیر خارجہ ڈیوڈ اوون، بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی، فن لینڈ، ناروے، بھارت کی حکمران جماعت جنتا پارٹی کے صدر مسٹر چندر شیکھر، یونان، بھارتی صدر مسٹر سنجیوا ریڈی، یوگوسلاویہ کے راہنما مارشل ٹیٹو، متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان، کویت کے امیر شیخ جابر احمد الصباح، قطر کے امیر شیخ خلیفہ بن حماد الثانی، مصر کے صدر انور سادات، تیونس کے صدر حبیب بورقیبہ، اٹلی کے صدر ساندرو پرتنی، سری لنکا کی سابق وزیر اعظم مسز بندرا نائیکے، بنگلہ دیش کی بار ایسوسی ایشن، سعودی عرب اور لیبیا سرِ فہرست ہیں جبکہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے راہنما یاسر عرفات کے نمائندے کرنل طارق بیروت سے اپنی مصروفیات کو

www.bhutto.org

ملتوی کر کے اور عراقی وزیرِ اوقاف احمد عبدالستار الجواری، عراقی صدر احمد حسن البکر کی طرف سے خود اپیل لے کر جنرل ضیاء کے پاس آئے۔ ایران کے انقلابی راہنما آیت اللہ خمینی نے بھی انقلاب کے ابتدائی مراحل میں نہایت مصروفیات کے باوجود ٹیلی فون پر جنرل ضیاء سے رحم کی اپیل کی۔ شام کے صدر حافظ الاسد نے بھی جنرل ضیاء سے کئی اپیلیں کیں۔ اس سلسلے میں شام کے وزیرِ مذہبی امور شیخ الستار السید خصوصی طور پر پاکستان آئے۔ الجزائر کے صدر حواری بومدین، چین، نیپال، رومانیہ، قبرص، فرانس، سوویت راہنما برزنیف، کینیڈا، مراکش، مغربی جرمنی، انڈونیشیا، کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا، ڈنمارک، پوپ جان پال، پرنس کریم آغا خاں سمیت دنیا بھر کے راہنماؤں اور سربراہانِ مملکت نے مسٹر بھٹو کے لیے جنرل ضیاء سے رحم کی اپیلیں کیں۔ سویڈن نے تو مسٹر بھٹو کو سیاسی پناہ دینے کا اعلان بھی کیا۔ ترکی کے وزیرِ اعظم جناب بلند ایجوت نے کہا، "ہم بھٹو کو ترکیہ میں قیام کی سہولتیں دیں گے کیونکہ ترکیہ کے عوام مسٹر بھٹو کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

مسٹر بھٹو کی سزائے موت منسوخ کرنے کے لیے دنیا بھر سے رحم کی اپیلیں آئیں۔ فوجی حکومت کو ان اپیلوں کا دُشواری سے سامنا کرنا پڑا۔ مسٹر بھٹو کی پھانسی کی سزا کے خلاف دنیا بھر کا شدید ردِعمل تھا۔ عرب ممالک سمیت چند دیگر ممالک کے راہنما مسٹر بھٹو کی سزائے موت کے فیصلے کے خلاف سفارتی سطح پر بڑے متحرک تھے۔ تیسری دنیا کے زیادہ تر ممالک بشمول اسلامی ممالک نے اپنی اپیلوں میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کو تیسری دنیا، عرب کاز، عالمی سطح پر پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے حقوق کے راہنما کے طور پر ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مسٹر بھٹو کو سزائے موت، تیسری دنیا کا عظیم نقصان اور المیہ ہوگا اور جنرل ضیاء الحق کو یہ باور کرایا کہ ایسی صورت میں دنیا کے یہ ممالک ایک مخلص راہنما سے محروم ہو جائیں گے۔ یورپی ممالک کے راہنماؤں اور سماجی و انسانی حقوق کی تنظیموں نے مسٹر بھٹو کی پھانسی کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ جنابِ بھٹو کے مقدمہ کی کارروائی عدم انصاف پر مبنی تھی اور بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کی صورت میں اس فیصلے کو انسانیت و عدل کے ساتھ ایک ناانصافی قرار دیا جائے گا، جیسا کہ مغربی جرمنی نے اپنی اپیل میں کہا: "مغربی جرمنی کے عوام بھٹو کی پھانسی کو نہایت ناپسند کریں گے۔" اس کے علاوہ دنیا بھر کے ماہرینِ قانون، سماجی انصاف کی تنظیموں نے اپنی اپیلوں میں مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمہ کو ناانصافی قرار دیا اور ان کا مؤقف تھا کہ مسٹر بھٹو کے

خلاف جومقدمہ دائر کیا گیا ہے وہ جھوٹ پر مبنی نظر آتا ہے اور اسی لیے سپریم کورٹ میں 3 ججوں نے مسٹر بھٹو کو بے گناہ قرار دیا ہے جو مسٹر بھٹو کی پھانسی کی سزا ختم کرنے کے لیے ایک اہم قانونی جواز ہے۔ اس لیے دنیا کے معروف ماہرینِ قانون نے بھٹو کی سزائے موت کے فیصلے کو جوڈیشل مرڈر (عدالتی قتل) قرار دیا۔

بین الاقوامی پریس کا ردِعمل:

"سزا میں نرمی کے لیے جنرل ضیاء کو ایک اچھا بہانہ مل گیا ہے۔ عدالت نے مسٹر بھٹو کے خلاف اکثریتی فیصلہ دیا ہے۔ چار ججوں نے اپیل مسترد کرنے کے حق میں فیصلہ دیا ہے جبکہ تین ججوں نے فیصلے سے اختلاف کیا ہے۔ اقلیت نے نہ صرف سزائے موت مسترد کر دی بلکہ مسٹر بھٹو کے خلاف پورے کیس کو غیر ثابت شدہ قرار دیتے ہوئے انہیں بالکل بری کر دینے کا حکم دیا ہے۔ عدالت کے فیصلے نے ضیاء الحق کو سزائے موت میں نرمی کر کے عمر قید میں بدلنے کی بھی دلیل فراہم کر دی ہے۔ سزائے موت میں نرمی کر کے اسے عمر قید میں تبدیل کر دیا جائے۔ پسِ دیوارِ زنداں یرغمال کا خطرہ شاید زمین میں دفن شہید سے کم ہو۔"

(دی اکانومسٹ 10 فروری 1979ء)

"بھٹو کو پھانسی دینے سے پاکستان کے مستقبل کے لیے جو خطرے پیدا ہو سکتے ہیں ان سے چشم پوشی کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ ہم پاکستان کے موجودہ حکمرانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بھٹو صاحب کو پھانسی دیئے جانے کے ممکنہ نتائج کو نظر انداز نہ کریں۔"

(وائس آف کشمیر نیشنل لندن کا ایڈیٹوریل)

"جنرل ضیاء کو چار اہم وجوہات کی بنا پر سزا میں تخفیف کر دینی چاہیے۔ اولاً یہ کہ یہ خطرہ موجود ہے کہ بھٹو کی موت سے ملک میں خانہ جنگی اور افراتفری پھیل سکتی ہے اور بھٹو کے پیروکار پہلے ہی شدید احتجاج کر رہے ہیں۔ پھر ہم ایران میں عوام کے سیلاب کے سامنے مضبوط ترین فوجی طاقت کو پسپا ہوتے دیکھ چکے ہیں۔

دوسری وجہ انسانی بنیادوں کی ہے بھٹو لازمی طور پر ایک سیاسی قیدی ہیں اور ملک کے عوام پر ان کے گہرے اثرات مرتسم ہیں قطع نظر عدالت۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ بھٹو کی پھانسی ایک بڑی مثال بن جائے گی۔ یہ کسی ملک کے مفاد

www.bhutto.org

میں نہیں ہے کہ وہاں کے سیاسی راہنماؤں کو پھانسی پر لٹکایا جائے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ پاکستان ان دنوں بدترین الجھنوں اور جذباتی افراتفری کا شکار ہے۔ان حالات میں کسی مقصد کو مدِ نظر رکھنا محال ہوتا ہے۔طمع، ہوسِ اقتدار اور کینہ پروری اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ جب کوئی شخص ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بھٹو کی پھانسی کے بارے میں سوچتا ہے تو پھانسی سے پیدا ہونے والے مضمرات اسے اور زیادہ پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔''

(انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون 28 فروری 1979ء)

''مسٹر بھٹو کو پھانسی دینا انہیں ان لاکھوں پاکستانیوں کی نظر میں شہید بنانا ہوگا جو انہیں اب بھی غریبوں کا علمبردار تصور کرتے ہیں۔اس سے وہ ملک اور زیادہ تقسیم کا شکار ہوگا جو پہلے ہی علاقائی اور دوسرے تنازعوں میں خطرناک حد تک گھرا ہوا ہے۔ یہ ایسا آخری اقدام بھی ثابت ہوسکتا ہے جو پاکستان کے کمزور اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔اس کا ٹوٹنا صرف اس کے عوام کے لیے مصائب میں اضافے سے بھی زیادہ اثر ڈالے گا۔ یہ افغانستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے پورے علاقے کے استحکام کے لیے بھی ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔

مسٹر بھٹو جب تک زندہ ہیں ایک ذمہ داری بنے رہیں گے۔مر جانے کی صورت میں وہ اس سے بھی بھاری ذمہ داری ہوں گے۔

(ڈیلی آبزرور 18 فروری 1979ء)

''مسٹر بھٹو کے لیے ڈرامے کا اختتام ابھی تک نہیں ہوا اور اس ملک کے عوام کے لیے روحانی اور ذہنی اذیتیں شاید اب شروع ہوں گی۔''

(نیوز ویک 19 فروری 1979ء)

''ہم توقع کرتے ہیں کہ اب جنرل ضیاء اس شخص کے لیے اپنی ذاتی ناپسندیدگی سے بہت بلند ہوں گے جو پہلے ہی اس سے زیادہ مصیبت اٹھا چکا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ یقیناً اب انہیں پھانسی دینا ملک کو ایک بار پھر ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے تباہ کن واقعے کے بعد بھٹو نے پاکستان کو مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا تھا۔''

(عرب نیوز جدہ کا اداریہ 27 فروری 1979ء)

www.bhutto.org

''وہ فوجی آمریت کے مارے'' سارے پاکستان میں جمہوریت کی پہلی کھڑکی کھولنے والے معمار ہیں۔ان کا یہی کارنامہ انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔زندہ صرف موت کے بعد نہیں شاید آج بھی جب انہیں پھانسی دیئے جانے کا اعلان ہو چکا ہے اور ان کی گردن اور پھانسی کے پھندے میں بظاہر آٹھ دن یا ایک ماہ کا فاصلہ ہے۔یہ فاصلہ بہت ہے اور اس کے درمیان بہت سے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔اگر سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل ہو گیا تو ہم بلا جھجک بیگم نصرت بھٹو کے یہ الفاظ دہرا سکتے ہیں کہ اگر ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی تو یہ پھندا ان (ضیاءالحق) کی گردن بھی نہیں چھوڑے گا۔''

(ہفت روزہ بلٹز بمبئی انڈیا 10 فروری 1979ء)

''بھٹو جو انتہائی خوددار آدمی ہیں ان سے توقع نہیں کہ رحم کی درخواست کریں۔''

(دی گارجین لندن 18 فروری 1979ء)

''آزادی کے بعد'' بڑھتی ہوئی توقعات کا انقلاب جاری رہے گا۔ابتدا خفیہ طور پر اور اس کے بعد جیسے جیسے اس کی مایوسیاں ناقابلِ برداشت ہو جائیں گی تو کھلے ہوئے تشدد کی صورت میں جاری رہے گا۔بھٹو کو پھانسی دینا اس جذبے کو تقویت دے گا۔اس کردار کے بارے میں بھٹو کا اپنا دعویٰ کتنا ہی برخود غلط کیوں نہ ہو،ایک غیر مربوط تحریک کو ایک شہید فراہم کر دیا جائے۔''

(فار ایسٹرن اکنامک ریویو 16 فروری 1979)

''مسٹر بھٹو کے جرم کے عوامل وعواقب میں گئے بغیر حقیقت یہ ہے کہ ایک فوجی بغاوت کے ذریعے انہیں معزول کرنے والے شخص جنرل ضیاء کے پاس رحم کرنے کا آئینی اختیار ہے اور اس معاملے میں انہیں اسے استعمال کرنا چاہیے۔درست کہ جنرل ضیاء نے پہلے ہی یہ نشاندہی کر دی ہے کہ وہ عدالتی فیصلے کی پابندی کریں گے جس کا مطلب ہے کہ کوئی صدارتی مداخلت نہیں ہوگی لیکن بھٹو کا معاملہ ایک خاص معاملہ ہے جو خصوصی غوروخوض کا متقاضی ہے۔''

(کرسچین مونیٹر 7 فروری 1979ء)

''ایسا کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے مسٹر بھٹو کے مقدمے کو سیاست سے علیحدہ کیا جا سکے۔''

(نیویارک ٹائمز 7 فروری 1979ء)

www.bhutto.org

بظاہر یہ پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ اگر جناب بھٹو کو پھانسی دے دی گئی تو کیا ہوگا مگر یہ صاف ظاہر ہے کہ سزائے موت پر عملدرآمد سے قوم کا مستقبل سنگین خطرے میں پڑ جائے گا اور صدر ضیاء کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا ان خطرات کو مول لیا جاسکتا ہے۔"

(دی جاپان ٹائمز کا اداریہ 13 فروری 1979ء)

"حالات پر نظر رکھنے والے اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ فی الحال چند ہزار متصادم انتہا پسند بھرپور خانہ جنگی شروع نہیں کرسکتے پھر بھی مجموعی رائے یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی سرگرمیاں ایک طرف بھٹو کے حامیوں اور پرجوش مذہبی لوگوں کے درمیان اور دوسری طرف دائیں اور بائیں بازو کے درمیان صرف کشیدگی ہی میں اضافہ کرسکتی ہیں۔ جب بھٹو کی قسمت کا فیصلہ ہوجائے تو اس صورتِ حال کا نشانہ شاید خود پاکستان ہوگا۔"

(ایشیا ویک 9 مارچ 1979ء)

دنیا کے معروف رسائل و جرائد کے تجزیوں اور اندازوں کے بعد یہ صورتِ حال واضح ہوتی ہے کہ دنیا بھر کا پریس مسٹر بھٹو کے مقدمے' مسٹر بھٹو کی پھانسی کو اور اس کے ردِعمل پر کس طرح اور کیا سوچتا تھا۔ اس مختصر سی تصویر کشی کے بعد جو بین الاقوامی پریس کے ذریعے کی گئی ہے، اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ عالمی پریس بھٹو کے مقدمے کو ایک سیاسی مقدمہ اور بھٹو کی پھانسی کو مسائل میں اضافے کا سبب تصور کرتا ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ منسوخ کرکے ہی پاکستان میں امن و سکون رہ سکتا ہے اور ایک فوجی حکمران اس فیصلے کو اہم معاملے کے طور پر لے۔ پریس چونکہ رائے عامہ کے اظہار کا ذریعہ ہے اس لیے یہ سوچ دنیا بھر کے لوگوں کی سوچ ہے۔

جبکہ دوسری طرف ہمارے ملک کے سیاستدانوں اور جماعتوں کا رویہ بہت ہی حیران کن تھا۔ یہ راہنما مارشل لاء کی حمایت میں اور بھٹو دشمنی میں اتنے آگے چلے گئے کہ ان کا یہ رویہ یقیناً پاکستان میں مزید سیاسی بحران کا سبب بنا۔ بھٹو مخالف پارٹیوں نے ملک کی سب سے بڑی پارٹی کے سربراہ کی پھانسی کی حمایت کی اور جمہوریت کا قتل کرکے منتخب وزیراعظم کو پھانسی کی سزا دینے والی آمر حکومت کی حمایت کی۔ ان سیاسی راہنماؤں کے اس رویے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ ملک میں حقیقی جمہوریت سے کس قدر مخلص اور مسٹر بھٹو کی مقبول شخصیت سے کس قدر خوفزدہ تھے۔ اسی لیے انہوں نے جمہوریت کے مقابلے میں آمریت کا ساتھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ

www.bhutto.org

یہ سیاستدان آج تک عوام میں اپنا اعتماد بحال نہیں کر پائے۔

پاکستان قومی اتحاد کے ایک مرکزی قائد تحریک خاکسار خان اشرف خان فرماتے ہیں:

''اب کوئی طاقت بھٹو کو موت سے نہیں بچا سکتی۔ صدر پاکستان کو بھٹو کو معاف کرنے کا کوئی حق نہیں۔''

(روزنامہ امروز یکم اپریل 1979ء)

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیتِ طلبا لیاقت بلوچ کا بیان:

''بھٹو کو بلا تاخیر پھانسی دے دی جائے۔''

(روزنامہ امروز یکم اپریل 1979)

''7 فروری 1979ء کو لاہور ہائی کورٹ بار میں بھٹو کی پھانسی منسوخ کرنے کے لیے ایک قرارداد پیش کی گئی جسے جماعتِ اسلامی کے حامی وکلاء نے ہنگامے کی نذر کر دیا۔ جماعتِ اسلامی اور دیگر قومی اتحاد کے حامیوں نے وکلاء پر کرسیاں برسائیں جس سے متعدد وکلاء زخمی ہو گئے۔

پاکستان مسلم لیگ کے دو نامور راہنماؤں رانا ظفر اللہ خان اور محمد اکبر کا مشترکہ بیان

''بھٹو کی کسی صورت میں جان بخشی نہ کی جائے۔ صدر کو بھٹو کی رحم کی اپیلوں پر غور نہیں کرنا چاہیے۔''

(روزنامہ امروز 12 فروری 1979ء)

جمہوریت اور اسلام کے بہت بڑے علمبردار اور پاکستان قومی اتحاد کے چوٹی کے راہنما مولانا شاہ احمد نورانی کا ردعمل:

''ضیاء الحق نے نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کا عظیم کام شروع کر دیا ہے، وہ قابلِ تحسین ہیں۔ بھٹو کے لیے رحم کی اپیلیں کرنے والے ممالک پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔ کسی ملک کو پاکستان کی آزادی اور ہائی کورٹ و سپریم کورٹ کے وقار کو مجروح کرنے کا حق نہیں۔''

(روزنامہ امروز 12 فروری 1979ء)

اسلامی جمعیتِ طلبا سرحد کے ناظمِ اعلیٰ شبیر احمد کا بیان:

''بھٹو کی سزائے موت پر بلا تاخیر عمل کیا جائے۔''

(روزنامہ امروز 12 فروری 1979ء)

www.bhutto.org

پاکستان قومی اتحاد کے مرکزی راہنما صدر آزاد جموں وکشمیر مسلم کانفرنس وصدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم کا ڈپلومیٹک بیان جو انہوں نے مسٹر بھٹو کی پھانسی کے فیصلہ پر دیا:

''یہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کا فیصلہ ہے اس پر تبصرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔''

(روزنامہ امروز 7 فروری 1979ء)

مارشل لاء حکومت کے بہت بڑے حمایتی اور متحدہ پاکستان پارٹی کے سربراہ عبدالباقی بلوچ کا مطالبہ: ''ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی جائے۔''

(روزنامہ نوائے وقت لاہور 30 مارچ 1979ء)

تحریکِ استقلال کے سربراہ، قومی اتحاد کے روحِ رواں اور ''جمہوریت کے علمبردار'' ائیر مارشل اصغر خان کا مسٹر بھٹو کو سزائے موت دینے کے فیصلے پر ردِ عمل:

''بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ملک کی سیاست کا ایک دور مکمل ہو گیا ہے۔ اب دوسرا دور شروع ہے۔ سیاسی فضا تحریکِ استقلال کے لیے موافق ہے۔''

(روزنامہ امروز 8 فروری 1979ء)

پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ اور جمہوریت کے دعویدار مولانا مفتی محمود کا بھٹو کی پھانسی کے فیصلے پر اظہارِ خیال:

''سپریم کورٹ نے بھٹو کی اپیل کے سلسلہ میں جو فیصلہ سنایا ہے وہ انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔''

(روزنامہ امروز 7 فروری 1979ء)

تحریکِ استقلال کے نائب صدر ملک وزیر علی کا ردِ عمل:

''سپریم کورٹ کا فیصلہ ہر شہری کو قبول کر لینا چاہیے۔''

(روزنامہ نوائے وقت لاہور 7 فروری 1979ء)

پیر پگاڑا کا ایک بیان عرب نیوز جدہ میں 7 فروری کو شائع ہوا۔ اس بیان میں وہ کہتے ہیں۔

''میں ایک ایسے شخص کی وکالت کس طرح کر سکتا ہوں جس کی لغت میں لفظ رحم سرے سے غائب تھا؟ اس کا مطلب ایک بھیڑیے پر رحم کھانا ہوگا۔''

مسلم لیگ کے سرکردہ راہنما چودھری ظہور الٰہی، ولی خان اور اصغر خان تو بھٹو حکومت میں ہر

وقت یہ دعویٰ کرتے رہے کہ ہم بھٹو کو پھانسی دیں گے۔ انہوں نے کوئی موقع ایسا نہ جانے دیا جب ان راہنماؤں نے سرِ عام جلسوں میں بھٹو کی پھانسی کے مطالبے نہ کیے ہوں۔ اخبارات کی فائلیں اس کی گواہ ہیں۔ اصغر خان نے 1977ء کی انتخابی مہم میں یہ اعلان کیا تھا کہ "ہم بھٹو کو کوہالہ کے پل پر پھانسی دیں گے۔"

مسٹر بھٹو کا مقدمہ پاکستان کی فوجداری تاریخ میں طویل ترین مقدمہ تھا اور ایک مہنگا ترین مقدمہ بھی۔ یحییٰ بختیار نے 66 دن سپریم کورٹ میں دلائل دیئے۔ سپیشل پبلک پراسیکیوٹر اعجاز حسین بٹالوی نے 38 دن دلائل دیئے جبکہ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے سپریم کورٹ میں چار دن خطاب کیا اور عدالت نے قتل میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا۔ یہ بھی ایک منفرد مثال ہے۔ حکومت نے سپیشل پبلک پراسیکیوٹر اعجاز بٹالوی اور ان کے دو ساتھیوں کو سپریم کورٹ میں مقدمہ کی سماعت کے دوران 6 لاکھ روپے کی ادائیگی کی۔ تین اقبالی ملزموں صوفی غلام مصطفیٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار کے وکیل مسٹر ارشاد قریشی کو تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کیے گئے۔ دستاویزات کی تیاری اور ان کی نقول پر نو لاکھ روپے کا خرچہ آیا۔

اختلافی فیصلہ ہونے کے سبب قانونی طور پر مقدمہ کی نوعیت منفرد ہے۔ قانونی تاریخ میں صرف ایک مثال ہے جب اختلافی فیصلہ ہونے کے باوجود مجرم کو سزائے موت دی گئی۔ ان تمام حقائق و واقعات کو سامنے رکھیں تو بھٹو کی سزا میں کمی کا ایک ٹھوس جواز بنتا تھا۔ یہ فیصلہ بھی جنرل ضیاء الحق کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ جنرل ضیاء نے اقتدار سنبھالتے وقت کہا تھا کہ ہم کسی کو عدالتوں میں نہیں گھسیٹیں گے بلکہ ہم اپنی تمام توانائیاں غیر جانبدار اور منصفانہ الیکشن پر مرکوز رکھیں گے، یہی ہمارا مقصد ہے لیکن جنرل ضیاء الحق نے سیاسی مخالفین کو عدالتوں میں بھی گھسیٹا اور عدالتوں کے اختیارات بھی سلب کیے بلکہ حکومت نے پراپیگنڈے کے ذریعے نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھٹو کو چور، قاتل، غاصب، ظالم، آمر، جھوٹا اور انسانیت دشمن کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے ساری دنیا میں پاکستان کے سفارتخانوں نے "بھٹو دشمن پراپیگنڈہ" کیا۔

جنرل ضیاء الحق نے خود اپنے کہے سے پھر جانے کی بنا پر خجالت آمیز شہرت حاصل کی ہے۔"

(دی آبزرور۔ لندن 18 اپریل 1979ء)

مسٹر بھٹو نے دورانِ اسیری اور سزائے موت کے ایک قیدی کی حیثیت سے جس حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا وہ انمٹ تاریخی کردار ہے۔ انہوں نے ذلت آمیز رویے اور ناانصافی کے سامنے

ہتھیار نہیں پھینکے اور وہ ان مصائب کے سامنے بڑے نارمل انداز میں ڈٹے رہے۔ بیگم نصرت بھٹو نے جب سپریم کورٹ کا فیصلہ سنا تو وہ روتی ہوئی جیل پہنچ گئیں لیکن جب وہ مسٹر بھٹو کے سامنے آئیں تو پابندِ سلاسل بھٹو نے کہا، "آنسو مت بہاؤ۔" اس دوران مسٹر بھٹو نے خود چائے بنائی اور بیگم بھٹو کے ساتھ مختلف موضوعات پر بحث کی۔ اسی طرح جب مسٹر بھٹو کے وکلاء نے ان کو عدالت کے فیصلے سے آگاہ کیا تو ذوالفقار علی بھٹو نے کہا "اچھا ہوا کہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کا اختتام ہو گیا۔"

راولپنڈی جیل کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے جو مسٹر بھٹو کی شخصیت کی خوبصورتی کی عکاسی کرتا ہے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا تو بھی مسٹر بھٹو کی شخصیت اور رویے میں یہ قید و مشکلات کوئی رکاٹ نہ بن سکیں۔ جیل کے عملے اور پولیس کے ساتھ ان کا دوستانہ رویہ حسین داستانیں پیچھے چھوڑ گیا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منظرِ عام پر آئیں گی۔ ایک دن نصرت بھٹو صاحبہ ٹفن میں کھانا لے کر پنڈی جیل آئیں تو سپرنٹنڈنٹ جیل یار محمد نے اصرار کیا کہ کھانے کی تلاشی دی جائے۔ بیگم بھٹو کے انکار پر سپرنٹنڈنٹ نے بیگم صاحبہ کے ساتھ سخت کلامی کی تو بیگم بھٹو نے ملاقات کے دوران مسٹر بھٹو سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ بھٹو صاحب کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ بھٹو صاحب ہمیشہ اپنی موت کی کوٹھڑی کے سامنے سے گزرنے والے جیل کے عملے سے حال احوال پوچھا کرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد مسٹر بھٹو نے سپرنٹنڈنٹ جیل یار محمد سے اس کا شکوہ تو نہ کیا البتہ جب بھی چوہدری یار محمد ادھر سے گزرتے تو مسٹر بھٹو خاموشی سے منہ دوسری طرف کر لیتے۔ تین دن گزرنے کے بعد یار محمد نے محسوس کیا کہ بھٹو صاحب ان سے ناراض نظر آتے ہیں تو یار محمد نے ازخود بھٹو صاحب سے اس واقعے کی معافی مانگی تو بھٹو صاحب نے کہا "یار محمد ان خواتین بیگم بھٹو اور بےنظیر بھٹو نے جیلیں تو نہیں دیکھی ہیں۔" اس کے بعد مسٹر بھٹو نے یار محمد سے گفتگو بحال کر لی۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جیل میں کیے گئے تشدد اور زیادتیوں کو پبلسٹی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش نہ کی۔ ان کا موقف تھا کہ آخر میں ان زیادتیوں کا ذکر کر کے کیا حاصل کر سکوں گا؟ جب مسٹر بھٹو کو سپریم کورٹ میں خطاب کرنے کی اجازت دی گئی تو ایک دن چیئرمین نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اگر میں اپنی کمر سے قمیض اٹھاؤں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں کن حالات سے دوچار

ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔"

اس طرح جب جنرل شوکت مسٹر بھٹو کا طبی معائنہ کرنے جیل گئے تو وہ مسٹر بھٹو کی حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور سپریم کورٹ میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جیل میں حکومت کی طرف سے سلوک کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"میرے علاج میں جو غفلت برتی جا رہی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ میری بیماری سنگین ہو جائے لیکن ان غفلتوں کے باوجود میری صلاحیتیں برقرار ہیں جبکہ دوسروں کے اعصاب فالج زدہ ہو گئے ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ جیل کی صعوبتیں اور تکلیفیں مسٹر بھٹو کی صلاحیتوں کو متاثر نہ کر سکیں۔ جیل میں مسٹر بھٹو کی لکھی گئی مختلف تحریریں اور اپنے وکلاء کو قانونی نکات کی راہنمائی کے سلسلے میں کوششیں اس بات کا ثبوت ہے کہ بھٹو اپنی صلاحیتوں کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ مسٹر یحییٰ بختیار اور غلام علی میمن عدالت کے فیصلے کے بعد مایوس ہو چکے تھے لیکن جب وہ مسٹر بھٹو کو پھانسی کی کوٹھڑی میں گڈ سپرٹ میں دیکھتے تو وہ مسٹر بھٹو کی دلیری پر حیران رہ جاتے۔ ان کے بقول مسٹر بھٹو کو گڈ سپرٹ میں دیکھ کر خود ان کے حوصلے بلند ہو جاتے۔ اس دوران ایک دفعہ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ ذوالفقار علی بھٹو کو ملنے جیل گئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی داڑھی بڑھ چکی تھی اور مسٹر بھٹو نے اپنے کمزور جسم پر تولیہ باندھا ہوا تھا۔ کمرے میں غلاظت نے ماحول کو بڑا گندہ کیا ہوا تھا لیکن پھانسی کا منتظر راہنما حیران کن حوصلے اور جرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔

مسٹر بھٹو نے اپنے خاندان کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ میرے لیے جنرل ضیاء سے رحم کی اپیل نہ کریں۔ مسٹر بھٹو نے بار بار اس بات کا اعلان کیا کہ میں کسی صورت میں بھی جنرل ضیاء سے رحم کی اپیل نہیں کروں گا جبکہ جنرل ضیاء کی یہ خواہش تھی کہ کاش بھٹو اپنے لیے رحم کی اپیل ان کی میز پر بھیجیں۔ مسٹر بھٹو کا موقف تھا کہ میں ضیاء الحق سے اپیل کیوں کروں کیونکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مسٹر بھٹو کا یہ جرأت مندانہ اقدام ان کی شخصیت کو ناقابلِ تسخیر بنا دیتا ہے۔ ضیاء الحق مسٹر بھٹو کو شکست دینا چاہتا تھا لیکن مسٹر بھٹو نے ضیاء کو رحم کی اپیل نہ کر کے جنرل ضیاء کو نفسیاتی شکست دے دی۔ ضیاء الحق کی میز پر دنیا بھر کی رحم کی اپیلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جن میں مسٹر بھٹو کی جدوجہد، کارنامے اور عدم انصاف کا ذکر کیا گیا تھا۔ یقیناً اپیلوں کا اتنا بڑا انبار بھی جنرل ضیاء الحق کو ہر لمحہ

www.bhutto.org

بے چین کیے ہوئے تھا۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد قانونی جنگ کا آخری مرحلہ اب نظرِ ثانی کی درخواست تھی۔ اس سلسلے میں آئین کے آرٹیکل 45 اور تعزیراتِ پاکستان کی دفعات 56 اور 58 کے تحت سزائے موت برقرار رکھے جانے کے فیصلے کے خلاف نظرِ ثانی کی درخواست بھٹو کے وکلاء نے دائر کر دی۔ چنانچہ نظرِ ثانی کی درخواست کی سماعت 24 فروری سے شروع ہوئی اور سترہ مارچ تک مکمل ہوگئی۔ اس دوران مسٹر بھٹو کے وکیل غلام علی میمن حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب 9 مارچ کو انتقال کر گئے۔ قدرت کا کمال ہے کہ جس شخص نے اتنی جانفشانی سے سزائے موت کے ایک قیدی کا مقدمہ لڑا وہ عدالت کے آخری فیصلے سے پہلے خود ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ غلام علی میمن کے جنازے میں ہزاروں افراد نے شرکت کی جن میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن بھی شریک تھے۔ 24 مارچ کو سپریم کورٹ نے نظر ثانی کی درخواست مسترد کر دی۔ اس مرتبہ بھی فیصلہ چار اور تین کا تھا۔ ایک فیصلہ مسٹر جسٹس محمد اکرم نے لکھا جس کو مسٹر جسٹس ایس انوار الحق نے پڑھ کر سنایا۔ مسٹر جسٹس محمد اکرم کے فیصلے کی تائید مسٹر جسٹس انوار الحق، مسٹر جسٹس کرم الٰہی چوہان اور مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ نے کی جبکہ دوسرا فیصلہ مسٹر جسٹس داراب پٹیل نے لکھا اس کی تائید مسٹر جسٹس حلیم اور مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے کی۔ دونوں فیصلوں، جسٹس اکرم اور جسٹس دراب پٹیل میں جو بات مشترک تھی وہ یہ کہ ''مسٹر بختیار نے سزا کو کم کرنے کے لیے جو دلائل دیئے ہیں وہ انتظامیہ کے لیے اس وقت قابلِ غور ہیں، جب وہ سزا کو معاف کرنے کے لیے اپنا اختیار استعمال کرے گی۔''

مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے بی بی سی کے نمائندے کو اور دوسرے غیر ملکی نمائندوں کو انتظامیہ کی جانب سے رحم کی اپیل کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''فیصلے میں جو متعلقہ آبزرویشن دی گئی ہے وہی اس کا جواب ہے۔ ان کے ذاتی خیال میں مذکورہ آبزرویشن رحم کی اپیل کے بھی مترادف ہے اور اسے ایسے ہی سمجھنا چاہیے۔ مسٹر بھٹو کے وکیل نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ انتظامیہ کے لیے سزا میں کمی کرنے کا معقول جواز ہیں۔ چھ دوسرے ججوں کا بھی نکتہ یہ تھا کہ جب اعلیٰ عدالت کی طرف سے کوئی سفارش کی جاتی ہے انہیں ایسی کوئی مثال یاد نہیں جس میں سفارش کو نظر انداز کیا گیا ہو۔''

بین الاقوامی دباؤ، سیاسی بحران کے خاتمے اور قانونی وجوہات کی بنا پر اب جنرل ضیاء الحق

اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے مسٹر بھٹو کو چھوڑ سکتا تھا، قانون بھی اس کی اجازت دے رہا تھا بلکہ عدلیہ نے اس سزا کو قابلِ معافی قرار دیا تھا۔ سزا میں معافی یا تخفیف کا معقول جواز پیدا ہو چکا تھا لیکن ضیاء الحق نے کسی کی ایک نہ سنی۔

اس دوران لندن میں بین الاقوامی ماہرینِ قانون نے دو روزہ کانفرنس منعقد کی جس میں دنیا بھر کے دو درجن کے قریب ماہرینِ قانون اکٹھے ہوئے اور اس کانفرنس کی صدارت برطانیہ کے معروف قانون دان کلاڈ مورس نے کی۔ یاد رہے کہ کلاڈ مورس جناب بھٹو کے مقدمۂ قتل کے دوران پاکستان کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کا وکیل بننے کی کوشش کی تھی لیکن پاکستانی قانون کے مطابق ان کو اس کی اجازت نہیں مل سکی تھی اور انہوں نے لاہور ہائی کورٹ کا مقدمہ ایک مبصر کی حیثیت سے سنا تھا۔ اس کانفرنس میں امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل رمزے کلارک بھی شامل ہوئے۔ اس کانفرنس نے بھٹو کے مقدمہ قتل میں دی گئی شہادتوں اور دیگر قانونی نکات پر غور کیا۔ کانفرنس میں یہ طے پایا کہ لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ تعصب پر مبنی تھا۔ چونکہ ہائی کورٹ کے یہ ریمارکس کہ بھٹو جھوٹے اور دروغ گو ہیں ہائی کورٹ کی جانبداری ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ دوسرا یہ کہ ایک ملزم صوفی غلام مصطفیٰ موقع واردات پر موجود ہی نہیں تھا۔ تیسرا یہ کہ بھٹو کے مقدمے میں انصاف اور قانون کے بین الاقوامی معیار کو پورا نہیں کیا گیا۔

24 مارچ کے فیصلے کے بعد مسٹر بھٹو کی قانونی جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ پہلے بھی دنیا بھر کے راہنماؤں نے بھٹو کی رہائی کے لیے رحم کی اپیلیں بھیجی تھیں۔ اس آخری فیصلے کے بعد اپیلوں میں مزید شدت آ گئی بلکہ کئی غیر ملکی سربراہوں نے اپنے نمائندے پاکستان بھیجے تاکہ مسٹر بھٹو کی سزا معاف یا اس میں کمی کروائی جا سکے جبکہ ملک کے اندر ضیاء نے مسٹر بھٹو کو پھانسی دینے کے لیے ''سازگار فضا'' قائم کر لی تھی۔ خوف بھی پھیل چکا تھا اور سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھا۔ اسلام کے نام پر جنرل ضیاء کی حکومت نے مذہبی جماعتوں کو یہ باور کروایا کہ بھٹو اسلامی نظام میں رکاوٹ ہیں اور ان کے خاتمے کے بعد اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں پھانسی سے کچھ عرصہ قبل ہی عید میلاد النبیؐ کے موقع پر اسلامی نظام نافذ کرنے کا اعلان کیا گیا اور ملک بھر میں اس روز جشن منایا گیا۔ تمام جماعتوں نے اس وقت ضیاء حکومت کا مکمل ساتھ دیا۔ چونکہ مذہبی جماعتیں بھٹو کو کافر سمجھتی ہیں لہٰذا ان کے لیے اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایک

کافر سے نجات پالی جائے۔ کئی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والی جماعتیں بھی ایسے ہی عزائم رکھتی تھیں۔ چونکہ مسٹر بھٹو نے جمہوریت اور سوشلزم کا نعرہ لگا کر ان قوم فروش جماعتوں کا مقابلہ کر کے عوامی جدوجہد کی داغ بیل ڈالی تھی لہٰذا مارشل لاء کے سائے ہی ان بھٹو مخالف جماعتوں کے لیے ایک بہتر پناہ تھے۔ جمہوریت کے دعویٰ کرنے والے اکثر راہنما تو کسی طرح بھی مسٹر بھٹو کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے جن میں اصغر خان اور جماعتِ اسلامی سرِ فہرست تھے۔ اصغر خان ذوالفقار علی بھٹو کے خاتمے کے بعد اقتدار کے خواب دیکھ رہے تھے۔ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو سپریم کورٹ میں چیف آف آرمی سٹاف کے جواب میں اپنی آئینی درخواست میں کہتے ہیں:

''اصغر خان قومی اتحاد کے صدر بننے کے بہت خواہاں تھے لیکن اس غیر ملکی قوت کی شہ پر جس کی ایک جیب میں اصغر خان اور دوسری جیب میں مدعا علیہ ضیاء الحق ہے، انہوں نے مولانا مفتی محمود کے لیے صدارت کا راستہ صاف کر دیا۔ اسی غیر ملکی قوت نے اصغر خان کو ہدایت کی تھی کہ وہ مولانا مفتی محمود کو سامنے رکھیں تا کہ تمام حملوں کا وہی ہدف بنیں۔ اصغر خان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ غیر ملکی اخبارات کے ذریعے ان کی شخصیت بنائی جائے گی۔ اسی طرح مدعا علیہ (جنرل ضیاء الحق) سے بھی رابطہ کیا گیا اور آخر میں اصغر خان کو ڈراپ کر کے مدعا علیہ کو سامنے لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ اطلاع قطعی مصدقہ ہے۔''

لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں پی این اے اور مارشل لاء حکومت کے مفادات مشترکہ نظر آتے ہیں۔ حقائق تلخ ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ قوم کی امانت ہیں جن کو منظرِ عام پر لانا ہر محبِ وطن شہری کا فرض ہے۔ درحقیقت پی این اے کی تحریک اور فوج کا مارشل لاء لگانا غیر ملکی سازش کا حصہ تھا اور پھر بھٹو کو پھانسی اس سازش کا آخری مرحلہ تھا جس کے بعد غیر ملکی قوت (امریکہ) اپنے مفادات کے لیے اس خطے میں کھل کر سامنے آ گئی، جس میں امریکیوں کا افغان جہاد سرِ فہرست تھا۔

جنرل ضیاء الحق نے دنیا بھر کے راہنماؤں کی اپیلوں کو ٹھوکر مار کر پاکستان کے سابق وزیرِ اعظم اور چیئرمین اسلامی کانفرنس کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے۔ اس سلسلے میں امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد اور مولانا خلیل حامدی 30 مارچ 1979ء کو سعودی عرب کے دورے کے بعد واپس پاکستان آئے اور 3 اپریل کو جنرل ضیاء الحق سے ''ملاقات کا شرف'' حاصل کیا اور ملاقات میں اپنی کامیابی سے آگاہ کیا اور سعودی عرب کے ''سبز سگنل'' کی خبر دی۔ اسی دن جنرل

ضیاء الحق نے امریکہ کے صدر جمی کارٹر سے ٹیلی فون پر صلاح مشورے کیے جس کے بعد ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

3 اپریل تک 6 تالوں میں بند بھٹو سے بھٹو خاندان نے آخری ملاقاتیں کیں جن میں مسٹر بھٹو کی پہلی بیوی شیریں امیر بیگم بھی شامل ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ راولپنڈی آئی تھیں۔ ذوالفقار علی بھٹو جن کو کسی بھی وقت پھانسی دی جاسکتی تھی نہایت خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے۔ یہ الفاظ ہر آخری ملاقات کرنے والے شخص نے کہے۔ 31 مارچ 1979ء کو شیریں امیر بیگم نے اپنے خاوند ذوالفقار علی بھٹو سے نصف گھنٹے تک ملاقات کی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے حسب عادت بڑے خوش کن موڈ کے ساتھ شیریں امیر بیگم کے ساتھ چائے پی۔ شیریں امیر بیگم صاحبہ نے اپنے خاوند سے آخری ملاقات کے بعد لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں اور آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ یہ کہا، "وہ آج اپنے شوہر سے آخری ملاقات کر کے انہیں خدا کے سپرد کر آئی ہیں اور میرے شوہر نے رحم کی اپیل کے لیے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔"

بے نظیر بھٹو اور بیگم بھٹو کو حکومت نے سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کیا ہوا تھا جبکہ صنم بھٹو، شاہنواز بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو نے دو سال سے اپنے باپ کی شکل تک نہ دیکھی تھی کیونکہ وہ ملک سے باہر تھے۔ بے نظیر اور بیگم بھٹو صاحبہ نے 3 اپریل 1979 کو جناب ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات کی۔ جب یہ دونوں خواتین جیل سے باہر نکلیں تو وہ غم سے نڈھال ہو چکی تھیں۔ ماں اور بیٹی کی یہ آخری ملاقات اڑھائی گھنٹوں پر محیط تھی۔ ماں اور بیٹی نے یہ ملاقات پھانسی کی کوٹھڑی کی سلاخوں کے پیچھے کی۔ ذوالفقار علی بھٹو سلاخوں کے پیچھے فرش پر بیٹھے تھے۔ حکومت نے پروگرام کے مطابق پراپیگنڈے کی مہم کو آخری وقت تک جاری رکھا۔ 3 اپریل کو حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش گاہوں کراچی، لاڑکانہ اور نوڈیرو میں چھاپے مار کر یہ اعلان کیا کہ حکومت نے بھٹو کی ان رہائش گاہوں سے دفاع اور امور خارجہ سے متعلق اہم سرکاری دستاویزات برآمد کر لی ہیں اور یہ دستاویزات مسٹر بھٹو بیرون ملک سمگل کرنا چاہتے تھے۔ ان چھاپوں کے دوران جو تیزی دکھائی گئی وہ بڑی عجیب ہے۔ دعویٰ کیا گیا کہ یہ دستاویزات قالینوں کے نیچے اور الماریوں میں چھپائی گئی تھیں حالانکہ چھپانے کے لیے اور کئی محفوظ مقامات اور جگہیں ہوتی ہیں۔ اس حکومتی بدمعاشی کے ایک ماہ بعد (مئی 1979ء) میں خود بھٹو کے ملازمین سے ملا جو اس وقت موقع پر موجود تھے جب

www.bhutto.org

حکومت نے وہاں پر چھاپے مارے۔ان کے بقول حکومت کو ایک ورق بھی نہ ملا بلکہ انہوں نے فرنیچر، گھریلو سامان اور الماریوں وغیرہ کی خوب توڑ پھوڑ کی۔ دراصل حکومت کا اس کارروائی سے صرف یہ مقصد تھا کہ بھٹو کے خلاف نفرت کو انتہا تک پہنچایا جائے۔حکومت یقیناً اس میں ناکام رہی اور آج تک اس کارروائی کا کچھ نہیں بنا کیونکہ وہاں سے حکومت کو ملا ہی کچھ نہیں تھا۔

مسٹر بھٹو کے بڑے بھائی سکندر علی بھٹو کی صاحبزادیاں، رخسانہ بھٹو اور شبنم بھٹو نے یکم اپریل کو اپنے چچا ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی۔ملاقات کے بعد دونوں خواتین نے بتایا:

''انہیں (بھٹو کو) اپنی جان سے زیادہ اصولوں کی فکر دامن گیر ہے اور مسٹر بھٹو نے ملاقات کے دوران یہ شعر پڑھا۔

زندگی بھر ہمیں ناشاد کرے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

پھانسی کے منتظر راہنما جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جیل میں عبدالحفیظ پیرزادہ سے آخری ملاقات میں کہا:

''دنیا دیکھے گی کہ ایک بہادر انسان کس طرح جان دیتا ہے، اسلامی سربراہی کانفرنس کا چیئرمین کس طرح مرتا ہے، تیسری دنیا کا لیڈر کس طرح جان دیتا ہے۔اب میں اپنے خالق حقیقی سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔''

4 اپریل 1979ء کو رات دو بجے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں سپرنٹنڈنٹ جیل چوہدری یار محمد، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سید مہدی، مجسٹریٹ درجہ اول بشیر احمد خان، سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس راولپنڈی جہاں زیب برکی اور میڈیکل آفیسر اصغر حسین کی موجودگی میں جلاد تارا مسیح نے دس روپے کے معاوضہ پر دنیا کے تاریخ ساز سیاستدان، سیاسی مفکر، سابق وزیر اعظم پاکستان، چیئرمین اسلامی سربراہی کانفرنس ذوالفقار علی بھٹو کو موت دے دی اور یوں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف غیر ملکی سازش جس کا اظہار وہ وزارتِ عظمٰی کے دوران کر چکے تھے، پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

''انہوں نے ان (ذوالفقار علی بھٹو) کے سر پر پٹی باندھنے کی کوشش کی، جو کہ باندھی جاتی ہے تو بھٹو نے کہا کہ نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن پھر بھی انہوں نے باندھی، پھر انہوں نے ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ

www.bhutto.org

دیجیے۔ بھٹو نے دوبارہ کہا کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس بات کو دو تین منٹ ہو چکے تھے۔ تارا مسیح جو پھانسی دینے لگا تھا وہ بھی ایک لمحے کے لیے خوف زدہ ہو گیا کہ میں جو کر رہا ہوں ایک وزیر اعظم کے ساتھ، اس کے مجھ پر کیا اثرات ہوں گے تو وہ کچھ دیر کے لیے گھبرا گیا۔

چند الفاظ جو بھٹو نے کہے: وہ یہ تھے وہ پہلے مڑے، پھر انہوں نے کہا کہ

"Get away with it"

یہ ان کے آخری الفاظ تھے یعنی ختم کرو یہ انہوں نے کہا کہ جو کچھ کرنا ہے فوراً کرو، آپ لوگ مجھے کھڑا کیوں رکھے ہوئے ہو؟''

(ایس کے محمود، سابق ہوم سیکرٹری پنجاب کے ایک اخباری انٹرویو سے اقتباس جو انہوں نے 2004ء میں دیا۔ جناب ایس کے محمود ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے وقت موقع پر موجود تھے)

جنرل ضیا الحق نے مسٹر بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

''آخر وہ ایک آدمی ہی تو تھا اب بھٹو کو بھول جاؤ۔''

لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ عوام بھٹو کو نہ بھلا پائے۔

بھٹو شہید ہو کر مجبوروں کے چہروں پر ایسی سرخی چھوڑ گیا جو بھٹو کو صدیوں تک زندہ رکھے گی۔ محکوموں کے چہروں کی یہ سرخی انقلاب اور جدوجہد کی سرخی ہے۔ بھٹو انقلاب، انصاف، جدوجہد، انسانی حقوق، پیار و خلوص، خوشی و کامرانی اور سچائی کی علامت بن چکا ہے۔ بھٹو کے یہ لافانی رنگ بھٹو کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ بھٹو ہماری ثقافت کا ناقابلِ فراموش کردار بن چکا ہے، جس نے ہمارے ادب لوک گیتوں اور لوک کہانیوں میں اپنا اہم مقام پالیا ہے۔ بھٹو نے روایتی انداز سیاست ترک کر کے عوامی اور انقلابی انداز سیاست کو اپنایا۔ بھٹو کی انقلابیت اور عوامیت بھٹو کو ہمیشہ زندہ رکھے گی کہ اس طرح بھٹو غریبوں کی جھونپڑیوں تک پہنچا۔ وہ سیاست کو ایوانوں سے نکال کر جھگی جھونپڑی، کچے مکانوں، قصبوں، دیہاتوں، کھلیانوں، کارخانوں، گلیوں اور بازاروں میں لے گیا۔ بھٹو نے اس طرح جاگیردارانہ سیاسی انداز پر کاری ضرب لگائی۔ بھٹو نے عوام کے سنگ ساتھ مل کر مست قلندر اور ہے جمالو کے عوامی گیتوں پر بھنگڑا اور دھمال ڈالی۔ اس طرح اس نے

اپنی ثقافت کو اونچا مقام دلوایا۔ وہ جلسوں میں ہاتھ اوپر اٹھا کر دونوں ہاتھوں کے ساتھ عوام کے ساتھ مل کر تالی بجاتا جس سے ایک ردھم قائم ہوتی جو آج ہمارے ملک کے سیاسی جلسوں کی ایک روایت بن گئی ہے۔ "جیوے جیوے بھٹو جیوے" کے نعرے کے ساتھ یہ ردھم اب چاروں صوبوں کے سیاسی جلسوں کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے شلوار قمیض زیب تن کر کے اس کو قومی لباس کے طور پر متعارف کروایا۔ یہ آج ہمارے پہناوے کے طور پر پاکستان کی پہچان ہے وگرنہ اس سے قبل شلوار قمیض کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ بھٹو ہی کے مرہون منت ہوا کہ شلوار قمیض جو ہمارا عوامی پہناوا ہے اس کو اونچا مقام ملا۔ دیر تک پیدا ہونے والی لاتعداد بیٹیوں اور بیٹوں کا نام والدین نے "بھٹو" رکھا۔ یہ سب کچھ بھٹو کے زندہ ہونے کا ثبوت ہیں۔ کیا اس صورت میں بھٹو ختم ہو گیا؟ ہر گز نہیں آج بھٹو ہر مزدور، کسان، محنت کش، مجبور، مظلوم، مفلس، بے کس، بھوکے اور بے بس انسان کے دلوں میں زندہ ہے۔ بھٹو ایک ختم نہ ہونے والی تحریک ہے۔

اسلام کے علمبرداروں نے بیٹی کو باپ کی میت کے آخری دیدار کی بھی اجازت نہ دی۔ اسی طرح بیگم بھٹو کو بھی حکومت نے اپنے شوہر کی میت دیکھنے کی اجازت نہ دے کر اپنے ظالم ہونے کا ثبوت دیا۔

عالمی اخبارات کا ردِ عمل:

"اسلامی سربراہی کانفرنس، سیرت کانگریس، اسلامی سیکرٹریٹ یہ سب بھٹو کی ذہنی اولادیں ہیں۔ عالمِ اسلام یہ راہنمائی اور سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ان کا شکر گزار ہے جن کے بغیر یہ منعقد نہیں کی جا سکتی تھیں۔"

(کویت ٹائمز اداریہ 15 اپریل 1979ء)

"1977ء سے جبکہ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری طور پر منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر پاکستان پر آمریت قائم کر دی تھی اسی وقت سے دنیا جنرل ضیاء الحق کو ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے جانتی ہے۔

اب ان کے ہاتھوں بھٹو کے پھانسی پانے کے بعد سے دنیا انہیں ایک خون کے پیاسے اور کم عقل کی حیثیت سے جاننے لگی ہے۔"

(سن ٹائمز شکاگو، اداریہ 7 اپریل 1979ء)

www.bhutto.org

''اطلاعات کے مطابق انہوں (ضیاء الحق) نے اپنے شریکِ کار فوجیوں سے کہا انہیں بھی اس فیصلے کے بوجھ میں حصہ لینا چاہیے۔ بھٹو کے دفاع میں کوئی نہ بولا۔''

(ایشیا ویک 13 اپریل 1979ء)

''جلد یا بدیر عوام ابھریں گے اور بھٹو جو ایک روایت بن چکا ہے وہ انہیں وحدانی تحریک دے گا۔''

(سپیکٹیٹر۔لندن)

''بھٹو کو پھانسی دینے کا فوری نتیجہ ملک میں علاقائی ،فوجی اور سیاسی ہر سطح پر تقسیم میں مزید اضافہ ہے۔''

(اکانومسٹ 7 اپریل 1979ء)

''بھٹو کی پھانسی کو سیاسی قتل کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا اور شاید یہ آخری قتل بھی ثابت نہ ہو۔ ایک شخص کو رات کی تاریکی میں 2 بجے قتل کر دیا گیا۔ انہوں (ذوالفقار علی بھٹو) نے یقیناً بہادری کی موت کو قبول کیا۔''

(ہفت روز بلٹز بمبئی 16 اپریل 1979)

''پاکستان پہلے ہی بلوچستان اور صوبہ سرحد میں علیحدگی پسندی کی مشکلات سے دوچار تھا۔ اب بھٹو کے آبائی صوبے سندھ کو بھی مخالفت کے سلگتے ہوئے مرکز کے طور پر شامل کیا جانا چاہیے۔''

(دی سنڈے ٹیلیگراف 18 اپریل 1979ء)

''ضیاء کا مسئلہ یہ ہے کہ فوجی مداخلت نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا ہے۔ انہوں نے بیس ماہ میں نہ تو کسی سیاسی ڈھانچے کی بنیاد رکھی نہ ہی اقتصادی بحالی کی کوئی علامت پیدا کی۔ اب بھٹو کو پھانسی چڑھانے کے بعد جہاں بھی وہ جائیں گے انتقام کے بگولے کو اپنا پیچھا کرتا پائیں گے۔''

(دی آبزرور لندن 18 اپریل 1979ء)

''یہ ظاہر بات ہے کہ بھٹو کی پھانسی سے حکومت کی بقاء کے امکانات پر شدید ضرب لگی ہے۔ ضیاء حکومت یہ سمجھتی ہے کہ صرف وہی بھٹو کو پھانسی سے بچا سکتی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ بات بھول گئی تھی کہ بھٹو اس کی نجات بھی تھے۔''

(فار ایسٹرن اکنامک ریویو 20 اپریل 1979ء)

www.bhutto.org

عالمی اخبارات و رسائل کی اس معمولی سی جھلک سے ہمیں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے ردِعمل کا علم ہوتا ہے۔ یہ ساری دنیا کا ردِعمل ہے جبکہ پاکستان کے اندر بھٹو مخالف سیاستدانوں کا ردِعمل خوشی پر مبنی تھا۔ چونکہ یہ لوگ بھٹو کی مضبوط قیادت کے سامنے اپنے آپ کو بڑا کمزور تصور کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ بھٹو کو جسمانی طور پر ختم کرنے کے بعد ان کو آگے بڑھنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ ان لوگوں نے جنرل ضیاء الحق کو بھٹو کی پھانسی کے مبارک باد کے پیغامات روانہ کیے۔ اس فیصلے کو قانون کی بالادستی، مکافاتِ عمل اور ظالم کے شرمناک حشر سے تعبیر کیا۔ اخبارات کی فائلیں اس کی گواہ ہیں کہ یہ سیاستدان جو جمہوریت کے دعویدار ہیں انہوں نے آمریت کا ساتھ دے کر بھٹو کی مخالفت کر کے یہ تصور کیا کہ اب بھٹو ختم ہو گیا۔ چونکہ بھٹو کا نام ہی پیپلز پارٹی ہے اس لیے وہ لوگ اس میں مکمل طور پر ناکام ہوئے ہیں۔

پھانسی سے متعلق کچھ افواہیں ابھی تک گردش کر رہی ہیں۔ میرے نزدیک ان افواہوں کے پیچھے ان قوتوں کا ہاتھ ہے جو بھٹو کو پھانسی چڑھانے کی ذمہ دار ہیں۔ ہمیں وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب آج کی قتل گاہوں پر ایک عادلانہ سماج قائم کیا جائے تو حقائق خود بخود سامنے آئیں گے کہ جیل میں کس کس نے پاکستان کے پہلے منتخب وزیرِ اعظم کے ساتھ ظلم و زیادتی کی قتل گاہوں میں رات کی تاریکی میں کیا کیا کھیل کھیلے گئے؟ تاریخ سب کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ جنرل فیض علی چشتی کا جیل میں بھٹو پر تشدد ایک ایسی بات ہے جو زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو کے مترادف ہے۔ تاریخ سب قاتلوں کے چہروں سے نقاب نوچ لیتی ہے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی چڑھانے کے بعد ان کی میت کو ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی ہی میں غسل دیا گیا پھر ان کی میت کو ایک تابوت میں بند کر کے پاکستان ایئر فورس کے طیارے سی 130 کے ذریعے سکھر جانے کا حکم ملا۔ پائلٹ کو اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ جہاز میں کس کی میت کو لے جا رہا ہے لیکن جب جہاز میانوالی کے اوپر پرواز کر رہا تھا تو اس کو اس بات کا شک گزرا کہ جہاز میں جو تابوت وہ سکھر لے جا رہا ہے اس میں سابق وزیرِ اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی میت ہے۔ اس بات کا شک گزرنے کے بعد پائلٹ نے جہاز کو منزلِ مقصود تک لے جانے سے انکار کر دیا اور کنٹرول روم کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ اس بات کا علم ہونے پر پائلٹ کی طبیعت ٹھیک نہ رہی تھی اور اس نے جہاز کو سرگودھا کے ایئر بیس پر لینڈ کر دیا اور پھر ادھر سے یہ کام دوسرے پائلٹ کے

ذمے سونپا گیا۔ جسے اس کو ایئرپورٹ تک جانا تھا۔

میں شہید بھٹو کی تدفین کے ٹھیک چھیالیس دن بعد سترہ طلبا کے ہمراہ بھٹو کی آخری آرام گاہ گڑھی خدا بخش گیا جہاں میں شہید بھٹو کے اسٹیٹ منیجر عبدالقیوم خان سمیت جناب بھٹو کی نماز جنازہ پڑھانے والے امام محمود علی بھٹو سے ملا، اس ملاقات کے دوران جو معلومات حاصل ہوئیں وہ درج ذیل ہیں۔

مسٹر بھٹو کے خاندان کے سب سے معمر فرد ہونے کے ناتے بھٹو شہید کی قبر نبی بخش بھٹو نے کھدوائی۔ نبی بخش بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے چچا ہیں اور ممتاز بھٹو کے والد۔ تدفین کے وقت نبی بخش بھٹو، مظفر علی بھٹو مرحوم، مولا بخش بھٹو، مشتاق علی بھٹو، پیر بخش بھٹو سمیت محترمہ شیریں امیر بیگم بھی موجود تھیں۔ حکومت نے پھانسی دینے سے کئی دن پیشتر ہی نوڈیرو اور رتوڈیرو گڑھی خدا بخش بھٹو میں فوجی چوکیاں قائم کر دی تھیں اور ہر آنے جانے والے فرد سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا یکم اپریل کو فوج نے گڑھی خدا بخش بھٹو گاؤں کی سخت ناکہ بندی کر دی اور کسی باہر کے فرد کا گاؤں میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ شہید بھٹو کی میت 4 اپریل کو دو ہیلی کاپٹر لے کر آئے۔ ایک ہیلی کاپٹر میں فوجی حکام تھے اور دوسرے میں شہید قائد کی میت یہ ہیلی کاپٹر نوڈیرو کے قریب ہی عارضی طور پر قائم کیے گئے ہیلی پیڈ پر اترے۔ وہاں سے شہید قائد کی میت ایک پک اپ میں رکھ کر گڑھی خدا بخش بھٹو لائی گئی۔ شہید قائد کا جسدِ خاکی ساڑھے سات بجے صبح تک گڑھی خدا بخش پہنچ چکا تھا۔ سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیئر سلیم میت کے ہمراہ آئے تھے۔ مظفر علی بھٹو نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ شہید بھٹو کو دفنانے کی فلم بنائی گئی تھی اور یہ سب کچھ فوج کے افسران نے کیا۔ فوج نے میت کو دس منٹ کے اندر اندر دفنانے کا حکم دیا لیکن گاؤں کے لوگوں نے کہا کہ ہم میت کو اپنی خاندانی رسومات کے مطابق دفنائیں گے اور ہمیں اس کے لیے وقت دیا جائے۔ فوجی حکام بھٹو خاندان کا سخت رویہ دیکھ کر کافی پریشان ہوئے۔ مولا بخش بھٹو اور مظفر علی بھٹو نے فوجی حکام کو کہا کہ اگر آپ نے ہمیں اس کی اجازت نہ دی تو ہم سخت قدم اٹھائیں گے۔ ہمارے باپ کو تو آپ نے مار ہی دیا ہے ہمیں کسی قسم کا کوئی خوف نہیں۔ اسی اثنا میں گاؤں کی واحد مسجد سے گاؤں میں رہنے والوں کو بھٹو خاندان نے اپیل کی کہ مقابلے کے لیے گھروں سے باہر نکل آؤ جبکہ نوڈیرو کی طرف سے آئے ہوئے لوگ بھی فوج کے حصار کو توڑنے کے منتظر تھے۔ بریگیڈیئر سلیم جو بھٹو کے جسد خاکی کو دفنانے کی ڈیوٹی پر مامور تھے اس صورت حال سے کافی پریشان ہوئے اور انہوں نے کہا

کہ اعلیٰ حکام نے ہمیں اسی طرح دفنانے کا حکم دیا ہے لہٰذا میں رابطہ کر کے اجازت لیتا ہوں۔ وائر لیس پر رابطہ کے بعد فوج نے شہید بھٹو کی میت بھٹو خاندان کے حوالے کر دی۔ جب بھٹو خاندان کے بزرگ میت کو زنان خانے میں لے جانے لگے تو فوج کے افسران نے کہا کہ ہمارے افراد بھی زنان خانے میں جائیں گے لیکن بھٹو قبیلہ کے لوگوں نے اس کی قطعاً اجازت نہ دی۔ فوجی اس پر بھی بڑے پریشان ہوئے لیکن حالات سے مجبور ہو کر میت کو زنان خانے، بغیر فوجی جوانوں کے لے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

میت کو دوبارہ غسل نہیں دیا گیا۔ البتہ شہید قائد کی میت سے سینے تک کفن کو سرکایا گیا۔ شیریں امیر بیگم، مظفر علی بھٹو مرحوم، مولا بخش بھٹو مرحوم اور بھٹو شہید کے منیجر عبدالقیوم خان کے بقول قائد کے سینے پر زخم کے نشانات تھے اور گلے کے گرد بھی تشدد کا نشان تھا۔ اس جنازے میں بھٹو خاندان کے دو ڈاکٹر بھی شریک تھے۔ فوجی حکام کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اس موقع پر موجود ان ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ گلے پر جو نشانات تھے وہ پھانسی کے پھندے کے نشانات نہیں تھے۔ عبدالقیوم کے بقول ان کے دو بھائیوں کو پھانسی ہوئی تھی۔ ان کی گردنیں پھانسی کے بعد لمبی ہو گئی تھیں جبکہ قائد کی گردن ویسی نہ تھی۔ مسٹر بھٹو کی نماز جنازہ مولانا محمود علی بھٹو نے پڑھائی اور ذوالفقار علی شہید کا جسد خاکی ساڑھے دس بجے تک لحد میں اتار دیا گیا۔

شہید بھٹو کی شہادت کی خبر نے سارے ملک کا کاروبارِ زندگی معطل کر کے رکھ دیا اور پورے ملک میں سکوت طاری ہو گیا۔ مسٹر بھٹو کی شہادت کی باقاعدہ خبر پاکستان کے عوام نے سب سے پہلے آل انڈیا ریڈیو سے سنی جبکہ "نوائے وقت" لاہور نے ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا۔ اس ضمیمہ پر اشاعت کی تاریخ نہیں چھپی اور ضمیمہ صبح دس بجے تک بازاروں میں آ چکا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوائے وقت کو آخری فیصلے کی کافی پہلے سے آگاہی تھی اور اس نے پھانسی پر ضمیمہ پہلے ہی چھاپ لیا تھا۔

دوسرے دن سے غائبانہ نمازِ جنازہ کے سلسلے کا آغاز ہوا جو تقریباً ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ پھانسی کے فیصلہ پر فسادات پانچ اپریل کو شروع ہوئے۔ ملک کا کوئی ایسا شہر اور قصبہ نہ تھا جہاں پر پھانسی کے خلاف مظاہرہ نہ ہوا ہو اور اس طرح نمازِ جنازہ بھی ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں ہوئی۔ ملک بھر میں ان فسادات کے دوران تقریباً پانچ ہزار افراد گرفتار ہوئے۔

ملک سے باہر بھی اتنا ہی شدید ردِعمل ہوا جتنا ملک کے اندر۔ ان مظاہروں میں پاکستانیوں کے علاوہ وہاں کے مقامی باشندوں نے بھی حصہ لیا۔ ماسکو، واشنگٹن، نیویارک، لندن،

www.bhutto.org

برمنگھم، دہلی، بمبئی، کلکتہ، رام پور، مرادآباد، احمد آباد، ڈھاکہ، چٹاگانگ، انقرہ، استنبول، دہران، تہران، کابل، کویت، ابوظہبی، بیروت، ٹورنٹو، جدہ، کولمبو، طرابلس اور کھٹمنڈو سمیت دنیا کے ہر ملک کے اہم شہروں میں بھی مظاہرے ہوئے۔ ان احتجاجی مظاہروں میں سب سے زیادہ شدت مقبوضہ کشمیر میں تھی۔ مقبوضہ کشمیر میں ان ہنگاموں کے دوران تقریباً دوسوافراد شدید زخمی ہوئے۔

غیر ملکی سربراہانِ مملکت اور راہنماؤں نے بھی پھانسی دیئے جانے پر بڑا شدید ردِعمل ظاہر کیا۔

مسٹر بھٹو کی پھانسی پر چین نے سرکاری طور پر اعلان کیا:

''حکومتِ چین کو سابق وزیرِ اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو دی گئی پھانسی پر گہرا صدمہ ہوا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو چینی عوام کے پرانے بہی خواہ تھے اور دونوں ممالک کے درمیان اچھے تعلقات کے لیے ان کی کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔''

(صدرِ جمہوریہ عراق احمد حسن البکر کا بیگم بھٹو کے نام تعزیتی خط)

6اپریل1979

بیگم نصرت بھٹو صاحبہ!

آپ کے نامور شوہر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کی اطلاع پر مجھے گہرا صدمہ پہنچا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس موقع پر میں آپ سے اور آپ کے ذریعے غم زدہ خاندان کے دوسرے افراد سے اس عظیم نقصان پر جو صرف آپ کا نہیں بلکہ یہ پاکستان اور وسیع انسانیت کا نقصان بھی ہے اپنی انتہائی مخلصانہ ہمدردی اور دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہوں۔

اللہ ان کی روح کو سکون عطا فرمائے، آپ کو صبرِ جمیل اور اس ناقابلِ تلافی نقصان کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی روح پر لازوال رحم واحسان کا نزول فرمائے (آمین)۔

احمد حسن البکر

صدرِ جمہوریہ عراق

''اقوامِ متحدہ ایک شعلہ بیاں مقرر سے محروم ہوگئی ہے۔''

(سیکرٹری جنرل اقوامِ متحدہ کرٹ والڈ ہائیم)

عرب بعث سوشلسٹ پارٹی کی قومی قیادت کا پاکستان پیپلز پارٹی کے نام خط: ''کامریڈ ذوالفقار علی بھٹو چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی وسابق وزیر اعظم پاکستان کو پھانسی دینے کی خبر عرب بعث سوشلسٹ پارٹی کی قومی قیادت نے گہرے غم اور اندوہ کے شدید احساس کے ساتھ سنی۔

''ہماری پارٹی آپ کی پارٹی اور پاکستان کے برادر عوام کامریڈ ذوالفقار علی بھٹو کی جدائی پر غم کے شدید احساسات میں شریک ہیں۔ ہم ایک ایسے مجاہدِ آزادی کی سزائے موت پر اظہار افسوس کر رہے ہیں جس نے عوام کی خدمت اور دنیا کی اقوام کی جدوجہد کی حمایت کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ مسٹر زیڈ اے بھٹو شہید نے پاکستان اور دنیا کے سارے ممالک میں زبردست احترام حاصل کیا۔ اس لیے انہیں پھانسی دینا لازمی طور پر ایک سیاسی قتل ہے جو نہ تو پاکستان کے عوام اور نہ ہی آزادی اور ترقی کے لیے جدوجہد کرنے والے دنیا کے عوام کے مفاد میں ہے۔

براہِ کرم پاکستان کے عوام، پاکستان پیپلز پارٹی کے اراکین اور مرحوم کے افرادِ خانہ تک ہماری دلی تعزیت پہنچا دیجیے۔''

(عرب بعث سوشلسٹ پارٹی کی قومی قیادت دمشق 5 اپریل 1979ء)

شام کے صدر حافظ الاسد نے بھی بیگم نصرت بھٹو صاحبہ کے نام اسی طرح کا خط لکھا جس میں انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی جدوجہد کو سراہا اور اس کے ساتھ ہی شامی حکومت نے جنرل ضیاء الحق کے مجوزہ دورۂ دمشق کو فوری طور پر منسوخ کر دیا۔

''یہ پھانسی غلط پالیسی کے نتیجے میں دی گئی ہے۔ یہ ناموزوں اقدام ہے۔ پچھلے مہینے آغا شاہی تہران آئے تھے اور میں نے انہیں درخواست کی تھی کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے مگر افسوس ہے کہ مسٹر بھٹو کو سزائے موت دے دی گئی۔''

(وزیرِ خارجہ ایران ڈاکٹر سنجابی روزنامہ امروز 7 اپریل 1979ء)

''بھٹو کو پھانسی دینا ایک غلط اقدام ہے اور میرا اندیشہ ہے کہ اس کے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔''

(ایران کے مذہبی وانقلابی راہنما آیت اللہ شریعت مدار، روزنامہ امروز 7 اپریل 1979ء)

تنظیم آزادیٔ فلسطین لندن کے سربراہ نبیل رملاوی نے چیئرمین یاسر عرفات و فلسطینی عوام کا یہ پیغام میر مرتضیٰ بھٹو کے نام بھیجا:

www.bhutto.org

پیارے بھٹو!

میں آپ کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے بارے میں جان کر بہت غمگین ہوا ہوں۔ میں تنظیم آزادیٔ فلسطین اور فلسطینی عوام کی طرف سے اپنے غم اور تعزیت کے اظہار کے لیے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ آپ کے والد کی شہادت صرف پاکستانی عوام کا قومی نقصان نہیں ہے بلکہ آپ کے والد فلسطینی نصب العین کے ایک معمار اور مخلص حامی تھے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ چیئرمین یاسر عرفات نے شہید کی جان بچانے کے لیے کوششیں کیں۔ انہوں نے کئی بار پاکستانی حکام سے رابطہ قائم کیا اور تنظیم آزادیٔ فلسطین نے ترپولی میں ہونے والی اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس 1977ء اور ڈاکار میں ہونے والی اسلامی کانفرنس 1978ء میں یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور دونوں کانفرنسوں نے شہید ذوالفقار علی بھٹو جو اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے بھی چیئرمین تھے کی جان بخشی کے لیے قراردادیں منظور کیں۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین اور فلسطینی عوام کی جانب سے جس کی آپ کے عظیم والد نے مدد اور حمایت کی تھی میں آپ، آپ کی والدہ کو اور آپ کے خاندان کے تمام افراد کو دلی ہمدردی اور تعزیت پیش کرتا ہوں۔"

دنیا بھر میں بھٹو کی پھانسی کو دکھ اور غم کے جذبات کے ساتھ سنا گیا۔ پاکستان کے عوام نے بھی دہشت خوف اور جبر کے پہروں میں بھٹو کی پھانسی کی خبر کو سنا۔ بھٹو کی موت کو دنیا بھر کے لوگوں نے آزادی کے ایک راہبر کی جدوجہد کرنے والے کی شہادت قرار دیا لیکن "مارشل لاء نواز جمہوریت پسندوں" نے اس فیصلے کو قانون کی بالادستی قرار دیا اور ملک میں غنڈہ گردی کے خاتمے سے تعبیر کیا اور اس "جرأت مندانہ اقدام" پر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مبارکباد دی۔

چوہدری ظہور الٰہی یہ خوشخبری سن کر پھولے نہ سمائے۔ انہوں نے بھٹو کی پھانسی کی خبر سننے کے فوراً بعد جنرل ضیاء الحق کو فون کیا ان کو اس "کارنامے" پر مبارکباد دی اور فوری طور پر جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کا وقت مانگا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے مخلص ساتھی کو فوراً ملاقات کا وقت دے دیا۔ ملاقات کے دوران چوہدری ظہور الٰہی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ قلم ان کو دے دیا جائے جس سے آپ نے بھٹو کی موت کے پروانے پر دستخط فرمائے ہیں۔ جنرل ضیاء نے چوہدری مرحوم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ قلم چوہدری صاحب کے حوالے کر دیا۔ چوہدری

www.bhutto.org

صاحب اس بات سے بڑے متاثر ہوئے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے باوجود جنرل ضیاء بڑے نارمل موڈ میں تھے اوران کے چہرے پر پشیمانی' خوف یا ڈر کے ذرہ بھر بھی آثار نہ تھے۔ بعد میں چوہدری ظہور الٰہی مرحوم نے خود ان خیالات کا اظہار لندن میں مختلف لوگوں سے کیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے حمایتی عوام اور پارٹی کارکنوں کا اپنے چیئرمین کی پھانسی پر شدید ردعمل فطری تھا مگر مارشل لاء کی دستِ راست جماعتِ اسلامی کو یہ احتجاج ایک آنکھ نہ بھایا۔ انہوں نے نہ صرف بھٹو کی پھانسی پر مٹھایاں تقسیم کیں بلکہ ان کے لٹھ بردار لاہور سمیت مختلف شہروں میں احتجاجی جلوسوں پر ٹوٹ پڑے۔ جب وہ پی پی پی کے احتجاجی جلوسوں پر حملہ آور ہوتے تو ان کی زبان پر یہ نعرہ ہوتا تھا: "مردِ غازی مردِ حق ضیاء الحق ضیاء الحق۔"

جس انداز سے چیئرمین بھٹو شہید کو پھانسی دے کر ان کی میت کو جیل کے اندر ہی حکومت نے خود غسل دینے کا اہتمام کیا اور پھر ان کے جسدِ خاکی کو خاموشی سے دفنا دیا اور سب رسومات ادا کرنے کے بعد سرکاری طور پر اعلان کیا کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے، یہ سارا عمل ظاہر کرتا ہے کہ غاصب حکومت ملک کے عوامی راہنما سے کتنی خوف زدہ تھی۔

پھانسی کا وقت بہار کے موسم میں تقریباً چار بجے صبح کا ہوتا ہے لیکن مسٹر بھٹو کو پھانسی رات دو بجے دی گئی۔ اتنی عجلت کیوں برتی گئی؟ حالانکہ جب بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات کی تو چیئرمین بھٹو نے سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر پوچھا کہ یار محمد مجھے پھانسی کب دی جانی ہے؟ تو جیل سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ صبح ساڑھے چار بجے یہ ایسے سوالات ہیں جو پاکستان کے شہریوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں بلکہ ان کے شک کو یقین اور حقیقت میں بدل دیتے ہیں کہ مسٹر بھٹو کے ساتھ جیل میں تشدد کیا گیا۔ اور پھر جو لوگ بھٹو کی آخری رسومات میں شامل تھے وہ بتاتے ہیں کہ بھٹو کی میت کی وہ کیفیت نہیں تھی جو ایک پھانسی یافتہ کی جسمانی کیفیت ہوتی ہے اور ایک افواہ بھی گردش میں ہے کہ مسٹر بھٹو کو دفناتے وقت قبر میں کچھ ایسے کیمیکلز ڈال دیئے گئے تھے کہ جس سے شہید کی میت گل سڑ جائے اور اہلِ خانہ میت کو نکلوا کر پوسٹ مارٹم نہ کروا لیں۔ بے نظیر بھٹو یہ بیان دے چکی ہیں کہ ہم شہید کی میت لحد سے نکلوا کر میت کو تکلیف پہنچانے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتے اور یہ حقیقت ہے کہ حالات کی تبدیلی سب حقائق کو بے نقاب کر دے گی اور مجرم تاریخ کے کٹہرے میں کھڑے نظر آئیں گے۔ پاکستان کے عوام ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

شہید کو اپنا نجات دہندہ تصور کرتے ہیں۔ بھٹو کا نقصان کسی ایک فرد یا گھرانے کا نقصان نہیں بلکہ مزدوروں، دہقانوں اور محنت کشوں کا نقصان ہے۔ بھٹو پر ان طبقات کا حق ہے جن طبقات کے لیے بھٹو نے پھانسی کے پھندے کو چوما۔ بھٹو کی عالمگیر سیاست جو وہ محکوم اقوام کے لیے کر رہے تھے بھٹو کی شہادت کا سبب بنی۔ بھٹو کی موت شعوری موت ہے۔ بھٹو کی جدوجہد محکوم طبقات کی جدوجہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اونچے طبقے کے لوگ مسٹر بھٹو کے شروع ہی سے دشمن تھے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی جدوجہد کو پی پی پی کے پلیٹ فارم سے منظم کر کے ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا تو جاگیرداروں نے بھٹو پر قاتلانہ حملے کروائے۔ صادق حسین قریشی، جس نے بھٹو پر قاتلانہ حملہ کروایا وہ بھی ایک جاگیردار تھا۔ سانگھڑ میں بھی ایک مراعات یافتہ طبقے کے شخص نے ناکام قاتلانہ حملہ کروایا۔ بھٹو کو کبھی کسی غریب نے چھرا گھونپنے کی کوشش نہ کی بلکہ جب ذوالفقار علی بھٹو موت کی کوٹھڑی میں گئے تو ان کی جان بچانے کے لیے غریب اور محروم طبقے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر میدانِ عمل میں کود پڑے۔ ایسے وقت میں پارٹی کے راہنماؤں میں اعظم بٹ، قیوم نظامی، راؤ عبدالرشید، سردار مظہر علی خان، سردار سلیم، ارشاد راؤ، صفدر ہمدانی، اشتیاق بخاری، قیوم بٹ، ڈاکٹر غلام حسین اور شیخ رشید جیسے ہزاروں کارکن متحرک ہوئے۔ یہ تمام لوگ غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھٹو کو بچانے کے لیے درمیانے اور نچلے طبقے کے راہنماؤں میں جو شدت تھی وہ کسی دوسرے راہنما میں نہ تھی۔

حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے والے تاریخ میں لعنت کی علامت ہیں لیکن سولی پر چڑھنے والے عیسیٰؑ کو کوئی قوت نہ دبا سکی۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ نے انسانیت امن اور انصاف کا پیغام دیا تھا، انسانوں کو اس پیغام ہی میں فلاح نظر آئی اور پھر ایک وقت آیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے نظریات ایک عوامی قوت بن کر جابروں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت عیسیٰؑ کا آخری خطاب ــــــ یروشلم کی بیٹیو!

''اے یروشلم کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ کیونکہ دیکھو وہ دن جلد آنے والے ہیں جب سب کہیں گے مبارک ہیں وہ بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنیں اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہیں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہیں گے ہمیں چھپا لو لیکن کوئی پناہ نہ ہوگی۔''

www.bhutto.org

مائی فرینڈ پیلومودی

جناب ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی میں ایک ایسی کتاب منظرِ عام پر آئی جس میں مسٹر بھٹو کے بچپن اور جوانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی شہرت کی وجہ یہ بنی کہ یہ کتاب یعنی ''مائی فرینڈ زلفی'' کا مصنف مسٹر بھٹو کا بچپن کا دوست ہے، صرف دوست ہی نہیں بلکہ گہرا دوست۔ پیلومودی کی یہ کتاب پاکستان میں کافی مقبول ہوئی اور جس کسی نے بھی مسٹر بھٹو پر لکھا ہے اس نے اس کتاب کا حوالہ ضرور دیا ہے۔ گو میں نے یہ کتاب مسٹر بھٹو کی شہادت کے بعد پڑھی لیکن میں نے کتاب پڑھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ میں شہید بھٹو کے بچپن کے دوست مسٹر پیلومودی سے خود ہندوستان جا کر ملاقات کروں اور ان سے ایک انٹرویو کروں۔ مسٹر پیلومودی سے جو گفتگو ہوئی وہ تحریر کر رہا ہوں۔ مسٹر مودی سے یہ ملاقات جنوری 1983ء میں ہوئی۔ اس گفتگو کو اختصار کے ساتھ پیشکر رہا ہوں۔

23 جنوری 1983ء کو میں جب مسٹر مودی کے دفتر کی تلاش میں نکلا تو بس میں سوار جس شخص سے بھی میں نے پوچھا کہ 2 لودھی اسٹیٹ کدھر ہے اور وہاں میں نے مسٹر پیلومودی سے ملنا ہے تو ہر کسی نے مسکرا کر اور بڑے پیار کے ساتھ مجھے راستہ سمجھایا۔ وہ ملک بھر میں اپنے حسِ مزاح کے سبب مشہور تھے اور وہ ہندوستان کے غیر متنازع سیاستدانوں میں سے ایک تھے۔ بس سے چھلانگ لگا کر سڑک پر اترا تو میرے عین سامنے 2 لودھی اسٹیٹ تھا۔ کوٹھی کے ایک ہاتھ ایک جرنیل صاحب کا گھر تھا اور دوسرے ہاتھ ایک جج صاحب کا۔ مسٹر مودی کے دائیں بائیں جرنیل اور جج کے گھر دیکھ کر مجھے پاکستانی سیاست اور مسٹر بھٹو کا مقدمہ یاد آ گیا۔ سرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی پیلومودی کی سوتنتر پارٹی کا دفتر ہے۔ مجھے پیلومودی کے لمبے تڑنگے سیکرٹری راما کرشنا نے خوش آمدید کہا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ اس کے بعد مسٹر مودی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو مسٹر راما کرشنا نے بتایا کہ مسٹر پیلومودی آج دہلی میں نہیں، آپ کل صبح

www.bhutto.org

9 بجے آجائیں تو ملاقات ہو جائے گی اور اگر آپ کل ملاقات نہ کر سکے تو پھر وہ گجرات چلے جائیں گے جہاں وہ کچھ دن قیام کریں گے۔ کافی کا ایک کپ پینے کے بعد میں واپس ہوٹل چلا آیا۔

24 جنوری کی صبح سویرے میں دہلی کے قیمتی رہائشی علاقے ساؤتھ دہلی کے لیے روانہ ہوا جہاں پر سکندر لودھی کے مقبرے کے قریب ہی مسٹر مودی کا دفتر ہے۔ اس وقت دہلی میں یوم جمہوریہ کی تیاریاں عروج پر تھیں جو کہ 26 جنوری کو منایا جاتا ہے اس دن آزاد ہندوستان کا آئین منظور ہوا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک راما کرشنا سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

9 بجے صبح ایک سفید ٹویوٹا گاڑی آ کر رکی تو راما کرشنا نے بتایا کہ صاحب آ گئے ہیں۔ برآمدے سے باہر نکل کر میں نے مسٹر پیلو مودی کے گاڑی سے اترتے ساتھ ہی ہاتھ ملایا اور ان سے اپنا تعارف کرایا۔ چھوٹے قد کے گول مٹول مسٹر مودی نے کھدر کا پاجامہ کرتا پہن رکھا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔

بیٹھتے ہی انہوں نے کافی لانے کو کہا۔ میں نے بات کا آغاز کیا کہ ایک ہندوستانی اداکار کے علاوہ پاکستان کے عوام میں دو ہندوستانی کافی مشہور ہیں۔ ایک ہندوستانی وزیر اعظم اندرا گاندھی اور دوسرے آپ تو مسٹر مودی نے کہا دونوں کتنی متضاد شخصیتیں ہیں۔

آپ پاکستان میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے بچپن کے دوست کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔

مسٹر مودی نے میرے ایک سوال پر بتایا، ''میری بھٹو کے ساتھ دوستی اس وقت سے تھی جب مسٹر بھٹو نو سال کے تھے۔ جب وہ بمبئی میں آیا تو وہ ایک دم دیہاتی لڑکا تھا۔ اس پر گاؤں کی مکمل چھاپ تھی۔ بڑا ہی شرمیلا تھا، دبلا پتلا، لڑکیوں جیسا، بات بات پر شرما جانے والا، اصل میں پہلے وہ میرے کزن جہانگیر موگا کا دوست بنا اور پھر کچھ عرصے کے بعد ذلفی سے میری آشنائی جہانگیر موگا کی وساطت سے ہی ہوئی۔ بڑے سادہ کپڑے پہنتا تھا دیہاتیوں جیسے۔ کپڑوں کی میچنگ بھی میں نے اسے سکھائی اور نت نئے کپڑوں کا فیشن کرنا بھی میں نے اس کو سکھایا۔ دوستوں کے ساتھ گفتگو اور محفل کے آداب میں نے اسے سکھائے۔ اس طرح سکول میں مَیں اس کے بہت قریب ہو گیا۔ ذلفی میرے اس رویے کی وجہ سے بڑی قدر کرتا تھا۔ اکثر کہتا تھا کہ اگر میرے مذہب میں کسی اور کی پوجا کی گنجائش ہوتی تو میں تجھے ضرور پوجتا۔ اس بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ذلفی میری کتنی قدر کرتا تھا۔ وہ میرے ساتھ بڑا پیار کرتا تھا

اور ہاں وہ جس سے بھی پیار کرتا تھا اس سے انتہا کا پیار کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محمد علی جناح کا طالب علمی کے دور میں بڑا مداح تھا۔ وہ پاکستان کے نام پر جذباتی ہو جایا کرتا تھا، وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ پاکستان ضرور بننا چاہیے، یہ مسلمانوں کی ضرورت ہے۔ ہندو ہمارے اوپر ظلم کریں گے۔ آزادی کے بعد ہندو ہمارا استحصال کریں گے۔ پاکستان کی آزادی کی صورت میں مسلمانوں کو تحفظ فراہم ہو سکتا ہے، وہ ہندو سے سخت نفرت کرتا تھا شدید نفرت، ہندوستان سے نہیں بلکہ ہندو سے۔ وہ ہندو کو مسلمان کا دشمن تصور کرتا تھا۔ اس میں ہندو کے خلاف نفرت انتہا کو تھی۔ گو وہ ایک جذباتی انسان تھا لیکن شروع ہی سے بڑا ذہین تھا۔ قوتِ فیصلہ اس میں بہت زیادہ تھی، جو فیصلہ کر لیتا تھا اس پر اٹل بھی رہتا تھا۔ امریکہ میں ہم دوست اکثر اس کو تنگ کرنے کے لیے کبھی کبھی مذاق کے طور پر محمد علی جناح کی مخالفت کرتے تھے۔ پہلے تو وہ ہمیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن جب ہم تنگ کرنے پر تلے ہوتے اور ہمارے مذاق میں شدت بڑھ جاتی تھی تو پھر وہ خاموشی اختیار کر کے ناراضی کا اظہار کرتا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ خاموش رہتا تھا لیکن کام جو ہم نے باہم تقسیم کیا ہوتا تھا اس میں کبھی کمی نہیں لاتا تھا۔ مثلاً برتن دھونا یا فلیٹ میں جھاڑو دینا وغیرہ۔ اس خاموشی میں بڑی پیاری معصومیت جھلکتی تھی۔ اس کے یہ انداز سب دوستوں کو پسند تھے۔"

باتیں کرتے کرتے یکدم پیلو مودی رکے اور انہوں نے کہا، "چھوڑو یہ سب باتیں، میرا بچپن، میرا دوست مت یاد کراؤ۔" ان کے چہرے پر کرب واضح تھا۔ آنسو کے دو قطرے اس کی دائیں آنکھ سے ٹپکے جو ان کے موٹے موٹے گالوں کو چھوتے ہوئے تھوڑی تک آئے جن کو مسز مودی نے رومال کے ساتھ پونچھ دیا۔ کمرے میں ایک دو منٹ خاموشی چھا گئی، مکمل سکوت۔ میں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا کہ لیکن میں تو یہی باتیں سننے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں جبکہ میری آنکھیں بھی اشکبار ہو چکی تھیں اور میں بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔

اسی دوران مسز مودی نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی جو مسٹر پیلو مودی کی دوائی لے کر آیا۔ پانی کے ساتھ مسٹر مودی نے کیپسول اور گولیوں کو نگلا۔ اس کے بعد مودی نے پوچھا، "کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا پڑھتا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے اگلا سوال کیا کہ پڑھ کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ میں نے کہا سیاست، تو پیلو مودی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور انہوں نے کہا کہ کیا تم بھی آمریت سے لڑنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ میں نے جواب دیا کیوں نہیں۔ اسی دوران میں نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی جہاں پر نہرو، مہاتما گاندھی سمیت انڈیا کے متعدد راہنماؤں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ میں نے سوچا کہ

مسٹر بھٹو کی تصویر کہیں نہیں لگی۔ ہاں وہ تو پاکستان کا لیڈر تھا اس کی تصویر کوئی ضروری تو نہیں۔ یہ خیال آتے ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچا لیکن وہ پیلو مودی کے دوست تھے اور دوست کی تصویر اپنے کمرے میں اگر ایک ہندوستانی لیڈر لگا بھی لے تو کوئی حرج نہیں۔ میں نے مسٹر پیلو مودی سے اس بارے میں پوچھا تو مسٹر مودی نے اپنی کرسی کے دائیں طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جہاں کرسی کے ساتھ ہی میز پر مسٹر بھٹو کی ہاتھ کی بنی ہوئی ایک تصویر شیشے کے فریم میں سجی ہوئی تھی۔ مسٹر بھٹو اس تصویر میں ماؤ کیپ پہنے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ میرا ہاتھ لگنے سے تصویر نیچے گر پڑی تو پیلو مودی نے کہا، میرے دوست کو نیچے نہ گراؤ۔ مسٹر مودی نے جلدی سے تصویر کو اٹھا کر میز پر دوبارہ رکھ دیا۔

مسٹر پیلو مودی نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا، ''ذلفی بچپن سے ہی کہا کرتا تھا کہ میں بڑا آدمی بنوں گا۔ اس کو کرکٹ کا بھی شوق تھا اور فلموں میں اداکاری کا بھی شوق تھا فلموں میں اداکاری کا یہ شوق اس کو بمبئی کے قیام کے وقت سے تھا اور اس کے لیے وہ بڑے ارادے بھی رکھتا تھا لیکن جب آزادی کی تحریک اپنے عروج کی طرف بڑھی اور سیاسی ماحول میں شدت آئی تو ذلفی سیاست میں گہری دلچسپی لینے لگا۔ ہم دونوں گھنٹوں بمبئی کے کارمائیکل روڈ پر شام کے وقت بحث مباحثہ کرتے۔ وہ ہمیشہ ہی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ پاکستان کا بننا مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری ہے جبکہ میرے خیالات اس سے یکسر مختلف تھے۔ اس دوران اس کی سیاست میں شدت کے ساتھ دلچسپی بڑھی۔ اس کو منصوبے بنانے کا بڑا شوق تھا اور حافظہ بھی اس کا کمال کا تھا۔ جو کتابیں اس کے زیرِ مطالعہ ہوتیں وہ ان پر میرے ساتھ ضرور گفتگو کرتا تھا۔ ذلفی کا زیادہ تر مطالعہ سیاست، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ اور مختلف مذاہب پر ہوتا تھا۔ وہ سوانح عمریاں پڑھنے کا بھی بے حد شوقین تھا۔ لینن کو بھی پسند کرتا تھا۔ میں اس پر اس سے اختلاف بھی کیا کرتا تھا۔ ذلفی کے گھر کا ماحول مذہبی تھا اس لیے میں نے اس کو ہر رمضان میں روزے کے ساتھ دیکھا۔ میں اس کو اکثر کہا کرتا تھا کہ تم یہ کیا دقیانوسی کام کرتے ہو تو وہ خاموش ہو جایا کرتا۔ دراصل اس کی سوچ یہ تھی کہ جس بات کو وہ اپنی سوچ کے خلاف تصور کرتا تھا جو اس کی ذات تک محدود ہو تو وہ اس پر جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کر لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم چند ایک دوست بمبئی کے ایک نہایت پسماندہ علاقے سے گزر رہے تھے جہاں پر غریب محنت کش لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں تو ہمارے ایک دوست نے اس بستی کے گندے ماحول پر ناک چڑھائی کہ گندا ماحول ہے، تو ذلفی اس بات پر گرم ہو گیا، غصے سے اس کے کان سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے کہا کیا یہ لوگ انسان نہیں؟ اور یہ غربت ان کا قصور تو نہیں یہ تو نظام کی

www.bhutto.org

غلطی ہے۔ ذلفی کئی دن تک ہمارے اس دوست سے ناراض رہا۔ شروع ہی سے ذلفی غریب کے نام پر جذباتی ہوجایا کرتا تھا۔

جب امریکہ میں وہ پولیٹیکل سائنس کا طالب علم تھا، اس نے وہاں پر طلبا کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینا شروع کردیا۔ وہ یونیورسٹی کے الیکشن میں کھڑا ہوا اور جیت گیا۔ یونین الیکشن جیتنے والا وہ پہلا ایشیائی طالب علم تھا۔ اسی وقت سے وہ بڑی اچھی تقریر کرنے لگ گیا تھا۔ اس کی تقریر طالب علم بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔ وہ اپنی تقریر میں تاریخ کو بڑا چھیڑا کرتا تھا۔ تقریر میں جذبات کو بھی بڑالایا کرتا تھا۔ وہ ایک ہر دلعزیز طالب علم تھا اس کو دوسروں کے دلوں میں اپنا مقام بنانے کا فن آتا تھا۔ کئی مرتبہ ہم لوگ اس بات پر حسد کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہننے کا اس کو بے حد شوق تھا۔ میری بیوی وینا جس سے میری ملاقات امریکہ ہی میں ہوئی اس کی کئی باتیں ذلفی سے ملتی ہیں لیکن وینا میں دکھلاوے کی عادت نہیں۔ ویسے وینا کو ذلفی بڑا پسند ہے۔

امریکہ میں قیام کے دوران اس کی گفتگو میں کافی پختگی آ گئی تھی، اس کی وجہ اس کا مطالعہ تھا۔ اسی دوران اس کے خیالات میں انقلابی اثرات نمایاں ہونے لگے تھے اور یونیورسٹی کے مباحثوں میں اس کو اپنے خیالات پیش کرنے کے مواقع میسر آتے رہتے تھے جس سے اس کے انداز بیان کی صلاحیت میں بڑی نمایاں تعمیر ہوئی۔ حقیقت میں وہ میرے ساتھ بڑا مخلصانہ رویہ رکھتا تھا۔ دیگر لوگوں سے علیحدگی میں وہ میری بے حد تعریف کیا کرتا تھا۔ یقیناً وہ میری دلی طور پر عزت کرتا تھا۔

جب ذلفی ایوب حکومت میں آیا اور اس نے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور مجھے وہ ذلفی یاد آنے لگا جو بچپن سے ہی ایک نامور انسان بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ جب اس نے ایوب حکومت سے ناراض ہوکر اپنی جماعت بنائی اور اس کا ترقی پسندانہ منشور جاری کیا تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ نظریات و خیالات جن کا اظہار ذلفی دوران تعلیم کرتا تھا، ان کی تکمیل کے لیے ذلفی نے اپنی جماعت کے منشور کو اپنے نظریات سے مزین کیا ہے۔

ذلفی کو شروع سے ہی بین الاقوامی تعلقات میں بے حد دلچسپی تھی اور یہ اس کا مضمون بھی رہا ہے لہٰذا جب وہ وزیر خارجہ کی حیثیت سے ایوب حکومت میں کام کرنے لگا تو اس نے ہر لمحہ یہ کوشش کی اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ امور خارجہ میں بڑی مہارت رکھتا ہے اور پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کے لیے خارجہ تعلقات کو بڑے مؤثر طریقے سے کامیابی کی طرف لے گیا۔ ذلفی نے وزارت خارجہ کا

قلمدان سنبھالنے کے بعد پاکستان کے لیے بہترین دوست تلاش کر لیے تھے۔ چین کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کرنے کے بعد تو بڑا خوش تھا اور وہ ہندوستان کو یہ تعلقات دکھا کر نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کا یہی جذبہ ہندوستان کے خلاف جنگ کے دوران ابھرا۔ اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہم نے علاقے میں ایک بڑے ملک کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کر لیے ہیں جس کے ساتھ ہندوستان تعلقات بہتر بنانے میں ناکام رہا ہے اور اس طرح پاکستان کو یقیناً علاقے میں مضبوط دوست ملنے کے سبب نیا حوصلہ ملا۔ ذلفی کو چین کے ساتھ دوستی پر غرور بھی بڑا تھا۔ دراصل اس میں ایک جنون تھا ہندوستان کو نیچا دکھانے کا۔ میں نے کہا ناں کہ وہ بچپن سے ہی ہندو سے نفرت کا اظہار کرتا تھا اور پھر اس کو یہ بھی بڑا ناز تھا کہ میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ اس کی یہ ہمیشہ خواہش رہی کہ میں اپنا مقام بناؤں۔ اس کے لیے وہ اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگانے پر رضامند ہو جاتا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ جب پاکستان نے جنگ کی تو اس وقت بڑا جذباتی ہو گیا تھا۔" میں نے پیلو مودی سے کہا کہ پاکستان نے ہندوستان کے ساتھ جنگ نہیں کی تھی بلکہ ہندوستان نے پاکستان کے خلاف جارحیت کی تو مسٹر مودی نے کہا: "جنگ تو بہر حال ہوئی تھی اور پھر کشمیر میں تو پاکستان کی طرف سے گوریلے بھیجے گئے تھے اور ذلفی ایوب خان کو اس بات پر آمادہ کرنے میں پیش پیش تھا کہ ایک جھٹکا لگایا جائے تو ہندوستان کی کمر توڑی جا سکتی ہے۔ ذلفی کشمیریوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے کشمیر کی حمایت کر کے ہندوستان کے اندر بھی اپنے حمایتی پیدا کر لیے تھے۔ دراصل ذلفی اپنے آپ کو پاکستان سے باہر بھی مقبول بنانے کے گُر جانتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی صلاحیتوں سے ایوب خان پر اپنا رعب جما لیا تھا اور اس نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پاکستان کو عالمی سطح پر ایک مقام بھی دلایا تھا۔

جب اس نے اقتدار سنبھالا تو اس نے اپنی یہ کوششیں تیز تر کر دیں اور اس نے مذہب کے ناتے مسلمان ممالک کو اکٹھا اور غریب کے ناتے تیسری دنیا کے ممالک کو اپنی قیادت میں چلانا چاہا جس میں اس کو کامیابی بھی ہوئی اور وہ تیسری دنیا کا مقبول راہنما بنا۔ ذلفی یقیناً اپنے آپ کو تیسری دنیا میں نہرو کے مقابلے میں لا کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا تو مجھے وہ ذلفی بڑا یاد آتا تھا جو نہایت شرمیلا اور لڑکیوں جیسا تھا، جو بچپن میں میرا دوست بنا لیکن بڑے ارادے اس وقت بھی اس کے دل میں مچلتے تھے۔ وہ اپنے ارادوں کو دل میں چھپائے رکھنے کا فن بھی خوب جانتا تھا، شملہ معاہدے کے وقت مجھے اس کی چابکدستی نے حیران کر دیا۔ وہ ایک کامیاب ڈپلومیٹ ثابت ہوا۔ اندرا حکومت کے نہ چاہتے

www.bhutto.org

ہوئے بھی میں نے بڑی کوشش کے بعد کہا کہ ذلفی کے ساتھ مذاکرات کے لیے میری خدمات لی جائیں۔ دراصل اندرا گاندھی نہیں چاہتی تھی کہ میں آگے آؤں اور میری یہ خواہش تھی کہ میں امن کے لیے کچھ کر پاؤں۔ ہندو پاک کا یہ معاہدۂ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں اس معاہدے کو اس حد تک دیکھتا ہوں کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین اچھے تعلقات قائم کرنے کی پہلی کامیاب عملی کوشش ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کو اس سے کہیں آگے بڑھنا چاہیے اور اپنے تعلقات کو کامیاب اور اچھے پڑوسیوں کی طرح بنانا چاہیے۔ شملہ معاہدۂ سے پہلے اندرا سرکار کو بھٹو کے بارے میں کافی غلط فہمیاں تھیں۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ بھٹو ایک اکھڑ مزاج شخص ہے جبکہ میری یہ کوشش تھی چونکہ بھٹو کو بہت پرانا جانتا ہوں لہٰذا ذلفی کو سمجھنے کے لیے میں کافی کارآمد ثابت ہوسکتا ہوں اور پھر جب شملہ معاہدۂ جو ایک وقت میں نہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا ہوا تو لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ بھٹو سے بہتر کوئی شخص نہیں جو امن کے ساتھ رہنے کا خواہش مند ہو۔ میری شروع ہی سے یہ سوچ تھی کہ پاک و ہند تعلقات کے لیے یہ نہایت مناسب وقت ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

میں اب ایک بات کہتا ہوں کہ دونوں ملکوں (پاکستان و ہندوستان) کو چاہیے کہ وہ اپنے اختلافات کو بھلا دیں اور بہتر دوست اور بھائیوں کی طرح رہیں، اپنے اپنے عوام کو خوشحال بنائیں۔" میں نے مسٹر مودی کی اس بات پر کہ اپنے اختلافات "بھلا" دیں، کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ اختلافات بھلائے نہیں جاسکتے بلکہ اختلافات مٹانے ہوں گے تو پیلو مودی نے کہا، "مٹانے اور بھلانے میں کیا فرق ہے؟" میرا مؤقف تھا کہ کشمیر جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اختلافات کا بنیادی سبب ہے اس کا حل انصاف پر مبنی اصولوں پر کیا جانا چاہیے، کشمیریوں کو حق خود ارادیت دیا جائے کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا وہ کس طرح اپنا مستقبل گزارنا چاہتے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ بھلایا نہیں جاسکتا، بلکہ اس کو حل کیا جانا چاہیے۔ مسٹر پیلو مودی کا مؤقف یہ تھا کہ جو کشمیر ہندوستان کے پاس ہے وہ کشمیر ہندوستان کا ہو جانا چاہیے اور کشمیر کا جو حصہ پاکستان کے پاس ہے وہ پاکستان کا حصہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ ہی میری نظر میں ایک حل ہے۔ دراصل دونوں ملکوں کے حکمران اس مسئلے سے سیاسی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اپنے اپنے عوام کو بے وقوف بناتے ہیں، ایک دوسرے سے ڈراتے ہیں اپنے عوام پر حکمرانی کرنے کے لیے یہ کشمیر کے مسئلے کو التوا میں رکھنا چاہتے ہیں۔ کشمیر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی کمزوری ہے۔ یہ دونوں ہی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں نے مسٹر مودی کے اس مؤقف پر کہا کہ یعنی ہم دونوں ملک سامراجی کردار ادا کرتے ہوئے

www.bhutto.org

کشمیر کے عوام کی قسمت وتقدیر کا فیصلہ اپنے قلم سے کریں نہ کہ کشمیری عوام کی خواہشات اور جذبات کے مطابق کسی فیصلہ پر پہنچا جائے یہ تو مکمل طور پر غلط سوچ ہے۔ کشمیریوں کا یواین کے چارٹر کے مطابق بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھوں سے کریں۔ ہم کون ہوتے ہیں ان کو قربان کر کے اپنے مفادات کو تحفظ دیں؟ پیلو مودی نے کہا، "میں نہیں مانتا۔ یہ بات دونوں (مقبوضہ و آزاد کشمیر) کے عوام یقیناً اس پوزیشن کو قبول کر لیں گے کہ ہم مستقل طور پر ہندوستان و پاکستان کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کر لیں۔ جنگ ان کو کچھ نہیں دے سکی۔ جنگ سے کچھ حاصل نہیں۔ جب دونوں (بھارت اور پاکستان) اپنے اختلافات دور کر لیں گے تو یقیناً دفاع کے بجٹ میں کمی واقع ہوگی۔ دونوں ممالک اپنے عوام کی ترقی وتعمیر کے لیے بڑے بڑے منصوبے تشکیل دیں گے، دونوں طرف آمدروفت کی آزادی ہوگی، تجارت کی آزادی ہوگی۔ ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے، بڑی طاقتوں کا ہم پر اثر کم ہوگا، ہم اپنا سرمایہ ٹینک، توپ، بم اور بارود پر ضائع نہیں کریں گے تو خوشحالی آئے گی جس سے دونوں ممالک کے عوام یقیناً ایک دوسرے کے متعلق اچھے خیالات اپنے ذہنوں میں لائیں گے، آپس کی کدورتیں دور ہوں گی، کشمیر کے لوگ بھی اس ترقی وخوشحالی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ پھر تو یہ مسئلہ رہے گا ہی نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان سرحدوں کی کوئی ضرورت نہیں، ان سرحدوں میں سیندور بھر دینا چاہیے۔"

مسٹر مودی کے ان خیالات پر میں نے یہ تبصرہ کیا کہ آپ جب سرحدوں کا خاتمہ چاہتے ہیں تو اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا اکھنڈ بھارت چاہتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا، "ضروری نہیں اکھنڈ بھارت۔ پاکستان ایک علیحدہ ملک کی حیثیت سے بھی ہمارے ساتھ اس قسم کے تعلقات استوار کر سکتا ہے۔ یورپی ممالک نے کیا ایک دوسرے ملک کے شہریوں کو یہ سب سہولتیں فراہم نہیں کیں۔ اچھے اور ہمسائے ملک کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اپنے وجود کو ختم کر دے۔ ہمارے نیپال اور بھوٹان کے ساتھ بھی تو مثالی تعلقات ہیں۔ بہتر تعلقات قائم کرنے میں پاکستان کا رویہ مایوس کن ہے بلکہ دونوں ملک ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ آج ہمیں آزادی ملے چھتیس سال بیت چکے ہیں۔ ہم دن بدن ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ جنگ کا خوف ہم پر مسلط ہے۔ آخر ہمیں کیا ملا ہے جنگ کر کے؟ کچھ بھی تو حاصل نہیں ہوا۔" میں نے مسٹر مودی سے اس بات پر کہا کہ آپ کو تو ایک جنگ میں کافی کچھ ملا ہے آپ نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کی مالی، سیاسی اور فوجی مدد کر کے پاکستان کو توڑا۔ بنگلہ دیش ہندوستان کی مداخلت کے بغیر ناممکن تھا اور آپ نے اس طرح دوقومی نظریے کو غلط ثابت

کرنے کی کوشش کی اور آپ نے اردگرد کے چھوٹے ممالک کو اپنا دست نگر بنانے کا سوچا ہوا ہے تا کہ ہندوستان کی اس خطے میں ہر لحاظ سے بالا دستی رہے۔ مسٹر مودی کہنے لگے: "یہ بنگالی عوام کا مطالبہ تھا، یہ ان کی جدوجہد تھی۔ ہمارے ملک میں بھی کئی علیحدگی پسند تحریکیں ہیں لیکن ہمارا جمہوری نظام علیحدگی کی تحریکوں کو اپنی موت آپ مرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہر جگہ علیحدگی کی تحریکیں ہیں سپین، کینیڈا، آئر لینڈ، ترکی، اٹلی، سری لنکا حتیٰ کہ امریکہ میں بھی۔ اس میں آپ کے نظام کی بھی خامی تھی۔ کسی ملک کی یکجہتی کی وجہ وہاں کا سیاسی نظام ہوتا ہے۔ بے شک ہر جگہ علیحدگی پسندوں کو بیرونی امداد میسر ہوتی ہے لیکن اس کا تمام تر ذمہ دار بیرونی قوت کو بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ آج ہم پنجاب کے بحران سے گزر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن ہم اس بحران پر قابو پالیں گے۔ پنجاب میں علیحدگی پسندوں کو بھی بیرونی امداد حاصل ہے۔ اسلحہ، روپیہ اور کئی طرح سے پنجاب کے علیحدگی پسندوں کو دوسرے ملک مدد دے رہے ہیں۔

یہ میرا ایمان ہے کہ آج اگر پاکستان و ہندوستان کے حکمران سچے دل سے دوستی کے لیے بڑھیں گے، پختہ ایمان کے ساتھ خلوصِ نیت کے ساتھ تو وہ اپنے مسائل حل کرنے میں یقیناً کامیاب ہوں گے اور اگر آج ایسا نہیں ہوتا تو اگلی نسل یہ کام کرنے میں یقیناً کامیاب ہوگی، وہ نسل جس نے آزادی کے وقت اپنی آنکھوں سے خون، قتل و غارت کو دیکھا، آج ریٹائرڈ ہو رہی ہے۔ دنیا میں انسان ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے کوشاں ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ ان دونوں ملکوں کے لوگ بھی ایک دوسرے کے قریب آنے کا یہ سوچ رہے ہوں گے۔ نئی نسل جواب پروان چڑھ رہی ہے، وہ یقیناً ایسا کرے گی، اپنی کدورتیں مٹائے گی، برِصغیر کے ان دونوں ممالک میں رہنے والے لوگوں میں بے انتہا قدریں مشترک ہیں، زبان، رنگ، نسل، تاریخ، ثقافت۔ ہم ان کو قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بے شک آپ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہماری تہذیب مختلف ہے، ہمارا کلچر مختلف ہے اور ہمارا رہن سہن مختلف ہے۔ کیا ہندوستان کے اندر رہنے والے پندرہ کروڑ مسلمان یہ سب کچھ بھلا چکے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ آخر مسلمان ایک ہزار سال سے بھی تو یہاں پر رہتے چلے آئے ہیں۔ آج مختلف سماجی نظام رکھنے والے ممالک بھی ایک دوسرے کے قریب آ چکے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے عوام بھی ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں جیسے رہنے کے لیے نہ سوچیں۔ امریکہ چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر چکا ہے، روس ہمارے ساتھ بڑے بڑے معاہدے اور دوستی کر سکتا ہے تو پاکستان اور ہندوستان بھی خلوصِ دل سے بہتر دوست بلکہ ہم بھائی ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں ایک دفعہ پھر یہ بات دہراؤں گا کہ پاکستان اپنا قومی تشخص اور ہندوستان اپنا

www.bhutto.org

قومی تشخص برقرار رکھتے ہوئے بھی یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اس سے قطعاً یہ تاثر نہ لیا جائے کہ میں اکھنڈ بھارت کی بات کر رہا ہوں۔ یہ "اکھنڈ بھارت" ایک مذہبی سوچ ہے، یہ برہمن کی سوچ ہے۔ میں اس کو اتنی اہمیت دیتا ہی نہیں۔ یہ برہمن مذہبی طور پر عبادت سمجھتا ہے کہ بھارت ماتا کو کسی طرح بھی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ نہرو اور دیگر کانگریسی لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستان بنا۔ اگر نہرو سمیت چند ایک لیڈر ہٹ دھرمی اور سخت رویہ اختیار نہ کرتے تو شاید جناح پاکستان بنانے کا سوچتے تک نہ۔ لیکن اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستان و پاکستان بھائیوں کی طرح رہیں۔ یہ دونوں طرف کے لوگوں کی جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی ضرورت ہے۔"

میرا ایک سوال یہ تھا کہ کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو معزول نہ کیا جاتا اور وہ پاکستان کے منتخب وزیرِ اعظم کی حیثیت سے مزید پانچ سال کام کرتے تو اس وقت ہندوستان کے ساتھ تعلقات کو اور زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کرتے جبکہ وہ پاکستان کو ایک ایٹمی قوت بنانے کے لیے بھی سرگرمِ عمل تھے؟ پیلو مودی نے برملا کہا، "یقیناً بھٹو پاکستان کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے والا وہ پہلا حکمران تھا جس نے زبانی جمع خرچ ہی نہ کیا بلکہ اس نے دوستی کے لیے شملہ میں راہیں متعین کر دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذلفی ان تعلقات کو بہتر بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا اگرچہ وہ اپنے ملک کو دفاعی طور پر پہلے حکمرانوں سے کہیں زیادہ مضبوط بنانے میں لگا ہوا تھا، لیکن اس میں ہر کسی سے اچھے تعلقات بنانے کی صلاحیت موجود تھی۔ بھٹو حکومت کی خارجہ پالیسی واقعی متوازن خارجہ پالیسی تھی۔ اس نے سرمایہ دار اور ترقی پسند ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔ وہ بھارت کے ساتھ بھی اچھے تعلقات قائم کر سکتا تھا کیونکہ اس میں اعتماد تھا۔ وہ ایک منتخب راہنما تھا۔ اس کے پیچھے عوامی طاقت تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے فیصلوں کو عوام میں قابلِ قبول بھی بنا سکتا تھا اور اس نے ایسا کیا۔ "بنگلہ دیش نامنظور" کا نعرہ اپوزیشن نے بھرپور طریقے سے لگایا۔ لیکن بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا اور عوام نے اس فیصلے کو قبول کیا۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کیے جانے سے قبل سیاسی جماعتیں اس مسئلے کو اٹھا رہی تھیں لیکن جب مسٹر بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو عوام کی طرف سے ذلفی کے اس فیصلے کے خلاف کوئی قابلِ ذکر ردِعمل نہ ہوا تو ذلفی یقیناً بھارت کے ساتھ بھی اچھے تعلقات قائم کر سکنے کی اہلیت رکھتا تھا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سپر پاور یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ بھٹو ہندوستان کے ساتھ اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق اچھے تعلقات قائم کر لے۔ وہ برِصغیر میں امن و امان نہیں چاہتی بلکہ وہ برِصغیر میں توڑ پھوڑ اور سیاسی بدامنی کی خواہاں ہے تاکہ اس کا اثر و رسوخ قائم ہو۔ اگر اس خطے

www.bhutto.org

کے ممالک اپنے اختلافات حل کر لیتے ہیں تو اس خطے میں خوشحالی آئے گی۔ وہ سپر پاور ہندوستان کو بڑھتا دیکھنا نہیں چاہتی کیونکہ ہندوستان اس وقت دنیا کے پہلے بڑے صنعتی ممالک میں سے ایک ہے۔ دراصل یہ بڑی قوت ان ممالک میں جہاں دنیا کی کثیر آبادی رہتی ہے، یہاں پر سیاسی بے چینی پھیلا کر کمیونزم کا ہوا کھڑا کر کے ان ممالک کے عوام کو کمیونزم کے خلاف اکسانے پر تلی ہے۔ مسز بندرانائیکے، مسز اندرا گاندھی، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو اپنے ممالک کے منتخب مقبول راہنما تھے، جن میں سے تین کو راستے سے ہٹایا جا چکا ہے اور تیسری راہنما (اندرا گاندھی) کے لیے مشکلات اکٹھی کی جارہی ہیں۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ شیخ مجیب کا قتل، مسز بندرانائیکے کی حکومت کا خاتمہ اور بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت اس کے بعد اس کو پھانسی دینا یہ کوئی معمولی واقعات نہیں۔ صرف پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات نہیں قائم کرنے ہوں گے، اس کے لیے جنوبی ایشیا کے سب ملکوں کو اکٹھا ہونا چاہیے۔ تجارت بڑھانی چاہیے۔ آمدرفت کی سہولتیں بڑی سادہ اور آسان کرنی چاہئیں۔ آخر یہ ہم نے ایک دوسرے کو روکنے کے لیے خواہ مخواہ خود رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ یہ رکاوٹیں جو آمدورفت میں حائل ہیں ان کو ہٹانا ہوگا تاکہ ہمارے ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف شبہات ختم کریں تو پھر تعلقات کو بہتر بنانے میں بھی بڑی آسانی ہوگی لیکن مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ مسز گاندھی اور جنرل ضیاء کسی نتیجے تک پہنچنے میں ناکام رہیں گے۔ جنرل ضیاء بھی بڑھ چڑھ کر دوستی کا اعلان کر رہا ہے اور مسز گاندھی بھی لیکن یہ دونوں ایسا نہیں کر پائیں گے۔

ہاں مجھے یاد آیا جب شملہ معاہدہ ہوا تھا اس وقت بھٹو کی بڑی صاحبزادی بھی اس کے ہمراہ تھی بلکہ سارے بچے ہی اس کے ہمراہ تھے۔ ان کا کیا حال ہے؟ بڑی صاحبزادی ذہین ہے میری اس سے گفتگو ہوئی ہے۔ ذلفی اس کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ نہرو بھی اندرا گاندھی کو اسی طرح اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا۔" میں نے پیلو مودی کو بتایا کہ وہ آج کل نظر بند ہیں تو کہنے لگا اس کا نام شاید بے نظیر ہے۔ وہ (بے نظیر) اپنے باپ پر گئی ہے، اس کو بھی باپ کی طرح بین الاقوامی سیاسیات میں گہری دلچسپی ہے۔ جب وہ شملہ آئی تھی تو بڑی کم سن تھی لیکن ذہانت و سیاست میں کمسن نہ تھی۔ پھر پیلو مودی نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دیگر بچوں کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کدھر ہیں۔ اس کے بعد نصرت بھٹو صاحبہ کا معلوم کیا تو میں نے بتایا کہ آج کل وہ علاج کی غرض سے بیرونِ ملک چلی گئی ہیں تو پیلو مودی بتانے لگے کہ "کچھ عرصہ قبل میں پاکستان گیا تو میں نے نصرت بھٹو سے ملنے کی کوشش کی لیکن ملنے نہیں دیا گیا لیکن میں نے نصرت کو اپنے کراچی آنے کی اطلاع اپنی ایک امریکن دوست کی وساطت سے دی تھی۔

www.bhutto.org

جب ذلفی کو پھانسی دی گئی تو میں اخبارات نہیں پڑھا کرتا تھا۔ آخر میں اپنے دوست کی پھانسی کی تیاریوں کو کیوں کر پڑھ سکتا تھا۔ پھانسی دیے جانے کی خبروں کو پڑھنا میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ جس رات ذلفی کو پھانسی ہوئی اس وقت میں الہ آباد میں تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ آج کی رات ذلفی کو پھانسی ہو گی لیکن بڑی حیران کن بات ہے کہ میں اس رات قطعاً سو نہ سکا۔ ساری رات جاگتا رہا اور صبح دہلی آ گیا۔ جب میں ائیر پورٹ سے باہر آ رہا تھا تو ایک ہاکر بلیٹن بیچ رہا تھا: ''بھٹو کو پھانسی دے دی گئی'' تو میرا کلیجہ منہ کو آیا۔ میں نے بلیٹن نہ خریدا۔ آخر کیا ضرورت تھی؟ میں خبر پڑھ بھی نہ سکتا تھا۔ میں سیدھا گھر آ گیا اور دس بارہ روز تک میری طبیعت درست نہ رہی۔ عجیب کیفیت تھی مجھ پر۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔'' جب مسٹر پیلو مودی اپنے دوست ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا تذکرہ کر رہے تھے تو ان کی کیفیت کچھ درست نہ رہی اور انہوں نے ملازم کو بلوا کر پانی لانے کو کہا اور بڑی دیر تک خاموش رہے۔ ان سے گفتگو کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ پیلو مودی نہایت حساس انسان ہیں اور ان کو اپنے دوست بھٹو سے بڑا پیار ہے۔ بھٹو کی پھانسی کا غم بھی بہت ہے، اسی لیے شروع میں مسٹر مودی نے میرے ساتھ بھٹو کے موضوع پر گفتگو کرنے سے گریز کیا۔ مسٹر مودی اپنے بچپن اور بھٹو کو یاد کر کے بڑے پریشان اور دکھی نظر آ رہے تھے اور میرے اصرار پر ہی وہ اس موضوع کی طرف آئے تھے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ میرے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے جس میں پاکستان کی سیاست کے بارے میں بھی مجھ سے پوچھتے رہے۔ پھر میں نے کہا کہ آپ نے ابھی بتایا ہے کہ میں پاکستان جاتا رہتا ہوں اور اب آپ کا کب پاکستان آنے کا ارادہ ہے تو مسٹر مودی ایک دم مسکرائے اور بولے کیا تم مجھے لینے آؤ گے؟ آپ کے پنجاب کے گورنر غلام جیلانی میرے دوستوں میں سے ہیں، مجھے تو وہ لینے آتے ہیں کیا تم بھی مجھے لینے آؤ گے؟

اس کے بعد میں نے تصویریں بنانے کو کہا تو مسٹر مودی نے اپنے ملازم کو دوبارہ آواز دی تو وہ ہماری تصویر بنانے لگا مسٹر مودی پوچھنے لگے کیا اس میں رنگین فلم ہے؟ میں نے بتایا کہ اس میں رنگین فلم ہی ہے اور اس پر رنگین شخص کی تصویریں اتاری جا رہی ہیں تو کھلکھلا کر ہنس پڑے اور جب میں ان کے ساتھ تصویر اتروا رہا تھا وہ مجھ سے کہنے لگے کہ ذرا زور سے ہنسو، اچھی تصویر آئے گی۔ فوٹوگرافی کے بعد میں نے مسٹر مودی سے اجازت چاہی اور جب مسٹر مودی سے مل کر واپس برآمدے میں آیا تو مسٹر مودی کا سیکرٹری راما کرشنا کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ''A Nice Meeting''۔

www.bhutto.org

27 جنوری کی شام کو میں بمبئی جانے کے لیے دلی سٹیشن جارہا تھا۔ شام کے اخباروں میں یہ خبر اس سرخی سے لگی کہ "پیلو مودی کا دیہانت ہوگیا۔" پیلو مودی کے انتقال کی خبر ان الفاظ کے ساتھ لگائی گئی کہ "پارلیمنٹ کا مزاح اور سابق وزیرِ اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا بچپن کا دوست موت کا شکار ہوگیا۔ انڈین پارلیمنٹ کی پیار و مزاح بھری بحثوں کا ایک باب ختم ہوگیا۔"

جب اخبار میں مَیں نے مسٹر مودی کے انتقال کی خبر پڑھی تو مجھے وہ لمحے یاد آنے لگے جب مسٹر پیلو مودی مسٹر بھٹو کے نام پر آبدیدہ ہوگئے تھے اور انہوں نے موت سے دو دن پیشتر اپنے دوست ذوالفقار علی بھٹو کے غم کو یاد کیا تھا اور اس کی موت پر اپنا ردِعمل بتایا تھا لیکن آج وہ شخص خود موت کی آغوش میں جا چکا تھا۔ میرے دل میں یہ بات آج تک ہے اور مرتے دم تک رہے گی کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دوست (پیلو مودی) شاید اپنے دوست کی یادوں کو برداشت نہ کر پائے کہ وہ دل کے مریض تھے لیکن موت کا تو ایک وقت معین ہوتا ہے، وہ وقت کسی کے لانے سے آتا نہیں۔ یہ فیصلہ تو اللہ کی ذات ہی کرتی ہے لیکن مسٹر مودی کے بارے میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ "مائی فرینڈ پیلو مودی" پیار کرنے والا انسان تھا، ایک غیر متنازع شخصیت کا مالک۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کا تاریخی حق

محمد حنیف رامے صاحب کا ایک مضمون جو 5 جنوری 2002ء کو روزنامہ ''جنگ'' میں بعنوان ''ذوالفقار علی بھٹو کا حق ادا کیے بغیر تاریخ ہمیں راستہ نہیں دے گی'' شائع ہوا۔ اس پر ملک کے سیاسی، دانشور، حکومتی، عوامی، صحافتی اور فوجی حلقوں کو سنجیدگی سے بحث کا آغاز کرنا چاہیے۔ اس بحث کا تعلق کسی ایک شخص کی ذات اور سیاست سے نہیں بلکہ یہ پاکستانی تاریخ کا اہم باب ہے۔ جب تک قومیں اپنے ماضی کے کیے گئے اقدامات پر بحث اور احتساب نہیں کرتیں تب تک آپ مستقبل کے فیصلے کرنے کے لیے درحقیقت اندھیروں میں ہی سفر کرتے کرتے منزل پائے بغیر بھٹک جاتے ہیں۔ حنیف رامے صاحب کے سیاسی حالات سے میں بخوبی آگاہ ہوں۔ اُن کا سیاسی فلسفہ جماعتوں سے بالاتر ہے۔ وہ واقعی ایک Indigenous سیاسی راہنما ہیں۔ انہوں نے درمیانے طبقے میں جنم لیا اور آج بھی اسی طبقے میں ہیں۔ وہ پاکستان کی دھرتی وادیٔ سندھ کی Dynamics پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سیاست کی منزلیں اور دنیا بھر میں علمی اور فن کے میدان میں جوہر دکھانے کے بعد بھی وہ قوم کے سپوت ہیں۔ ان کے تاریخی علم میں ایک تجربہ اور مشاہدہ بھی شامل ہے۔ وہ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے ان ساتھیوں میں شامل ہیں جنہوں نے مسٹر بھٹو کے ساتھ مل کر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور پھر پاکستان میں پہلی منتخب حکومت بنانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ مسٹر رامے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے ہی قائد ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں سیاسی اختلافات کے سبب پابندِ سلاسل کر دیے گئے۔ یہ ان کے پارٹی کے بنیادی منشور سے کمٹمنٹ کا اظہار ہے۔ انہوں نے 16 ماہ کی کال کوٹھڑیوں میں جو زخم اٹھائے ہوں گے وہ کبھی نہیں مٹ سکتے مگر انہوں نے تاریخی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اپنے متذکرہ مضمون میں جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پاکستان اور عوام کے لیے ایک شاندار مستقبل کے متمنی ہیں۔ وہ مسٹر ذوالفقار علی

بھٹو کی 4 اپریل 1979ء میں پھانسی پر لٹکائے جانے کے بعد رات کی تاریکی میں لاڑکانے میں دفنانے کو سیاسی حوالے سے پاکستان کی تاریخ میں رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ جناب رائے صاحب نے اپنے مضمون میں اس حوالے سے جو سیاسی تجزیہ پیش کیا ہے، وہ بالکل درست ہے اور ان کے بقول "جناب ذوالفقار علی بھٹو کی میت پاکستان کے سیاسی میدان میں بے گور و کفن پڑی ہے" جو کہ سیاسی تاریخ کے پس منظر میں بالکل درست تعبیر ہے۔

مسٹر بھٹو کی ذات میں کئی ایک ایسی خامیاں ہوں گی جن پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ ان خامیوں پر شاید مسٹر بھٹو کے مخالفین کی نظر کے بجائے خود ان کے حامیوں کی نظریں زیادہ گہری ہوسکتی ہیں مگر اہم بات یہ ہے کہ مسٹر بھٹو نے پاکستان کی سیاست میں جو بنیادی فیصلے اور اقدامات کیے، وہ آج تاریخ کے دھارے میں زیادہ شدت کے ساتھ نکھر کر سامنے آئے ہیں۔ مسٹر بھٹو کے مخالفین نے جو ان کے سیاسی اقدامات پر مخالفت کی تھی، ان کا مؤقف (مخالفین کا) تاریخ کے دھارے نے غلط ثابت کر دیا۔ میری دلیل محترم رائے صاحب کے مؤقف سے مختلف اور اگلا ایک اور قدم ہے۔ جناب رائے صاحب نے یہ تجویز پیش کی ہے بھٹو صاحب نے فلاں فلاں کارنامے سرانجام دیے لہٰذا ان کو تمام لوگ محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کے بعد سیاسی قیادت کے طور پر تسلیم کرلیں۔ میری دلیل یہ ہے کہ مسٹر بھٹو نے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جو Contributions کی ہیں اور اس وقت کے بھٹو مخالف سیاست دانوں، دانشوروں اور فوجی افسر شاہی نے کوئی قدر نہ کی مگر آج مسٹر بھٹو کے ان سیاسی اقدامات و پالیسیوں کے سبب اور تاریخ کے پہیے نے مسٹر بھٹو کی "سیاسی ذات" کو عوامی سطح پر غیر متنازع مقام میں داخل کر دیا ہے۔ اگر سب جماعتیں اور دانشور مل کر بھی ان کو باقاعدہ رسمی طور پر لیاقت علی خان کے بعد سیاسی قیادت مان لیں تو میرے نزدیک اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں، نہ ہی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ حالات نے مسٹر بھٹو کو ایک عظیم شخصیت ثابت کر دیا ہے تو اب فلاں فلاں سیاسی وارث ان کے نام کی دکان پر "سیاسی مال" بیچنے کا حقدار ٹھہرا دیا جائے۔ جب تاریخ اپنے فیصلے کرتی ہے تو ایسے راہنما جماعتوں اور سیاسی قیادتوں یا وارثینِ سیاست سے بہت بلند ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا میرا مؤقف ہے کہ سیاسی پس منظر اور آج کی سیاسی صورتحال میں، جناب ذوالفقار علی بھٹو تمام حلقوں میں ایک غیر متنازع شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں اور اس کے لیے پاکستان کے سیاسی قائدین کے کسی رسمی اظہار کی بجائے کچھ دوسرے اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس کے

www.bhutto.org

لیے ہمارے سامنے پچھلی دہائی کے دو واقعات بڑی اہم زندہ مثالیں ہے اس کے لیے اہم قدم پاکستان کی ریاست اور پاکستان کی مسلح افواج کو اٹھانا ہوں گے۔

چلی میں چار ستمبر 1970ء کو انتخابات میں دو سیاسی قوتیں میدان میں تھیں۔ دائیں بازو کی کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی جس کی قیادت Eduardo Frei Montalva کر رہے تھے اور دوسری سیاسی قوت چلی کے تمام سوشلسٹوں کے متحدہ محاذ، United Popular Movement کے مسٹر سلواڈور الاندے کر رہے تھے۔ امریکی حکومت اور سی آئی اے الاندے کو الیکشن میں شکست دینے کے لیے شدت کے ساتھ برسر پیکار تھے۔ اس کے لیے سی آئی اے نے باقاعدہ چالیس لاکھ ڈالر کا فنڈ بھی مختص کیا مگر الاندے الیکشن جیت گئے۔ جس پر امریکی صدر نے یوں کہا کہ "چلی میں سوشلسٹوں کی کامیابی کے بعد کیوبا میں سوشلسٹ حکومت کے سبب اب لاطینی امریکہ سرخ سینڈوچ بن گیا ہے۔ لہٰذا الاندے کے اقتدار میں آنے کے بعد چلی، امریکہ اور سی آئی اے کی سازشوں کا نشانہ بننا شروع ہو گیا اور پھر 11 ستمبر 1973ء کو سی آئی اے نے چلی کے اندر ایک ردِ انقلاب سازش کے تحت الاندے کی حکومت کا تختہ الٹ کر فوجی جرنیل آگسٹو پنوشیٹ (آج مغربی میڈیا اسی پنوشیٹ کے ظلم کی داستانیں دکھاتے تھکتا نہیں ہے کہ کس طرح اس نے سیاسی مخالفین کو کچلا) کو اقتدار پر مسلط کر دیا اور یوں جنرل پنوشیٹ 1990ء تک اقتدار پر قابض رہا اور الاندے چلی کی سیاست میں ممنوع قرار دے دیئے گئے۔ جب پنوشیٹ نے فوجی آمریت مسلط کی تو چلی کے منتخب راہنما الاندے کو قتل کر کے فوری دفن کر دیا گیا۔ فوج کے ہاتھوں مسٹر الاندے کے قتل پر اس وقت کے وزیرِ اعظم پاکستان مسٹر بھٹو نے بیان دیا:

"اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ الاندے کو قتل کر کے اس نے چلی میں انصاف کا مطالبہ ختم کر دیا ہے اور وقت کی سوئیاں مخالف سمت میں چلیں گی تو اسے غلط فہمی ہے۔ ایسے سانحے تو عوام کی جدوجہد کو آگے بڑھاتے ہیں۔"

ترکی میں مئی 1960ء میں عدنان میندرس کی حکومت کو ترک فوج نے طاقت کے ذریعے ختم کر کے جنرل جمال گرسل نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر وزیرِ اعظم عدنان میندرس کے خلاف استنبول کے قریب ایک جزیرے Yasi Ada میں ساتھیوں سمیت مقدمہ چلایا گیا۔ طویل مقدمے کے بعد مسٹر عدنان میندرس کو 17 ستمبر 1960ء کو سزائے موت دے دی گئی۔ سزا پر عمل درآمد سے پہلے پاکستان کی طرف سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، جناب عدنان میندرس کے لیے رحم کی اپیل لے کر انقرہ گئے تو ترکی کے فوجی حکمران جنرل جمال گرسل نے مسٹر بھٹو سے ملاقات میں کہا کہ "ترکی، عدنان میندرس کے سبب لاتعداد

www.bhutto.org

مسائل کا شکار ہوا ہے۔" اس پر مسٹر بھٹو کا استدلال تھا:

"مینڈرس کی پھانسی سے ترکی کے سیاسی مسائل حل نہیں ہوں گے بلکہ مزید بڑھیں گے۔"

ترکی میں پہلا مارشل لاء مئی 1960ء میں لگا اور مارشل لاء کے دوران فوجی حکومت نے عدنان مینڈرس کو پھانسی دی۔ اس کے بعد دو اور مارشل لاء بھی لگے۔ تیسرے مارشل لاء کے بعد جب 1983ء میں جمہوریت بحال ہوئی تو تب تک عدنان مینڈرس کے فیصلے پر دانشور اور تمام سیاسی حلقوں میں اعتراض کیا جاتا رہا اور مینڈرس کی پھانسی ترکی کی سیاست کا اہم موضوع بنی رہی کہ عدنان مینڈرس کی پھانسی ترکی کی سیاسی تاریخ کا تاریک باب ہے اور ان کی میت ترکی کے سیاسی عمل کی تاریخ میں ایک رکاوٹ ہے۔ یہ بحث بڑھتی چلی گئی اور یوں 11 اپریل 1990ء کو گرینڈ نیشنل ٹرکش اسمبلی کے اندر تمام جماعتوں نے ایک قرارداد پاس کی کہ مسٹر مینڈرس کی پھانسی ایک غلط قدم تھا اور ان کو تمام سرکاری اعزازات کے ساتھ دفن کیا جائے اور پھر ٹھیک 30 سال بعد 17 ستمبر 1990ء کو عدنان مینڈرس کی میت کو سرکاری اور فوجی اعزازات کے ساتھ تمام رسومات ادا کرتے ہوئے تینوں مسلح افواج کے سربراہوں نے مرحوم مینڈرس کے تابوت کو کندھا دیا اور ان کو استنبول میں ایک خوبصورت مزار تعمیر کر کے اس میں دفنا دیا گیا۔

اس واقعہ پر صدر جمہوریہ ترکیہ جناب ترگت اوزال نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "27 مئی 1960ء کے جنرل جمال گرسل کے مارشل لاء کے نفاذ کے دن سے فوجی بغاوت نے تاریخ دانوں کے لیے ایک بحث کا آغاز کر دیا تھا لیکن اب ترکی کے تینوں قابلِ احترام راہنماؤں، مینڈرس اور ان کے دو ساتھی وزیروں کی سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین کے بعد ہمیں اس منحوس دن کو بھول جانا چاہیے، جس روز ان تینوں راہنماؤں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔"

اسی طرح جب 1990ء میں چلی کے عوام نے جمہوری جدوجہد کے ذریعے فوجی حکمران جنرل پنوشیٹ کی حکومت الٹ کر جمہوریت بحال کی تو چلی کے عوام نے اپنے مقبول راہنما سلواڈور الاندے کی میت کو فوج کے ہاتھوں دفن شدہ قبر سے نکال کر ان کی میت کو سرکاری اور قومی اعزاز کے ساتھ دفنایا۔ اس طرح چلی کے عوام اور فوج نے تاریخ کا قرض اتارا اور سیاسی میدان میں پڑی میت کو اس کا تاریخی اعزاز دینے کا اظہار کر ڈالا۔

آج پاکستان کی مسلح افواج کے سربراہ اور صدرِ پاکستان پرویز مشرف افغانستان کے حوالے سے 11 ستمبر 2001ء کے بعد یک دم یہ اعلان کرتے ہیں کہ "پہلے پاکستان۔" اس طرح درحقیقت ہم اپنے

ماضی کی تاریخی غلطیوں کا ازالہ کرنے کا اظہار کر رہے ہیں جس میں "خاموش مجاہد" اور "فاتحِ افغانستان" جیسے کردار ایجاد کر کے قوم کو اندھیروں میں رکھا گیا تھا۔

مسٹر بھٹو کا مقدمہ ایک متنازع مقدمہ ہے۔ ملک کی اعلیٰ عدالت اس مقدمے کے فیصلے پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ دنیا بھر کے قانونی ماہرین نے مسٹر بھٹو کے مقدمے کو ایک Blind Case قرار دیا۔ اسی لیے مسٹر بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو فوج نے مار دیا کیوں کہ اس وقت پاکستان میں ایک فوجی حکومت قائم تھی۔ آج ہماری فوج کی بحیثیت ایک ادارے کے یہ تاریخی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ جس طرح دوسرے قومی، علاقائی اور عالمی مسائل پر Re-think کر رہی ہے اسی طرح فراخ دلی اور تحمل سے جناب ذوالفقار علی بھٹو کے تاریخی کردار کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر دے اور یہ کام آج زیادہ آسان ہے کیونکہ خود مسلح افواج اقتدار اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے ہیں۔ مسئلے کا حل غلطی کو تسلیم کرنے اور اس کا ازالہ کرنے پر ہے۔ اس حوالے سے اسلامی تاریخ کی دو مثالیں بڑی اہم ہیں۔ مسلم سپین ایک شاندار اسلامی تہذیب کا مرکز رہا مگر مٹ گیا۔ سلطنتِ عثمانیہ تین براعظموں پر 500 سال حکومت کرنے والی سلطنت بھی مٹ گئی مگر سلطنتِ عثمانیہ کی راکھ سے نئے تصور نے جنم لیا اور نئے حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے سلطنتِ عثمانیہ کی راکھ سے جدید ترکی ابھر کر سامنے آیا اور اس طرح ترک جغرافیائی طور پر اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہے، اس لیے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال پذیری کے دور میں ترکوں نے اپنی غلطیوں کا ازالہ اور تاریخ پر نظرِ ثانی کرنے کا عمل جاری رکھا جب کہ اس کے مقابلے میں مسلم سپین کا جغرافیہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا کیوں کہ مسلم سپین کے زوال پذیری کے دور میں ہسپانوی مسلمانوں نے اپنی تاریخی غلطیوں پر نظرِ ثانی کے بجائے جمودیت کا مظاہرہ کیا۔

تاریخی عمل کے حوالے سے پاکستان واقعی جغرافیائی تبدیلیوں کے دہانے پر کھڑا ہے۔ یہ بات وہی لوگ کر رہے ہیں جنہوں نے نام نہاد افغان پالیسی بنائی مگر تاریخ ان کی پالیسیوں کو غلط ثابت کر رہی ہے۔ اس طرح آج پاکستان واقعی تاریخ کے نظرِ ثانی کے مرحلے میں ہے اور ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست پاکستان کی بقاء کے لیے فیصلہ کن ثابت ہو رہی ہے اور میرا موقف ہے کہ پاکستان کی ریاست آج تاریخی رکاوٹوں کو دور کرے جن میں ذوالفقار علی بھٹو کا تاریخی حق ادا کرنا ہوگا اور ان کے خلاف کیے گئے اقدامات کا ازالہ ضروری ہے جس کے لیے چلی اور ترکی کے دونوں قائدین کے ساتھ کی گئی تاریخی زیادتیوں کے ازالے کی مثالیں اوپر بیان کی گئی ہیں۔

(مصنف کا یہ مضمون روزنامہ جنگ لاہور میں 19 جنوری 2002ء کو شائع ہوا۔)

www.bhutto.org

بھٹو پر فلم کی کہانی

جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کردار کشی کی مہم چلائی، جس میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف ایک "وائٹ پیپر" بھی شائع بھی کیا گیا، اس منصوبے پر اس وقت کروڑوں روپے "صَرف" کیے گئے اور یہ سب کچھ اُن کے خلاف مقدمہ قتل کے دوران کیا گیا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کی نفسیاتی جنگ کا اہم حربہ تھا۔ ایسے مواد اور الزامات نے عوام کے Anti-Bhutto دھڑے کو متحرک رہنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یقیناً ذوالفقار علی بھٹو مقبول ترین لیڈر رہوئے ہیں لیکن سماج میں رجعتی سوچ رکھنے والے طبقے میں ذوالفقار علی بھٹو کو ایک کافر، ملحد، قاتل، چالاک، مکار، عیاش، بھارتی ایجنٹ، اقتدار کا بھوکا، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمے دار، غدار، ملک دشمن، سکیورٹی رسک اور طبقاتی بغاوت پیدا کر کے ملک میں بے چینی پیدا کرنے والا شخص قرار دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے اس سارے موقف کی ریاستی سطح پر سرپرستی کی۔ ریاستی مشینری جس میں سرکاری میڈیا اور اس وقت کا محدود پرنٹ میڈیا جو کہ حکومتوں کے رحم و کرم پر ہوتا تھا، نے ضیاء الحق کے پراپیگنڈے کا مکمل ساتھ دیا۔ جنھوں نے ساتھ نہیں دیا ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ریاستی سطح پر اس پراپیگنڈے کا جواب ذوالفقار علی بھٹو نے موت کی کال کوٹھڑی سے دورانِ مقدمہ دیا اور خود ان کے بقول مقدمہ کی تیاری اور الزامات کی تردید لکھتے لکھتے ان کی انگلیوں میں زخم ہو گئے۔ ان جوابات میں ایک کتاب Rumours and Reality تھی جس کو جیل سے وکیلوں اور اہل خانہ کے ہاتھوں سمگل کیا جاتا تھا اور اس کی اشاعت ذوالفقار علی بھٹو کے مخلص اور وفادار ساتھی جناب ارشاد راؤ نے کی اور یہ کام اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کیا گیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے مارشل لائی حکومت کے وائٹ پیپر کا ایک طویل جواب لکھا، جو جیل سے سمگل ہو کر دہلی پہنچایا گیا اور وہاں پر بھارت کے ایک معروف اشاعتی ادارے ویکاس نے اس کو

شائع کیا اور اس کتاب کا نام ذوالفقار علی بھٹو نے If I am Assassinated رکھا۔

اس کتاب کی اشاعت نے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں بلا کا تجسس پیدا کر دیا اور یہ کتاب بھارت سے آنے والے محدود مسافروں کی ناریل اور پان کی ٹوکریوں میں چھپا کر لائی جاتی، پکڑے جانے پر دو سے چار سال تک قید کا سامنا کرنا پڑتا۔

If I am Assassinated اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے تین سال بعد یہ خبریں "سینہ گزٹ" اور چھوٹے اخبارات کے ذریعے پہنچیں کہ بھارت میں ذوالفقار علی بھٹو پر فلم بنائی جا رہی ہے۔ لہٰذا جنوری 1983ء میں، بھارت کے سفر کے دوران میں نے بھٹو پر فلم کے پروڈیوسر آئی ایس جوہر سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ دہلی میں جب میرے ایک دوست ہرچرن سنگھ خربندا کو میری اس خواہش کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے یہ بتایا کہ جناب آئی ایس جوہر کی فلم کی کہانی بھارت کے معروف جریدے "انڈیا ٹوڈے" میں چھپ چکی ہے، جو انہوں نے فوراً ہی فراہم کر دیا۔ یہ کہانی بھٹو کے مقدمہ قتل کے دوران کے واقعات پر مبنی تھی، جس میں کوٹ لکھپت جیل اور راولپنڈی جیل کے ان پر بیتے ایام کا زمانہ فوکس کیا گیا تھا۔ یہ کہانی تقریباً مکمل حقائق کو اکٹھا کر کے لکھی گئی تھی۔ اس کے مطالعے کے بعد میں دہلی سے بمبئی روانہ ہوا۔ میرے پاس آئی ایس جوہر صاحب کا کوئی ایڈریس موجود نہیں تھا۔ بمبئی میں میرا قیام اندھیری کے علاقے میں تھا جو کہ بمبئی کے معروف علاقے جوہو سے زیادہ دور نہیں۔ میں نے بمبئی کے فلمی اداروں کے دفاتر کے چکر لگانے شروع کر دیے اور اس تلاش میں مجھے ایک دو دن میں کامیابی ہو گئی اور یوں معلوم کردہ ایڈریس پر میں جا دھمکا۔ 2 لوٹس کورٹ، کولابہ۔ کولابہ بمبئی کا خوبصورت ترین علاقہ ہے، جہاں پر بھارت کا معروف اور خوبصورت ہوٹل تاج محل بھی واقع ہے۔

صبح گیارہ بجے کے قریب میں 2 لوٹس کورٹ کے خوب صورت اپارٹمنٹ پر موجود تھا، فلیٹ کے دروازے پر گھنٹی بجائی۔ دوسری یا تیسری گھنٹی پر ایک ملازم باہر نکلا۔ میں نے پوچھا آئی ایس جوہر صاحب کا گھر یہی ہے اور کیا وہ موجود ہیں؟

جی ہاں اُن کا یہی گھر ہے۔

کیا میں اُن سے مل سکتا ہوں؟

آپ کا تعارف؟

میں پاکستان سے آیا ہوں اور میرا تعلق ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی سے ہے۔

جواب ملا، ٹھیک ہے بابو جی، آپ ٹھیک 3 بجے آ جائیے گا، صاحب آپ کو مل سکیں گے۔ ملازم، پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو کا نام سن کر حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ اُن دنوں پاکستان کے بارے میں تعارف یہ تھا کہ ایک ایسا ملک جہاں پر سرعام کوڑے اور لوگوں کو پھانسی دی جاتی ہے اور یہ بھی کہ جو سوویت یونین کے خلاف اسلامی جہاد کر رہے ہیں۔ میں نے وقت گزارنے کے لئے اس اپارٹمنٹ کے سامنے ایک بورڑوا سینما میں فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا اور یوں میں نے معروف انگریزی فلم The Blue Lagoon دیکھی۔ فلم ختم ہوتے ساتھ ہی میں واپس جناب آئی ایس جوہر کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ گھنٹی بجنے پر اسی ملازم نے دروازہ کھولا اور خوشی اور مسکراہٹ سے کہا: آ جائیے، صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے سامنے دیکھا کہ آئی ایس جوہر جوگیا رنگ کا لمبا چوغا پہنے ایک دیوان پر بیٹھے ہیں۔ تعارف کروانے کے بعد اور بمبئی کی خوشبودار چائے کے دوران گفتگو کا آغاز ہوا۔ انہوں نے میرے پنجابی لہجے کو محسوس کرتے ہوئے کہا، کیا آپ پنجابی ہیں؟ جی ہاں۔ تو انہوں نے کہا کہ گفتگو پنجابی میں ہونی چاہیے، اور جب انہوں نے پنجابی بولنا شروع کی تو مجھے احساس ہوا کہ ان کا لہجہ میری جائے پیدائش سرگودھا کا ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کہاں پیدا ہوئے؟ اُن کا جواب تھا تلہ گنگ، اپنے علاقائی تعلق پر خوشی کا اظہار کیا اور اُن کو بتلایا کہ گو اب میں لاہور رہتا ہوں، مگر میری جائے پیدائش سرگودھا کی ہے۔ آئی ایس جوہر نے کہا اور میں سناتن دھرم ہائی سکول سرگودھا (جو کہ اب خالقیہ ہائی سکول بن چکا تھا) میں پڑھا ہوا ہوں۔

آئی ایس جوہر کے ساتھ جناب بھٹو پر فلم کی بات میرا اہم مقصد تھا کہ اس پراجیکٹ کی کیا حقیقت ہے اور کس مرحلے میں ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ حکومت نے اس فلم کے بنانے کی اجازت نہیں دی اور ''انڈیا ٹوڈے'' میں چھپی جو کہانی آپ اپنے ساتھ لائے ہیں اب اس پر تھیٹر ڈرامے کا منصوبہ زیر بحث ہے (شاید یہ ڈرامہ قاضی تھیٹر کے تحت بعد میں ہو گیا) جبکہ میں بھٹو پر فلم کا منصوبہ اب نئے نداز میں آغاز کرنے کا سوچ رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے اس کہانی کے بارے میں بریف کیا کہ اب یہ کہانی بھٹو کی جیل سے زبردستی رہائی (Escape) پر مبنی ہو گی اور اس میں مرتضیٰ بھٹو کا ایک اہم کردار ڈالا جائے گا۔ انھوں نے اب مجھے جس فلمی کہانی سے آگاہ کیا اس کا تعلق بھٹو کے مقدمۂ قتل یا سیاسی حقائق سے زیادہ سنسنی خیزی پر تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ تو ایک سراسر کاروباری سنسنی خیز فلم ہو گی انھوں نے کہا کہ، ہاں تقریباً، لیکن اس سنسنی خیزی کے اردگرد سیاسی واقعات کا احاطہ کیا جائے گا۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو

میں نے اُن دنوں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی، جس میں ایک افریقی لیڈر کو جیل سے فرار کروایا جاتا ہے اور طویل منصوبہ بندی اور کشت وخون کے بعد جب اس لیڈر کو جہاز پر بٹھایا جاتا ہے تو مخالف فوجی دستے اس جہاز پر فائرنگ کر رہے ہوتے ہیں، یہ لیڈر جیل سے بھگانے والے کمانڈوز کو کشت وخون سے روک رہا ہوتا ہے اور اس دوران ایک گولی اس کے سینے پر آ لگتی ہے، کمانڈوز کو بے چینی ہوتی ہے کہ لیڈر کا جہاز جلدی سے جلدی ٹیک آف کر جائے لیکن گولی اس لیڈر کی موت کا سبب بنتی ہے اور یہ لیڈر اپنے ہمدرد کمانڈوز کو مسکراتے ہوئے کہتا ہے: "A Leader will be die, but spirit will be alive" آئی ایس جوہر میرے اس مؤقف سے متفق تھے کہ ہاں ایسی ہی فلم ہوگی لیکن اگر آپ میری مدد کریں تو ہم اس کہانی کو مزید حقائق کے قریب کر دیں گے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اس فلم کی خبر کے بعد آپ دوسرے پاکستانی ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ میرے استفسار پر کہ پہلا پاکستانی کون تھا؟ انہوں نے بتلایا کہ مرتضیٰ بھٹو، اور وہ بڑے جذباتی اور Concerned ہیں اپنے والد کے لیے۔ آئی ایس جوہر نے بتلایا کہ مرتضیٰ بھٹو نے کہا کہ اگر بھارت میں یہ فلم بننی مشکل ہے تو آپ یہ فلم لیبیا میں بنا سکتے ہیں اور میں اس کے لئے فنڈز بھی اکٹھے کر سکتا ہوں۔

آئی ایس جوہر کا مؤقف تھا کہ میں فلم اپنی مرضی اور منصوبے کے تحت بنانا چاہتا ہوں اور اس میں کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتا۔ آئی ایس جوہر نے بتایا کہ اُن کی ذوالفقار علی بھٹو سے لاہور میں ایک مرتبہ ہوٹل میں قیام کے دوران ملاقات ہوئی جب وہ ایوب حکومت میں وزیر تھے۔ آئی ایس جوہر اس فلم کو بنانے میں بڑے Excited تھے لیکن افسوس یہ فلم تصور اور تحریری منصوبہ بندی سے آگے نہ جا سکی اور نہ ہی ذوالفقار علی بھٹو کے مالی طور پر مضبوط چاہنے والوں نے ایسی کوئی Effort کی۔ بھٹو اور اُن کی جماعت کی بننے والی حکومتوں میں ایسے لاتعداد "معتقدین" ہیں جو ایسے کسی منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے تھے، لیکن نہیں۔ صرف مفادات کے حصول تک 'ذوالفقار علی بھٹو' کا عشق محدود ہے اور یہ بھی افسوس کہ جن بے وسیلہ لوگوں نے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ کوئی معیاری پروڈکشن نہیں تھی...... یا پھر صرف "خانہ پری" کے لیے کارروائی کی گئی۔ آئی ایس جوہر سے ملاقات میری "تاریخ کی تلاش" کا ایک سفر تھا۔

www.bhutto.org

بیگم نصرت بھٹو اور آنسہ بے نظیر بھٹو

ستمبر 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں قتل کا مقدمہ شروع ہوا تو جنرل ضیاء الحق نے پنجاب میں سیاسی سرگرمیوں خصوصاً پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف حصار تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جناب بھٹو کی پارٹی میں شامل جاگیردار قیادت آہستہ آہستہ سیاست کے میدان سے نکلنا شروع ہو گئی وہ جانتے تھے کہ میدانِ سیاست اب کربلا کے میدان میں بدلنے لگا ہے۔ ریاستی جبر کے عروج کا آغاز مقدمے کے ساتھ ساتھ ہونے لگا۔ جنرل ضیاء الحق نے سیاست کے میدان میں پی پی پی اور اس کے مخالف دھڑوں میں بڑی چابک دستی سے تقسیم میں مزید خلیج پیدا کرنے کی کوششیں تیز کر دیں تا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو دوسری سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رکھ کر ا کیلے "نمٹا" جا سکے۔ (یاد رہے کہ یہیں سے بھٹو اور اینٹی بھٹو سیاست کا آغاز ہوا جو آج تک ہماری سیاست کا عنوان ہے)

ذوالفقار علی بھٹو شہید 5 جولائی 1977ء کو فوجی حراست میں لے لئے گئے تھے اور اس کے بعد ان کو مری میں نظر بند کیا گیا جہاں پر جنرل ضیاء الحق نے ان سے ایک بار ملاقات بھی کی، جس کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ مسٹر بھٹو کا رویہ بڑا سخت اور جنرل ضیاء الحق اپنے مخصوص انداز میں ان سے پیش آیا یعنی منافقانہ انداز میں حلیم اور نرم و نازک اندازِ گفتگو، مری سے رہائی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کراچی گئے اور کراچی سے جہاز کے ذریعے انہوں نے 10 اگست 77ء کو لاہور آنے کا فیصلہ کیا، جنرل ضیاء الحق اور بھٹو مخالف سیاسی جماعتیں (پاکستان قومی اتحاد) کو یقین تھا کہ مسٹر بھٹو اپنی مقبولیت کھو چکے ہیں، لیکن 10 اگست 77ء کے اس استقبال نے یہ حقیقت آشکارا کر دی کہ ذوالفقار علی بھٹو آج بھی پہلے کی طرح مقبول ہیں وہ آدھی رات کے وقت شادمان میں سابق وزیراعلیٰ صادق حسین قریشی کے گھر پہنچے جہاں انہوں نے گھر کے ٹیرس پر کھڑے ہو کر اپنے کارکنوں سے خطاب کیا۔ میں نے بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو کو ٹیرس پر

کھڑے خطاب کرتے ہوئے سنا۔

''امریکہ میری جان کا دشمن ہے، میرے خلاف مقامی نہیں عالمی سازش عمل پذیر ہو چکی ہے......''

اس کے بعد ان کو گرفتار کیا گیا لیکن چند دنوں بعد جسٹس کے ایم اے صمدانی نے ضمانت پر رہا کر دیا۔ اس رہائی کے بعد دوبارہ ان کو 70 کلفٹن سے رات کے آخری پہر گرفتار کیا گیا، جس کا ذکر دوسرے پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے، ان کو گرفتار کر کے لاہور لایا گیا۔ لاہور میں ان کو نامعلوم مقام پر محبوس رکھا گیا لیکن میرے گھر کے قریب لاہور چھاؤنی میں پی اے ایف مارکیٹ کے سامنے، میں نے سفید کپڑوں میں ملبوس خفیہ والوں کی غیر معمولی ''واک'' آنا جانا دیکھا تو مجھے اس بات کی خوشبو محسوس ہونے لگی کہ مسٹر بھٹو یہیں ہیں اور خوشبو کی یہ شہادت درست ثابت ہوئی۔ میرے ایک دوست فوجی افسر نے کہا کہ اس کے گھر کے پیچھے فوجی گھر میں ذوالفقار علی بھٹو نظر بند ہیں۔ فوج کے جونیئر افسران کے یہ گھر پی اے ایف مارکیٹ کے بالکل سامنے ہیں۔ اس فوجی افسر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم انہیں دیکھ سکتے ہو، مگر اپنے ہونٹ بند رکھنا اور اپنی آنکھوں کو بھول جانے کا کہہ دینا، اور یوں شام کو افطار کے وقت میں نے نظر بند بھٹو کو دونوں گھروں کے درمیان 2 فٹ کی معمولی دیوار کے اس پار سگار پیتے اور مسکراتے ہوئے دیکھا اور ہم دونوں نے دیوار کے اُس طرف یہ تاثر دیا کہ ہم نے آپ کو دیکھا ہی نہیں اور انہوں نے بھی مسکراتے چہرے اور خاموش آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔

جوں جوں مقدمہ قتل آگے بڑھتا چلا گیا، توں توں سیاسی صف بندیاں از سر نو منظم ہوتی گئیں۔ ایک سیاسی قیادت کو سیاسی اور جسمانی طور پر مٹا دینے کے تمام سامان اکٹھے کیے گئے، ایک کرشمہ ساز لیڈر کے خاتمے کا سامان کہ اگر اس کو قتل کر دیا جائے تو اس کی جماعت خود بخود بکھر جائے گی۔ اس منصوبے پر چالاکی، چابک دستی اور ظالمانہ انداز میں عمل کیا گیا۔ بھٹو کا نام لینے والوں کو سر عام کوڑے مارنے کے لئے رومن انداز میں سٹیڈیم سجائے گئے اور ہزاروں کے مجمعے لگائے گئے۔ کوڑے کھانے والے کے منہ کے سامنے مائیک لگا دیا جاتا تا کہ کوڑے کی کرب کی شدت کو لاؤڈ سپیکر سے سٹیڈیم میں موجود ہزاروں لوگوں کو ''مستفید'' کیا جا سکے۔ عوام کو دہشت زدہ کرنے کے لئے ایک گہری منصوبہ بندی کی گئی، اس مقصد کے لئے جنرل ضیاء الحق نے نفسیاتی جنگ اپنے ہی عوام کے خلاف منظم کی۔ اس کے لئے آرمی کے ایک ماہر نفسیات بریگیڈیئر پر مشتمل سیل قائم کیا گیا کہ لوگوں کو حکومت کے رُعب میں کیسے لایا جائے، کوڑے مارنے اور سر عام پھانسیاں دینے کو Islamization کے عمل سے تعبیر کیا گیا اور بھٹو مخالف (پی این اے) نے

www.bhutto.org

جنرل ضیاء الحق کے اس ''اسلامیانے'' کی مکمل حمایت کی۔ سر عام پھانسی اور کوڑے پاکستان کے آئندہ سیاسی منظر نامے کا آغاز تھا یعنی Fascism of Masses جو کہ آج اپنے عروج پر ہے، عوامی سطح پر اس فاشزم کا ''بانی'' جنرل ضیاء الحق ہے۔ جس کا مظاہرہ اب پاکستان بھر کے شہروں میں دیکھا جا رہا ہے۔ لوگ از خود ''حساب کتاب'' کرنے جا رہے ہیں۔ ریاست نے اس فاشزم کی بنیاد رکھی اسی لیے پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم کو عدالت میں کھڑا کرنے کے لئے ایک کٹہرا بنوایا گیا اور اس کے حامیوں کو سر عام درے مارے گئے۔

5 جولائی 1977ء کو جب ضیاء الحق نے فوجی بغاوت کی اس وقت وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اپنے اہل خانہ بیگم نصرت بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو، بے نظیر بھٹو اور صنم بھٹو کے ہمراہ وزیر اعظم ہاؤس میں موجود تھے، ذوالفقار علی بھٹو نے فوجی بغاوت کی اطلاع جوان کو ضیاء الحق نے فون پر دی، کے بعد بے نظیر بھٹو کو اپنے اس تجزیے سے آگاہ کیا کہ فوج 9 ماہ بعد واپس بیرکوں میں نہیں جائے گی بلکہ یہ طویل عرصے تک اقتدار میں رہے گی۔ اپنے خدشات اور ممکنہ خطرات کو بھانپتے ہوئے مسٹر بھٹو نے اپنے بچوں کو جلد ہی ملک چھوڑنے پر مائل کیا تا کہ وہ فوجی آمریت کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہو جائیں۔

اس کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کیا گیا اور جاگیردار قیادت مسٹر بھٹو کے خلاف سازشوں میں شریک ہونا شروع ہوئی تو جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی کے سینئر وائس چیئرمین شیخ محمد رشید کو پارٹی قیادت سنبھالنے کا عندیہ دیا اور اگر وہ گرفتار ہو جاتے ہیں تو ایسی صورت میں شیخ رشید جس کو نامزد کریں گے وہ پارٹی کی قیادت سنبھالے گا۔ جبکہ جناب شیخ محمد رشید نے ذوالفقار علی بھٹو سے جیل میں ملاقات کے دوران مسٹر بھٹو کو آگاہ کیا کہ اگر ان کو پارٹی چیئرمین نامزد کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں پارٹی میں رہ جانے والے جاگیردار سازشیں کر کے ان کو ناکام کریں گے لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ بیگم نصرت بھٹو کو قائم مقام چیئرپرسن نامزد کر دیا جائے اور یہ تجویز بڑی کارآمد ہوئی۔ بیگم نصرت بھٹو پر اختلاف کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ بھٹو صاحب کے خلاف مقدمہ چلا تو بیگم نصرت بھٹو ایک متحرک لیڈر کی حیثیت سے پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر ابھر کر سامنے آئیں۔ بیگم نصرت بھٹو کی قیادت نے اس وقت اور بھٹو شہید کی سزائے موت کے بعد جو Transitory کردار ادا کیا، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو پارٹی کی متبادل قیادت کے طور پر ابھریں۔

بیگم نصرت بھٹو نے جب ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ کے دوران سیاسی احتجاجوں اور مختلف تحریکوں کو

www.bhutto.org

منظم کرنے کا سلسلہ شروع کیا، تو اس سلسلے میں لاہور میں نور حیات نون، فاروق لغاری کا گھر اور گلبرگ میں ہی واقع کھگہ ہاؤس میں بیگم نصرت بھٹو اور آنسہ بے نظیر بھٹو نے قیام کیا۔ فردوس مارکیٹ کے پیچھے واقع کھگہ ہاؤس میں ہی بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو نظر بند بھی کیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو، فاطمہ جناح کے بعد پہلی خاتون سیاست دان ہیں جنہوں نے عوامی سطح پر سیاست کی، بیگم نصرت بھٹو نے تقریباً دو دہائیوں تک ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کیا، اگر بیگم نصرت بھٹو، ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ کے دوران اور پھانسی کے بعد متحرک نہ ہوتیں تو دعوے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاید بے نظیر بھٹو صاحبہ کے لئے سیاست میں اترنا اور ایک مقبول لیڈر کے طور پر ابھرنا مکمل طور پر ناممکن تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو درحقیقت، ذوالفقار علی بھٹو کی Legacy کے لئے میدان سیاست میں برسرپیکار رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بیگم نصرت بھٹو دوران مقدمہ اور پھانسی کے بعد لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں میں کیسے دلیرانہ انداز میں سفر کرتی تھیں۔ لاہور کی متعدد میٹنگوں میں شرکت کے لئے وہ خفیہ والوں کی آنکھوں اور نگرانیوں سے بچنے کے لئے برقع اوڑھ کر شامل ہوتی رہیں۔ گیارہ جماعتوں کا اتحاد (تحریک بحالی جمہوریت) کے قیام میں بیگم نصرت بھٹو نے بنیادی کردار ادا کیا۔

ستمبر 1978ء کو، میں نے محترمہ بے نظیر بھٹو سے پہلی ملاقات کی جو کہ فاروق لغاری کی رہائش گاہ نہر کے کنارے گلبرگ میں ہوئی۔ بے نظیر بھٹو، اس وقت نہ تو محترمہ اور نہ ہی بی بی قرار دی گئیں تھیں بلکہ ان کو آنسہ کے خطاب سے پکارا جاتا تھا۔ کچھ لوگ جو انگلش صحافت کرتے ہیں وہ بی بی Benazir Bhutto کو (BB) سے متعلق تصور کرتے ہیں، جو کہ غلط ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کے مقدمہ کے دوران بے نظیر بھٹو، بیگم نصرت بھٹو کے سایہ میں میدان عمل میں آئیں تو پارٹی کے کارکن اور واحد روزنامہ جو پارٹی، بھٹو اور ان دونوں خواتین کی خبروں کو کور کرتا تھا وہ صرف روزنامہ مساوات ہی تھا اور اس اخبار نے بے نظیر بھٹو کے لئے احتراماً بے نظیر بھٹو کے شروع میں آنسہ کا لفظ استعمال کیا جو کہ عربی میں غیر شادی شدہ معزز خاتون کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آنسہ بے نظیر بھٹو، جب جلاوطنی کے دوران اگست 1985ء اپنے جواں سال بھائی شاہنواز بھٹو کی میت لے کر لاڑکانہ آئیں تو سندھی کارکنوں نے ادباً ''بی بی'' کا لفظ استعمال کیا جو ان کی شہادت کے بعد ابھی تک استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ محترمہ کا لفظ 1988ء میں اس وقت استعمال کیا جانے لگا جب وہ اس ملک کی وزیراعظم منتخب ہوئیں اور اس کا آغاز پاکستان ٹیلی ویژن سے ہوا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کے لئے پارٹی نے بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں ناقابل یقین جرأت مندی

www.bhutto.org

کے ساتھ جدوجہد کی۔اس دور میں پارٹی کی ایک مخلص رکن محترمہ آمنہ پراچہ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس کے علاوہ بیگم نادرہ خاکوانی ،صغیرہ اسلام ،شاہدہ جبیں ،عابدہ ملک ،بیگم این ڈی خان ،ریحانہ سرور ،طلعت یعقوب ،فاطمہ ثریا بیگم ،رانا شوکت محمود ،،عزیزہ بیگم ،اماں پارس جان ،نیلم شاہ ،پارٹی کے بانی رکن اور مزدور رہنما میر حامد کی صاحبزادی گوشی (لنڈا بازار لاہور) گوجرانوالہ کی طیبہ ،اماں پٹھانی ،مزدور رہنما ،نفیسہ خالد (گوجرانوالہ)،کشور قیوم نظامی ،نرگس نعیم (لائل پور)۔سمیت متعدد خواتین نے نصرت بھٹو کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔

بیگم نصرت بھٹو نے پارٹی میں ذوالفقار علی بھٹو کی جسمانی عدم موجودگی کا خلا بڑے بھرپور انداز میں پُر کیا۔جنرل ضیاء الحق نے عوام کی سیاست سے توجہ ہٹانے کے لئے مختلف نفسیاتی حربے استعمال کیے۔ دوران مقدمہ عوام میں خوف و ہراس اور دہشت زدہ کرنے کے لئے پارٹی کے کارکنوں کی پیٹھوں پر سر عام کوڑے مارے گئے ،چند مجرموں کو سر عام سزائے موت بھی دی گئی اور اس کا ''نظارہ'' کرنے کے لئے عوامی اجتماعات کیے گئے۔ایسے میں کرکٹ کے کھیل کو بھی سیاسی عدم توجہی کے لئے استعمال کیا گیا۔اسی لئے لاہور قذافی سٹیڈیم میں بیگم نصرت بھٹو نے کرکٹ کے ایک میچ میں جانے کا فیصلہ کیا۔جب بیگم نصرت بھٹو قذافی سٹیڈیم میں داخل ہوئیں تو کرکٹ میں مست مجمع

ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد

جیوے جیوے بھٹو جیوے

کے نعروں سے گونج اٹھا۔

بیگم نصرت بھٹو کو دیکھتے ہی پولیس نے سٹیڈیم میں پھلانگتے عوام پر بے دردی سے لاٹھی چارج کرنا شروع کر دیا،بیگم نصرت بھٹو سٹیڈیم کے میدان میں دلیرانہ وار نعرے لگا رہی تھیں ،انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

''میرے کارکنوں پر لاٹھیاں کیوں برساتے ہو جرأت ہے تو میری طرف آؤ''۔

ضیاء الحق کی آمرانہ حکومت کی شہہ پر پولیس اور خفیہ والوں نے بیگم نصرت بھٹو پر لاٹھیوں کے وار کرنے شروع کر دیے اور خاتون اول کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا، مجھے یاد ہے کہ خون میں لت پت بیگم نصرت بھٹو کارکنوں کا حصار توڑ کر نعرے لگا رہی تھیں اور سارا سٹیڈیم جو کہ رومن سٹیڈیم کے طور پر سجایا گیا تھا، بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور نعرے لگ رہے تھے۔

"شرم کرو حیا کرو۔ بھٹو کو رہا کرو"

پھر اردگرد کی سڑکیں پولیس مقابلوں سے سج گئیں۔ یہ بڑی عوامی بغاوت تھی، جنرل ضیاء کی ریاستی مشینری نے اسے بے رحمی سے کچل دیا اور دوسرے دن سینکڑوں پارٹی کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو اس لاٹھی چارج کے بعد ہسپتال داخل ہو گئیں۔

بیگم نصرت بھٹو نے ایک طرف ذوالفقار علی بھٹو شہید کا پرچم بلند کیا اور دوسری طرف انہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی Trainer کا فریضہ سرانجام دینا شروع کر دیا، بیگم نصرت بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاست کے درمیان ایک پُل کا کردار ادا کیا جس کی مثال ہی نہیں ملتی، اگر یہ کہا جائے کہ بیگم نصرت بھٹو یہ کردار ادا نہ کرتیں تو عوام کو بے نظیر بھٹو کی شکل میں ایک نئی قیادت ہی میسر نہ آتی اور یہ کام اس وقت کیا گیا جب پاکستان میں فوجی آمریت کی دہشت اپنے عروج پر تھی یہ کوئی "Soft Democratic" جدوجہد کا زمانہ نہیں تھا بلکہ یہ دور پاکستان میں ریاستی دہشت گردی کے عروج کا زمانہ تھا۔ پاکستان کے صحافی، سیاست دان اور دانشور حلقے اس بات کو ایک خواب تصور کرتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کے بعد کوئی ان کی قیادت کا خلا پر کر سکے گا لیکن بیگم نصرت بھٹو نے دانش مندی، دلیری، جرأت اور تدبر کے ساتھ یہ تاریخی سیاسی فریضہ سرانجام دیا۔ یہ ایک سائنٹیفک حقیقت ہے کہ پاکستان میں ایک لڑکی (بے نظیر بھٹو) کی قیادت کو منوانے کا کارنامہ ایک عورت (بیگم نصرت بھٹو) کے سر ہے اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی شکل میں ایک عورت کا مقبول لیڈر بن جانا اور بعد میں ان کا اسلامی دنیا کی پہلی سربراہ حکومت بن جانا، اس کا کریڈٹ پاکستان پیپلز پارٹی اور پھر پاکستان کے نہایت غریب عوام کو جاتا ہے یہ کسی Gender تحریک کا معجزہ نہیں یہ معجزہ ایک عوامی انقلابی تحریک کا ہے اور اس قیادت کی تشکیل میں پی پی پی کے ہزاروں کارکنوں کی پیٹھوں پر کوڑے مارے گئے اور جب لاہور کے قلعے اور دیگر عقوبت خانوں میں ان کارکنوں پر تشدد کیا جاتا تو ریاستی کارندے، کارکنوں کو مخاطب کر کے بیگم نصرت بھٹو صاحبہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے لئے غلیظ زبان استعمال کرتے۔ سولی پر جھولنے والے ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی سیاست میں مرنے کے بعد بھی اپنا اثر قائم رکھا اور وقت نے ثابت کیا کہ سولی پر جھولانے والے جلاد تاریخ کے مجرم اور جھولنے والے تاریخ کے ہیرو ٹھہرے۔

ترکی، بھٹو اور بلند ایجوت

طویل خانہ جنگی کے بعد 20 جولائی 1974ء کو ترک افواج قبرص کے جزیرے میں قبرصی ترک عوام کو یونانی نسل پرستوں سے بچانے کے لیے قبرص کے خوبصورت شہر ''گرنے'' (Girne) پر چھاتہ برداروں کے ذریعے اترنے پر مجبور ہوئیں۔ ترک افواج کے اس آپریشن کا نام (Operation Atilla) تھا، ترک افواج نے اس آپریشن کو جزیرے میں امن کے قیام سے تعبیر کیا کہ جزیرہ قبرص یونانی نسل پرستوں کی طویل خانہ جنگی کے نتیجے میں نہ ختم ہونے والی جنگ کا شکار رہے۔ ترک افواج نے آبادی کے لحاظ سے 37% حصے پر کنٹرول سنبھالنے کے منصوبے پر عمل کیا۔ 16 ویں صدی کے بعد کسی مسلمان مملکت کے حصے میں یہ پہلی کامیابی ہے جس میں ایک مسلم ریاست کے رہنے والے لوگ اپنی سرزمین واگزار کروانے میں کامیاب ہوئے۔ یونان اور ترکی دونوں ملک ہی NATO کے اہم رکن ہیں، اس طرح ترکی نے ایک دوسرے ناٹو رکن ملک کے سامنے صف آراء ہو کر ایک انمٹ تاریخی قدم اٹھایا، جس پر مغرب خصوصاً یورپ سکتے میں آ گیا، اس منصوبے پر جس رازداری، دانش مندی، خاموشی اور تدبر کے ساتھ عمل کیا گیا یہی اس آپریشن کی کامیابی کا راز ہے۔ اس تاریخی فیصلے کا سہرا ترکی کے مرحوم وزیراعظم جناب بلند ایجوت کے سر ہے، جنھوں نے اس سارے پلان کو از خود ترتیب دیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جب ترک چھاتہ بردار قبرص کے جزیرے میں اتر رہی تھیں وزیراعظم بلند ایجوت نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ

''ہم قبرص کے جزیرے میں جنگ کے لیے نہیں بلکہ وہاں پر امن قائم کرنے کے لیے جا رہے ہیں اور وہاں پر صرف ترک قبرصیوں کے لیے نہیں بلکہ یونانی قبرصیوں کے لیے بھی امن قائم کرنا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ وہاں پر ہماری فورسز کے خلاف مزاحمت نہیں کی جائے گی''۔

ایسا ہی ہوا، 20 جولائی 1974ء سے آج تک اس خوبصورت جزیرے میں جنگ نہیں بلکہ امن

www.bhutto.org

کی فضا قائم ہے۔ اس آپریشن نے خطے میں ترک، یونانی خانہ جنگی کا خاتمہ بھی کر دیا۔ جب ترکی کے وزیراعظم بلند ایجوت کی حکومت کی قیادت میں قبرص میں امن آپریشن کیا گیا۔ اس وقت پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم تھے۔ وزیراعظم بھٹو نے ایک سال قبل، جنگ رمضان جو کہ اسرائیل اور مصر و شام کے درمیان برپا ہوئی، اس میں بھی کھل کر مصر و شام کی حمایت کا مظاہرہ کیا تھا اور اب انہوں نے ترکی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو، مشرق وسطیٰ کی سیاست میں پاکستان کے حوالے سے اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ اس پر جیسے مغربی قوتیں جناب بلند ایجوت سے نالاں تھیں ویسے ہی وہ جناب ذوالفقار علی بھٹو سے بھی نالاں تھیں۔ 28 اپریل 1977ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جناب بھٹو نے اپنی تقریر میں اپنے اس کردار کا حوالہ دیا تھا کہ ''سفید ہاتھی'' اُن سے کیوں نالاں ہے کہ ''وہ سفید ہاتھی'' میرے ترکی اور یونان کے مابین مصالحانہ کوششوں کو بھی ناپسند کرتا ہے، ویسے ہی جیسے وہ میرے دیگر اقدامات سے ناراض ہے۔''

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف، جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے جب دائرہ زندگی تنگ کرنا شروع کیا تو ترکی اُن ممالک میں سرفہرست تھا جو ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کے لیے مختلف محاذوں پر کوشاں تھا اور اس وقت ترکی کے وزیراعظم جناب بلند ایجوت تھے۔ میرے لیے بلند ایجوت تیسری دنیا کے اہم لیڈر ہیں، جب قبرص آپریشن ہوا تو میں سکول کا طالب علم تھا اور اس کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مقدمہ قتل قائم کیا گیا میں ابھرتی نوجوانی کے ابتدائی سالوں میں تھا، بلند ایجوت کی ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی کے لیے رحم کی اپیلیں میرے لیے امید کی ایک کرن تھی جو کہ ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی کا پیغام ثابت ہوسکتی تھیں۔ بھٹو شہید کی پھانسی کے بعد 12 ستمبر 1980ء کو جنرل کنعان ایورن نے ترکی میں مارشل لاء لگا دیا، ترکی کی تاریخ میں یہ سب سے سخت مارشل لاء ہے۔ اس مارشل لاء نے ترکی کا آئین ختم کر دیا اور کنعان ایورن کے مارشل لاء نے اس وقت کے دو اہم راہنماؤں بلند ایجوت اور سلیمان ڈیمرل کو قید میں ڈال دیا، بعد میں نئے بننے والے آئین کے تحت دونوں رہنماؤں پر دس سال کے لیے سیاسی پابندیاں لگا دیں۔ مجھے وہ تصویر یاد ہے جس میں جناب بلند ایجوت ترکی فوج کی نگرانی میں سینہ تانے فوجی عدالت میں جا رہے ہیں۔ بلند ایجوت ایک شاعر بھی تھے اور انقلابی سیاست کے علمبردار بھی، میرے لیے یہ زندگی کی اب بڑی خواہش تھی کہ قبرص کے فاتح اور ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی دوست کو جب بھی ممکن ہو ملوں۔ اگست 1983ء میں ضیاء الحق کا مارشل لاء اور ترکی میں جنرل کنعان ایورن کا مارشل لاء اپنے عروج

www.bhutto.org

پرتھا۔ میں اپنے محدود وسائل میں ترکی چلا گیا۔ ایک طالب علم کا کیا سماجی رتبہ ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کرنا بڑا آسان ہے۔ میں اپنی ہمت اور اعتماد کے ساتھ انقرہ میں نظر بند فاتح قبرص اور بھٹو کی زندگی بچانے کے لئے کوشاں لیڈر جناب بلند ایجوت سے ملنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس شاعرِ انقلابی سے یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی جو اُن کے انتقال 5 نومبر 2006ء تک قائم رہی اور میں اُن کی محبتوں کا اب تک اسیر ہوں۔ بلند ایجوت کے ساتھ میری دوستی جس اعتماد کی بنیادوں پر قائم ہے وہ میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔ تمام ملاقاتوں میں انہوں نے مجھ پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اہم سیاسی معاملات پر گفتگو کی، حتیٰ کہ جب چوتھی بار ترکی کے وزیراعظم منتخب ہوگئے تب بھی وہ تقریباً ہر سیاسی ایشو پر کھل کر میرے ساتھ بات کرتے۔ جن میں ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کے لئے کوششوں سے لے کر، عراق، افغانستان، امریکہ، پاکستان اور خود ترکی کی اندرونی سیاست، مثلاً کرد ایشو سمیت بات چیت ہوتی تھی، اُن کا اعتماد میری دوستی کا سب سے بڑا نقطہ ہے۔ اپنے ساتھ مختلف ملاقاتوں جو کہ 1983ء سے 2003ء تک تسلسل کے ساتھ ہوتی رہیں، انہوں نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کے حوالے سے اپنی کوششوں اور اقدامات سے آگاہ کیا انہوں نے مجھے بتلایا کہ میں نے ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کے فیصلے کے بعد متعدد بار بالواسطہ اور بلاواسطہ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور انہیں یہ انتباہ کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت دیئے جانے میں پاکستان کو ہر انداز میں نقصان پہنچے گا اور بحیثیت صدر آپ کے پاس یہ اختیار ہے کہ آپ مسٹر بھٹو کی سزائے موت ختم کر کے عمر قید میں تبدیل کر دیں۔ ہمارا ملک ترکی اس تجربے سے گزر چکا ہے کہ جب عدنان میندریس کو 17 ستمبر 1961ء کو سزائے موت دی گئی۔ میں ذاتی طور پر عدنان میندریس کی سیاست اور اُن کے کردار سے قطعاً متفق نہیں لیکن وقت نے ثابت کیا کہ عدنان میندریس کو پھانسی دیئے جانے سے ترکی کے مسائل میں اضافہ ہی ہوا، ایسے ہی مسٹر بھٹو کو سزائے موت کی صورت میں پاکستان ایک کے بعد ایک نئے بحران سے دوچار ہوگا۔ پھانسی بحرانوں کا حل نہیں بلکہ پھانسی کی سزا بحرانوں کو جنم دے گی اور ایسی صورت میں قوم درحقیقت ایک Leaderless قوم بن جائے گی۔

بلند ایجوت نے بتلایا کہ میں نے رسماً حکومتِ ترکی کی طرف سے جنرل ضیاء الحق کو مسٹر بھٹو کی زندگی کے لیے رحم کی اپیل تو بھیجی ہی تھی، لیکن اس اپیل کے علاوہ میں نے جنرل ضیاء الحق کو یہ بھی پیشکش کی تھی کہ اگر مسٹر بھٹو کی سزائے موت ختم کر دی جاتی ہے تو مسٹر بھٹو کو ترکی میں پاکستان کی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت اپنے ملک میں قیام کی اجازت دے گا اور اگر آپ کی حکومت چاہے تو اُن پر

چند سالوں (10 سال) کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی بھی لگائی جاسکتی ہے۔

جناب بلند ایجوت نے یہ بھی بتلایا کہ جنرل ضیاء الحق نے ہر مرتبہ رابطہ قائم ہونے پر مبہم سا جواب دیا اور ایسا تاثر دیا کہ وہ کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ جناب بلند ایجوت نے یہ بھی بتلایا کہ میں نے بحیثیت وزیراعظم ترکی اور ذاتی حیثیت میں خطے کے اہم راہنماؤں سے اس سلسلے میں رابطے کیے جن میں اردن کے شاہ حسین اور سعودی عرب کے شاہ خالد بھی شامل ہیں۔ بلند ایجوت کے بقول شروع میں اردن کے شاہ نے اپنے ذرائع سے امریکہ میں رابطے کئے، لیکن بعد میں دیکھنے میں آیا کہ وہ کچھ زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہے۔ مسٹر ایجوت کے بقول اسی طرح شاہ خالد بھی ایک مقام پر مسٹر بھٹو کی پھانسی کی سزا رکوانے میں سرگرم نظر نہیں آئے، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ ''باہر کے دوستوں'' کے ارادے سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔

جناب بلند ایجوت نے بتلایا کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کی پھانسی کی سزا منسوخ کرنے کے لیے سکینڈے نیوین ممالک اور مغرب کی انسانی حقوق کی تنظیموں کے ساتھ بھی اپنے ذرائع سے رابطے کیے، لیکن افسوس کہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں، کبھی کبھی تو یہ یقین ہو جاتا تھا کہ جنرل ضیاء الحق، ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا نہیں دیں گے چونکہ ضیاء الحق جس انداز میں Response کرتا تھا وہ انداز بڑا ڈپلومیٹک ہوتا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری تمام کوششیں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی سزا رکوانے میں رائیگاں ہوئیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت نے پاکستان کے مسائل میں اضافہ کیا، اور اُن کا جسمانی قتل خطے کی سیاست پر اور خطے کے ممالک کے خودمختاری کے حوالے سے بہت زیادہ اثر انداز ہوا، جس کا آغاز افغانستان میں دو عالمی طاقتوں کی بالواسطہ جنگ سے ہوا۔

جناب بلند ایجوت نے 1989ء میں ایک اور ملاقات میں مجھے بتلایا کہ جب ترکی میں جنرل کنعان ایورن نے مارشل لاء لگایا تو اس کے کچھ عرصے بعد جنرل کنعان ایورن اور جنرل ضیاء الحق کی ملاقات ہوئی، جنرل کنعان ایورن نے جنرل ضیاء الحق سے مشورہ مانگا کہ اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے کیا اہم اقدامات اٹھائے جائیں تو جنرل ضیاء الحق نے، جنرل کنعان ایورن کو مشورہ دیا کہ ترکی میں موجود بائیں بازو خصوصاً بلند ایجوت کی سیاست کی کمر توڑ کر رکھی جائے، جنرل ضیاء الحق کے اس مشورے کے بعد بلند ایجوت، ترکی کے فوجی ڈکٹیٹر کے مزید عتاب کا نشانہ بنے۔ یوں درحقیقت جنرل ضیاء الحق نے بلند ایجوت سے بھٹو دوستی کا بھی بدلہ لے لیا۔

www.bhutto.org

بلند ایجوت مرحوم سے میری ملاقاتیں تواتر کے ساتھ ہوتی رہیں۔ 1985ء میں شاہنواز بھٹو کو فرانس میں قتل کیا گیا اور اس کے بعد 1996ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں اُن کی رہائش گاہ کے سامنے سرعام پولیس نے قتل کر دیا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد میں دوبارہ ترکی گیا تو جناب بلند ایجوت سے حسب روایت ملاقات ہوئی اب وہ ترکی میں جناب مسعود یلماز کے ساتھ مخلوط حکومت قائم کر چکے تھے، جس میں وہ نائب وزیر اعظم تھے انہوں نے ملاقات کے لیے مجھے ٹرکش گرینڈ نیشنل اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں دوپہر کے کھانے کے لیے وقت دیا۔ کیفے ٹیریا میں بلند ایجوت کے ساتھ شلوار قمیض میں ملبوس ایک پاکستانی کو دیکھ کر تمام اراکین اسمبلی جستجو میں تھے کہ یہ شخص کون ہے، ان میں سابق وزیر اعظم جناب نجم الدین اربکان بھی شامل تھے، جناب بلند ایجوت نے کیفے ٹیریا میں چلتے چلتے نجم الدین اربکان سے میرا تعارف کروایا۔ کھانے کے دوران انہوں نے میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بارے میں پوچھا، جب میں نے تفصیل کے ساتھ اس بہیمانہ قتل کو بیان کیا تو انہوں نے خاموشی کے ساتھ سننے کے بعد بڑے کرب بھرے احساسات کے ساتھ کہا

"Bhutto's tragedy is a Shakespearean tragedy"

www.bhutto.org

www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو بھی شہید ہو گئیں

4، 5 جولائی 1977ء کی رات جنرل ضیاء الحق نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو فون پر اطلاع دی کہ "مسلح افواج نے ملک کا نظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں برخواست کردی گئی ہیں۔ حکومت اور اپوزیشن میں کدورتیں اور عدم اعتماد بڑھ چکا تھا۔ ہم نے مجبوراً یہ قدم اٹھایا ہے۔ ہم 90 دن کے اندر انتخابات کروا کے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیں گے۔ چند لمحوں میں مسلح افواج وزیر اعظم ہاؤس کو اپنی تحویل میں لے لیں گی اور آپ کو مسلح افواج کی حفاظت میں مری منتقل کر دیا جائے گا۔"

جنرل ضیاء الحق کے فون کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے چاروں بچوں بے نظیر بھٹو، مرتضٰی، شاہنواز، صنم اور بیگم نصرت بھٹو کو اپنے بیڈ روم میں بلایا اور اپنے ملازم کو کافی بنانے کو کہا۔ چاروں بچے اتفاق سے گرمیوں کی چھٹیاں اپنے والد اور والدہ کے ساتھ گزارنے کے لیے وزیر اعظم ہاؤس میں موجود تھے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو نے کافی کے کپ پر اپنی بیٹی بے نظیر بھٹو کو موجودہ صورت حال پر تجزیہ کرنے کو کہا۔ بے نظیر بھٹو نے کہا پاپا جیسا کہ جنرل ضیاء الحق نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ وہ نوے دن کے اندر انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیں گے تو یقیناً آپ کی جماعت پاکستان کی مقبول ترین جماعت ہے لہٰذا حزبِ اختلاف کی پیدا کردہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور آپ کی جماعت ایک بار پھر حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ بے نظیر بھٹو کے جواب پر ذوالفقار علی بھٹو اچھل پڑے اور انہوں نے کہا، پنکی جب فوج ایک بار اقتدار میں آ جائے تو وہ آسانی سے باہر نہیں جاتی۔ فوج کی حکومت، سیاست اور اقتدار کی واپسی کو دس سال بھی لگ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دونوں بیٹوں مرتضٰی اور شاہنواز کو فوری طور پر ملک سے چلے جانے کا کہا کہ آپ کی جانوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ 10 اگست 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو مری سے رہا کر دیا گیا۔ جنرل ضیاء

الحق ٹولے کی یہ غلط فہمی تھی کہ مسٹر بھٹو اب غیر مقبول ہو چکے ہیں لہٰذا جب 10 اگست 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو ہوائی سفر کے ذریعے لاہور پہنچے۔ لاہور کی تمام شاہراہیں انسانوں سے بھر گئیں، جہاز کو پہلے ایئر پورٹ پر اترنے نہ دیا گیا اور پھر گھنٹوں مسٹر بھٹو کو ایئر پورٹ پر روک دیا گیا کہ شاید سڑکوں پر اکٹھے لاکھوں لوگ واپس چلے جائیں لیکن بھٹو کے جاں نثار عوام پولیس اور فوج کے خوف کو توڑ کر اپنے قائد کے منتظر رہے۔ آدھی رات کے وقت شہید ذوالفقار علی بھٹو شادمان میں صادق حسین قریشی کی رہائش گاہ پہنچے تھے۔ آدھی رات کو بھٹو کا وہ خطاب نہیں بھولے گا جب وہ صادق حسین قریشی کی رہائش گاہ کی بالکونی میں کھڑے یہ کہہ رہے تھے "کہ امریکی میرے خون کے پیاسے ہیں وہ مجھے جسمانی طور پر ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اپنے عوام کے ساتھ کیے وعدے کو نبھاؤں گا چاہے اس کے لیے اپنی جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ دینا پڑے۔" اس دوران جناب بھٹو نے کہا کہ آپ کو امریکہ کی استعماریت کے خلاف جدوجہد جاری رکھنا ہوگی۔ مسٹر بھٹو کا یہ جملہ میرے لیے آئندہ کا لائحہ عمل تھا اور اسی کو ہم نے پارٹی کے اندر اور باہر جدوجہد کے بنیادی نظریاتی اور اصولی منشور کے طور پر اپنائے رکھا۔ اس کے چند دنوں بعد ذوالفقار علی بھٹو نے نہر کے کنارے ایف سی کالج کے سامنے فاروق لغاری کے گھر ایک اور اہم اجلاس میں پاکستان کو درپیش خطرات پر روشنی ڈالی جن کا ذمہ دار انہوں نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت کو ٹھہرایا۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف متنازع مقدمے کا آغاز کیا گیا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ بھٹو کو جسمانی طور پر ختم کر دیا جائے۔ مقدمے میں اتار چڑھاؤ آئے۔ یہ مقدمہ چونکہ لاہور ہائی کورٹ میں چلایا گیا چنانچہ مسٹر بھٹو کوٹ لکھپت جیل لاہور میں قید کر دیئے گئے۔ لہٰذا بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو بھی لاہور منتقل ہو گئیں۔ ان کا قیام لاہور میں اس وقت پارٹی کے ایک رہنما کے گھر ہوا جو گلبرگ میں واقع تھا۔ کھگہ ہاؤس کو پاکستان کے پرنٹ میڈیا میں صرف اس لیے شہرت ملی کہ یہاں پر دونوں بھٹو خواتین قیام پذیر (نظر بند) تھیں۔

ستمبر 1978ء کو بے نظیر بھٹو نے فاروق لغاری کے نہر کنارے گھر پر پارٹی کارکنوں سے رابطوں کا سلسلہ شروع کیا۔ مجھے وہ دن یاد ہے کہ وہ ایک کرسی پر کھڑی ہو کر سرگرم کارکنوں سے خطاب کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہا ہمیں اپنی تحریک کو تیز کرنا ہوگا تا کہ ہمارے قائد ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قتل کی سازش کو ناکام بنایا جا سکے۔ میری جذباتی تقریر کے بعد انہوں نے میرے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا مجھے ملے بغیر نہ جانا اور جب قیوم نظامی خطاب کر رہے تھے تو مزدور محنت کش کے حلیہ میں ایک شخص نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ میں فیصل آباد سے آیا ہوں اور اس جلسہ کے بعد آپ

سے ملنا چاہتا ہوں۔اس شخص کا نام عبدالرشید عاجز تھا جس نے 18 اکتوبر 1978ء کو دوسرے دو پروانوں کے ہمراہ بھاٹی گیٹ لاہور کے باہر بھٹو کی سزائے موت کے فیصلے کے خلاف اپنے آپ کو آگ لگا کر پارٹی کی جدوجہد کو ایک نیا شمع فروزاں کا جذبہ عطا کر دیا۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب ان جھلستے پروانوں کو میں نے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ایک کوڑے والی ٹرالی کے ذریعے میو ہسپتال کی ایمرجنسی تک پہنچایا جہاں یہ پروانے بھگت سنگھ کے انقلابی جذبوں کے انداز میں شہید ہو گئے۔ مسٹر بھٹو نے اپنے ان جاں نثاروں پر مرتے دم تک فخر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کی رہائی کے لیے اپنی والدہ کے قدم سے قدم ملا کر انتھک جرأت مندانہ جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی دوران محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی زندگی کا پہلا سیاسی جلسہ سرگودھا میں کیا جس کو منظم کرنے کا کریڈٹ پارٹی کے مخلص رہنما ممتاز کاہلوں کو جاتا ہے۔

مسٹر بھٹو کی رہائی کی جدوجہد نے پارٹی کو ہر سطح پر ایک نئی قیادت فراہم کی جس میں ہزاروں کارکن اور خود بے نظیر بھٹو بھی شامل تھیں۔ پارٹی کی تاریخ میں 1977ء سے 1988ء کا زمانہ پی پی پی کا سنہری باب ہے۔اس جدوجہد کا ہی نتیجہ ہے کہ آج پاکستان میں جمہوری جدوجہد کو کوئی آسانی سے دبا نہیں سکتا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب بے نظیر بھٹو نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے لاہور سے ہی ایک خط لکھا کہ آپ فوراً آئیں تاکہ صوفیائے کرام کے مزاروں سے جاری کی جانے والی بھٹو رہائی کمیٹی کی تحریک کو تیز کیا جائے۔ میں اپنے دیگر نوجوان ساتھیوں کے ہمراہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو ایک محنت کش ساتھی کے گھر خفیہ میٹنگ میں ملا جس کے بارے میں پارٹی کی اس وقت کی فیوڈل لیڈرشپ کو علم نہیں تھا۔اس میٹنگ میں پارٹی کے سینئر وائس چیئرمین شیخ محمد رشید اور عارف اقبال بھٹی سمیت مختلف تقریباً دس کارکن موجود تھے اور میں نے ایسی کئی میٹنگز کیں۔

1988ء تک پی پی پی کی ہر وہ میٹنگ کامیاب ہوئی جس کی بھنک پارٹی کی فیوڈل قیادت کو نہ ہونے پائی۔ یہ زیادہ تر زیرِ زمین جدوجہد کا زمانہ تھا۔ان میٹنگز میں پارٹی جدوجہد کے فیصلے کئے جاتے اور ہر لائحہ عمل عدم تشدد کی مزاحمت پر مبنی ہوتا تھا۔ یعنی پمفلٹ سائیکلو سٹائل کروانا، پمفلٹ تقسیم کرنا اور سیاسی کارکنوں کے ساتھ نیٹ ورک برقرار رکھنا۔اس دوران بیگم نصرت بھٹو متعدد بار برقعہ پہن کر آئیں۔ یہ وہ دور تھا جب لاہور میں چند سو متحرک کارکن اپنی جدوجہد کو منظم اور جاری رکھے ہوئے تھے اور ان جاں نثار کارکنوں کی پورے ملک میں تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ پارٹی کے کارکنوں کی بڑی تعداد چونکہ جیلوں میں قید کر دی گئی تھی اس لئے باہر رہ جانے والے کارکن بڑی محدود تعداد میں سرگرمِ عمل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ 21

www.bhutto.org

جون 1978ء کو بے نظیر بھٹو نے اپنی 25 ویں سالگرہ جیل میں مقید اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ منائی ۔ جب محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی 25 ویں سالگرہ کا کیک کاٹنے لگیں تو مسٹر بھٹو رو کے اور انہوں نے کہا پنکی آج جنرل ضیاء الحق کے لئے بڑا تکلیف دہ دن اس لئے ہے کہ تم آج پچیس سال کی ہو گئی ہو، وہ مجھے جسمانی طور پر ختم کرنا چاہتا ہے آج چین سے نہیں سونے پائے گا اور تم میرے بعد میرا مشن جاری رکھو گی۔

4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کا جوڈیشل مرڈر کر دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سہالہ میں قید تھیں۔ ماں بیٹی کو شہید ذوالفقار علی بھٹو کے آخری دیدار سے جان بوجھ کر محروم رکھا گیا۔ ضیاء ٹولے نے مسٹر بھٹو کو سکیورٹی فورسز کے سخت پہرے میں گڑھی خدا بخش کے گاؤں میں بھٹو خاندان کے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں موت کی سزا کے منتظر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ ”میں گڑھی خدا بخش میں اپنی قبر سے پاکستان کے عوام کے دلوں پر حکومت کروں گا اور ایک دن آئے گا کہ میری قبر سے فتح و نصرت کے پھول کھلیں گے۔“ جس کسی نے بھی پاکستان میں جمہوری جدوجہد کرنی ہوگی اس کو میری قبر پر آنا ہوگا“ تاریخ کے فیصلے تمام رکاوٹیں توڑ کر اٹل ثابت ہوتے ہیں۔ 29 دسمبر 2007ء کو جب میاں نواز شریف محترمہ بے نظیر بھٹو کی تعزیت کے لئے نوڈیرو گئے اور اس کے بعد انہوں نے شاہ نواز، مرتضیٰ، بے نظیر اور ذوالفقار علی بھٹو کی قبر پر پھول نچھاور کرتے ہوئے شہید جمہوریت ذوالفقار علی بھٹو کی پیش گوئی کو سچ ثابت کر دکھایا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد پارٹی کی قیادت کا پرچم بیگم نصرت بھٹو نے تھام لیا اور محترمہ بے نظیر بھٹو مزاحمتی جدوجہد میں جوانمردی سے شامل تھیں۔ جب دونوں بھٹو خواتین 4 اپریل 1979ء کے سانحے کے بعد واپس لاڑکانہ آئیں تو جوہر میر نے اپنے اشعار کے ذریعے اس کا اظہار یوں کیا

ـــ اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں

میں اپنے دیگر 9 ساتھیوں کے ہمراہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے تین ہفتے بعد گڑھی خدا بخش بھٹو گیا۔ اس وقت گڑھی خدا بخش بھٹو جانا کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ پورے سندھ میں فوج ڈیپلائے تھی اور جنرل ضیاء الحق نے بڑی تعداد میں خفیہ والوں کا جال بچھا رکھا تھا جو خصوصاً پنجاب سے آنے والے ہر فرد کی نگرانی کرتے تھے۔ ہم نے بھٹو کی قبر پر ایک چادر چڑھائی جس کا اس وقت بڑا شور مچا۔ سارے اخبارات میں اس لئے کہ میں نے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اپنے ہاتھوں کو زخمی کر کے اپنے خون سے اس چادر پر لکھا ”ہم اپنے شہید قائد ذوالفقار علی بھٹو کا مشن جاری رکھیں گے۔“ اس خبر کو اس وقت روزنامہ مساوات نے شہ

www.bhutto.org

سرخی میں شائع کیا اور اس کے بعد مجھے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر صاحبہ کا ایک مشترکہ خط ملا۔

سہالہ کے بعد ان کو لاڑکانہ نظر بند کر دیا گیا تھا اور جب یہ نظر بندی ختم ہوئی تو میں پارٹی کے چند کارکنوں کے ہمراہ بھٹو خواتین کو ملنے لاڑکانہ چلا گیا۔ اس وقت کی مقبول ترین کتاب ''خوشبو کی شہادت'' تھی جس کو بیگم نصرت بھٹو کے وکیل اصغر علی چودھری نے مرتب کیا تھا اور یہ کتاب ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت پر لکھی گئی شاعری پر مبنی تھی۔ ہم نے اس کتاب پر بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے دستخط لئے۔ بیگم بھٹو نے اس تعزیتی ملاقات میں کہا کہ اب ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے حامی ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو کو قائدِ عوام کے بعد ان کی جانشین کے طور پر قبول کریں۔ یہ مشکل کام تھا کہ ایک رجعت پسند مرد معاشرے میں ایک عورت اور وہ بھی نوجوان لیڈر بن جائے۔ بھٹو کی شہادت کے بعد جب ہم لوگ اس جدوجہد میں سرگرمِ عمل تھے تو ہمیں نہ صرف عام لوگوں بلکہ دانشوروں کے ایک بڑے طبقے کی طرف سے یہ کہا گیا کہ بھٹو صاحب چلے گئے ان کا کوئی متبادل نہیں ہو سکتا اور وہ بھی ایک لڑکی، لیکن اس بات کا کریڈٹ پارٹی کے مخلص کارکنوں کو جاتا ہے کہ جنہوں نے اس مشکل دور میں ایک نوجوان لڑکی کو ایک مرد معاشرے میں اپنی قائد تسلیم کیا اور اس کی لیڈر شپ کو تسلیم کروانے کے لئے عملی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ زمانہ آج کی طرح میڈیا کا زمانہ نہیں تھا۔ پورے ملک کے اخبارات میں لفظ ''بھٹو'' سنسر تھا۔ کسی اخبار کو یہ لفظ چھاپنے کی اجازت نہیں تھی۔ اجازت تھی تو ذوالفقار علی بھٹو کی کردار کشی کی۔ اسی طرح بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کا بیان، ان کے بارے میں خبر کو اخباروں میں نہ شائع کرنے کا سرکاری حکم نامہ جاری ہوا تھا۔ اس لیے تو حبیب جالب نے کہا کہ

ڈرتے ہیں بندوقوں والے
ایک نہتی لڑکی سے

جنرل ضیاء الحق نے دونوں بھٹو خواتین کو زک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بیگم بھٹو اس دوران السر کے مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ بعد میں ان کو عالمی دباؤ پر ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن بے نظیر بھٹو کو بعد ازاں سکھر جیل میں قید کر دیا گیا۔ جدوجہد کا سفر جاری رہا۔ ہزاروں کارکنوں کو کوڑے مارے گئے اور کئی اس جان لیوا جدوجہد میں شہید ہو گئے۔ سکھر جیل میں بے نظیر بھٹو کو ضیاء ٹولے نے تنہا ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور ہم لوگوں تک یہ خبر پہنچی کہ ان کو مختلف طریقوں سے اذیتیں بھی دی گئیں، بعد میں وہ بھی بیرونی دباؤ کے تحت جیل کی کوٹھڑی سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔

انہوں نے لندن میں جلاوطنی اختیار کر لی جہاں ان کا یار بی کان کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں قیام تھا۔ صفدر ہمدانی، صفدر عباسی اور شروع میں سردار مظہر علی خان کی بیگم نے ان کے سٹاف کے طور پر کام کیا۔ اپنی وطن واپسی (10 اپریل 1986ء) سے چند ہفتہ قبل انہوں نے لندن سے مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا کہ "میں پاکستان آ کر جلد ہی جمہوریت کی جدوجہد کا نئے سرے سے آغاز کروں گی اور مجھے آپ جیسے جوان ساتھیوں پر ناز ہے۔" 10 اپریل 1986ء کو لاہور میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے پرامن استقبال نے جس میں 30 لاکھ کے قریب لوگ شامل ہوئے۔ جنرل ضیاء کے "رفقائی نظام" میں دراڑیں ڈال دیں۔ پارٹی کے اندر اس وقت بائیں بازو کا ایک بڑا دھڑا موجود تھا جس میں زیادہ تر لوگ وہ تھے جنہوں نے پچھلے 9 برسوں میں سب سے بڑھ کر قربانیاں دی تھیں۔ اس دھڑے کی قیادت سینئر وائس چیئرمین شیخ محمد رشید کرتے تھے اور راقم اس دھڑے میں دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ ہم نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ دوسرے روز گلبرگ میں فیصل صالح حیات کے گھر محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ ایک طویل ملاقات کی اور ان کو آگاہ کیا کہ پارٹی میں موقع پرستوں کا ایک بڑا گروہ شامل ہو چکا ہے جو نہ تو پارٹی کے منشور اور نہ ہی آپ کے ساتھ مخلص ہے۔ ہم نے 11 نکات پر مبنی ایک پیپر بھی محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کو دیا کہ پارٹی ان بنیادوں پر منظم کی جا سکتی ہے اور اگر پارٹی کو از سر نو منظم کر دیا جائے تو پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے نظریات کے تحت پرامن طریقے سے ایک خوشحال ملک وجدید معاشرے میں بدل سکتا ہے، ایک ایسا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس میں آئندہ کوئی بھٹو سولی پر نہ چڑھایا جا سکے گا اور نہ ہی کسی اور طریقے سے قتل کیا جا سکے گا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اس میٹنگ کے دوران نوٹس بھی لیتی رہیں اور اس پیپر کو انہوں نے پڑھنے کے بعد پرس میں رکھ لیا۔ اس کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملاقات شاہدہ جبیں کے گھر پر ہوئی جہاں وہ عثمان غنی شہید کی پھانسی کے بعد افسوس کرنے آئی تھیں۔ عثمان غنی نے پھانسی کی کوٹھڑی میں سگریٹوں کی ڈبی کے سنہری کاغذ سے ایک تاج بنایا تھا اور پھانسی سے قبل اس نے کہا کہ جب میری بہن بے نظیر بھٹو میرے افسوس کے لئے میرے گھر آئیں تو ان کو یہ تاج پہنایا جائے۔ مجھ غریب کے پاس موت کی کوٹھڑی میں اس حقیر تحفے کے سوا کچھ نہیں ہے اور ان کو کہیے گا کہ میں ان کی جرأت مندانہ جدوجہد پر ان کو سرخ سلام پیش کرتا ہوں۔ عثمان غنی کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے سلور رنگ کے کاغذ کا یہ تاج محترمہ بے نظیر بھٹو کے سر پر رکھ دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے شہید ہونے والے بھائیوں پر فخر ہے اور میں عوامی حقوق کا یہ سفر جاری رکھوں گی چاہے مجھے اس کے لیے اپنی جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے۔